وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

ترجمہ: اور حق آگیا اور باطل بھاگ گیا۔ باطل بھاگنے والی چیز ہی ہے۔

(بنی اسرائیل ۱۷: ۸۱)

معارف الحق

یعنی مجموعۂ مضامین

مبلغ اسلام و فاضل اجل حضرت مولینا عبد الحق صاحب ودیارتھی علیہ الرحمہ

فاضل سنسکرت و عبرانی۔ مصنف "محمد ان ورلڈ سکرپچرس" (میثاق النبیین)؛ آئینہ حق نما اوّل (ستیارتھ پرکاش کا جواب)؛ آئینہ حق نما دوم (آریہ دھرم پر تبصرہ)؛ ویدوں کا بہشت؛ سرگذشتِ وید (ویدوں کی تاریخ)؛ ولادتِ مسیحؑ؛ یجروید کا اردو کا ترجمہ؛ ہبوطِ آدمؑ (ایک عیسائی کے اعتراضات کا جواب) وغیرہ وغیرہ۔

جلد اوّل

(تفسیر سورۂ فاتحہ۔ الحمد للہ تا مٰلک یوم الدین)

www.abdulhaq.info/books

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مصنف : مبلغ اسلام حضرت مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی رحمۃ اللہ علیہ

سن اشاعت : ۱۹۹۵ء

تعداد : ۱۱۰۰

قیمت : ۱۰۰

تعداد صفحات ۳۲۰

کتابت : محمد یوسف حسینی

I.S.B.N 81-900537-1-X

Printed in India at: Nirman Press
2107, Kifayatullah Street,
Pahari Bhojla, Delhi-110006

دارالاشاعت کتب اسلامیہ

پبلشرز ڈسٹری بیوٹرز سٹاکسٹ وایکسپورٹرز

فاطر بائی کورٹ۔ چوتھا منزلہ۔ ۱۷ر مولانا آزاد روڈ، جیکب سرکل بمبئی ۴۰۰۰۱۱

ٹیلی فون : ۳۰۹۳۴۳۸ — ۳۰۸۸۳۳۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

حضرت مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی، رحمۃ اللہ علیہ (پیدائش ۱۸۸۸ء، وفات نومبر ۱۹۷۷ء) احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے ایک عظیم الشان مبلغِ اسلام، مفسرِ قرآن، عالم مذاہب عالم، فاضلِ سنسکرت، عبرانی اور دیگر مذہبی زبانیں، اور بلند پایہ مصنف و محقق تھے۔ آپ ایک مشہور اور کامیاب مناظر بھی تھے جنھوں نے آریہ سماجی پنڈتوں اور عیسائی پادریوں کے اسلام کے خلاف حملوں اور اعتراضات کا ہزاروں کے مجمع میں منہ توڑ جواب دیا، اور ان مخالفین کو فرار کی راہ اختیار کرنی پڑی۔ آپ کا سب سے عظیم کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے تمام دیگر مذاہب عالم کے صحف میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیشین گوئیاں اور آنحضرت صلعم کی زندگی کے حالات کا ذکر نکال کر ثابت کیا کہ ان مذاہب کے بانیوں اور پیشواؤں نے خود اپنے پیروؤں کو اس نبی ؐ کو قبول کرنے کی تاکید کی تھی۔ اس طرح آپ نے دیگر اَدیان کے متبعین کے دِلوں میں آنحضرت صلعم کی محبت اور عظمت قائم کرنے کی ایک نئی راہ کھول دی۔ عالم اور مجاہد ہونے کے علاوہ آپ بُلند ترین اخلاق کے مالک تھے مانے ہوئے ولی اللہ اور صاحب کشف والہام بھی تھے۔

حضرت مولانا صاحب کی زندگی میں قرآنی الفاظ "لِيُظْهِرَهٗ

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ[1]" (کہ اسلام تمام اَدیان پر غالب آئے گا) کا ایک شاندار نظارہ دیکھا گیا۔ سلف صالحین صدیوں سے لکھتے چلے آئے تھے کہ یہ وعدۂ الٰہی کامل طور پر مسیحؑ کی آمد ثانی کے بعد پورا ہوگا۔ جب حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانیؒ نے مجدّدِ صدی اور اسی آنے والے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا اور دفاع و اشاعتِ اسلام کے لئے جماعتِ احمدیہ قائم کی، تو مولانا عبدالحق صاحب نے ۱۹۰۷ء میں بعمر ۱۹ سال ایک رؤیا کی بنا پر حضرت مرزا صاحب کی بیعت کی اور اس جماعت میں شامل ہوئے۔ ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ آپ نے اپنی زندگی خدمتِ دین کے لئے بکلّی وقف کر دی اور تمام عمر بحیثیت مبلّغِ احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور اپنی نادر خدمات سرانجام دیتے رہے۔ آپ انجمن کے نائب صدر اور انجمن کے قائم کردہ ادارہ تعلیم القرآن کے پرنسپل کے عہدہ پر بھی فائز رہے۔ آپ کی کامیابی، خدمات اور آپ کے علم کے معترف نہ صرف اس جماعت کے افراد، بلکہ تمام مسلمان تھے، حتّٰی کہ جمعیۃ العلماء ہند نے، باوجود اس شدید تعصّب کے جو احمدیوں کے خلاف علماء میں پایا جاتا ہے، ۱۹۲۹ء کے لگ بھگ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور سے درخواست کی کہ وہ مولانا عبدالحق صاحب کو انہیں دو سال کے لئے دے دیں تاکہ ان کے طالب علم آپ سے مناظرہ اور تبلیغِ اسلام کی تربیت حاصل کر سکیں۔

تصنیفات اور تحریرات

حضرت مولانا صاحب کی جس تصنیف نے آپ کو بین الاقوامی شہرت دی وہ آپ کی معرکۃ الآراء کتاب MUHAMMAD IN WORLD SCRIPTURES ہے (جس کا اُردو میں نام "میثاق النّبیین" ہے)، جس میں آپ نے سالہا سال کی محنت اور ریسرچ سے، سنسکرت، عبرانی وغیرہ زبانوں کا علم حاصل کر کے، تمام

[1] ۶۱ : ۹

دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ میں سے رسول کریم محمد صلعم کے متعلق پیشگوئیوں کی کھوج لگائی ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس نوعیت کی یہ پہلی تحقیق اور تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اُردو میں اور بھی کتابیں لکھیں، اور یجروید کا اُردو ترجمہ کیا جس کا نصف حصہ شائع بھی ہوا۔

اخبار "پیغام صلح" میں، جو کہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا خصوصی ترجمان ہے، پچپن (۵۵) سال سے زیادہ کے طویل عرصہ آپ کے مضامین اور تقاریر شائع ہوتے رہے۔ ایک ماہانہ رسالہ "روح اسلام" کا ۱۹۵۴ء میں جماعت احمدیہ لاہور کے بعض بزرگوں نے اجراء کیا، جس کے مدبر اعزازی حضرت مولانا صاحب مقرر ہوئے۔ اس رسالے کے پہلے دس سال کے شماروں میں آپ کے نہایت قیمتی، طویل مضامین پائے جاتے ہیں، جن میں بعض تو مکمل کتابوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کے ان رسالوں کے مضامین میں قرآن کریم اور علم دین کے وہ نئے حقائق و معارف پائے جاتے ہیں جو حضرت مولانا صاحب کا خاص حصہ ہیں۔ اس نوعیت کا مواد آپ کی موجودہ شائع شدہ کتب میں شامل نہیں ہے، مگر تقاریر اور مضامین میں کثرت سے موجود ہوتا تھا۔ آپ کسی بھی مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے، ایک چھوٹے سے چھوٹے نکتہ پر بھی قرآن کریم، بائیبل، وید، عربی، عبرانی، سنسکرت، علم الالسنہ، سائنس، فلسفہ، ان سب کی مدد سے روشنی ڈال کر علم اور ایمان افروز حقائق کا ایک دریا نکالتے ہیں۔

چند اصولوں کا بیان

انہی بعض مضامین کے آغاز میں حضرت مولانا صاحب نے چند بنیادی باتوں کا ذکر کیا ہے جن کو آپ کی تحریرات پڑھتے ہوئے مدنظر رکھنا چاہیئے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں: "یہ افکار آریہ سماج کے اسلام کے خلاف صدہا اعتراضات کو

پڑھ کر اور عیسائی پادریوں کی آئے دن کی خُردہ گیریوں اور طعنہ زنیوں سے ٹکرا کر پیدا ہوئے ہیں۔ اس لئے اپنے دوستوں سے معذرت خواہ ہوں کہ مجھے اس تقابلِ ثلاثہ کی ضرورت پیش آئی " (پیغام صلح، ۱۵ مارچ ۱۹۳۷ء ص ۷)۔

اسی طرح آپ اپنی مشہور تصنیف " میثاق النبیین " میں تحریر کرتے ہیں :

" مذہب بالخصوص دین اسلام کا مقصد بہت بلند ہے۔ وہ دنیا میں امن، صلح اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ کبھی اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی مذہب یا اس کے کسی بزرگ کے خلاف بے ادبی سے زبان کھولی جائے، بلکہ اس کے خلاف عقلی محک بندیوں کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ . . . مجھے عیسائیت پر ایک نوٹ بک لکھنے کے لئے کہا گیا۔ میں عیسائی مذہب کے متعلق صرف معلومات دوں گا۔ اس پر بے جا نکتہ چینی اور تنقید سے پرہیز کروں گا " (حصہ دوم، ص ۹۷)۔ آپ کے دیگر مذاہب پر تبصرے اور اسلامی تعلیم سے مقابلہ کو ان اصولوں کی روشنی میں پڑھنا چاہیئے۔

حضرت مولانا صاحب نے بعض آیاتِ قرآن، بالخصوص جو نظامِ کائنات کے متعلق ہیں، کی تائید میں سائنس کے علم کو بھی پیش کیا ہے۔ اس کے متعلق آپ فرماتے ہیں :

" سائنس کی تاریخ درحقیقت انسانی عقل کی مسلسل غلطیوں کی داستان ہے۔ اس کے انکشافات کی بناء پر قرآن مجید کی تفسیر کرنا ایک خطرہ کو دعوت دینا ہے، تاہم یہ امر مسلم ہے کہ نیچر میں کوئی غلطی اور نقص نہیں۔ اس کے قوانین حق اور صداقت پر مبنی ہیں۔ غلطی ہمارے فکر کی اور قصور ہمارے فہم میں ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن مجید کی شان لَا رَیْبَ فِیْہِ ہے۔ غلطی ہمارے

استنباط اور استدلال میں ہو سکتی ہے۔" (پیغام صلح،
۶ فروری ۱۹۴۶ء ص ۵)

حضرت مولانا صاحب نے جہاں سائنسی علم کو پیش کیا ہے، وہاں عموماً آپ نے سائنس کے دریافت شدہ، ٹھوس حقائق، نہ کہ محض نظریات، کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مثلاً قرآن کریم نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کا ذکر کیا ہے کہ رب نے اسے فلاں فلاں کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تائید میں حضرت مولانا صاحب نے سائنس کی ریسرچ کے نتائج پیش کئے ہیں جن سے انہی کاموں کی مزید تفاصیل کا پتہ چلتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ شہد کی مکھی فی الواقعہ حیرت انگیز کام سرانجام دیتی ہے جس سے انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اب اس سائنسی علم میں ترقی تو ہوتی رہے گی مگر اس کی بنیادی حقیقت غلط ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ نے کہیں کسی ایسے سائنسی امر کو پیش کیا ہو جس کو سائنس کی مزید تحقیق نے بدل دیا یا غلط بھی ثابت کر دیا تو یہ اصول اور راہ پھر بھی درست و قائم رہے گی کہ قرآن کریم کو علم کی روشنی میں ہی سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بلکہ علم اور سائنس کی ترقی اور تصحیح سے قرآن کریم کے لامحدود عجائبات ہمیشہ ہی نکلتے رہیں گے۔ حضرت مولانا صاحب اپنے اس قسم کے مضامین کے متعلق خود لکھتے ہیں کہ :

" لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں پر میرا جی یہ چاہتا ہے کہ
اہل علم لوگ میری غلطیاں نکالیں " (زیر حوالہ مندرجہ بالا)

گویا آپ نے دنیا کو تشریح قرآن کا ایک صحیح اصول دکھایا ہے اور اس پر عمل کیا ہے، مگر انسانی علم کی محدودیت کے باعث اس اصول کے استعمال سے اخذ شدہ نتائج میں غلطی کا بھی احتمال ہے، اور یہ بات مد نظر رکھنی چاہیئے۔

حضرت مولانا صاحب کس کامل انکساری سے مزید لکھتے ہیں: "اس بات

کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ مفسر ہوں، نہ عربی کا کوئی بڑا عالم ہوں، اور نہ فلسفی ہوں۔ قرآن مجید کے عشق میں چند افکار سمو لایا ہوں۔ محمد رسول اللہ صلعم کی نذر ہیں، نہ اس خیال سے کہ یہ کوئی قیمتی چیز ہے بلکہ اس نیت سے کہ رَحْمَةً لِلْعَالَمِين کا دربار ہے اور ہر عاشق خواہ کتنا ہی بے نوا ہو، نظرِ رحمت کا امیدوار ہے" (پیغام صلح، ۱۵ مارچ، ۱۹۳۶ء، ص ۷)

کتاب معارف الحق

اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ حضرت مولانا صاحب کے مضامین کو جو کہ علمی اور ایمان افروز حقائق کا ایک سمندر ہیں، اور صداقتِ اسلام ثابت کرنے کے لئے تحریر کئے گئے تھے، کتابی صورت میں منظم طریق پر مرتب کرکے شائع کیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ گو مولانا صاحب کی تعریف کرنے والے، اور آپ کے علم سے فائدہ اٹھانے والے، اور آپ کے معتقد تو بہت ہیں، لیکن کوئی عملی کام و محنت کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ اس لئے اس کام کا بیڑا میرے جیسے نااہل شخص کو (جو کہ رشتہ میں آپ کا نواسہ بھی ہے) اُٹھانا پڑا۔

پہلے تو مجھے مولانا صاحب مرحوم کے کاغذات میں رسالہ "روح اسلام" کے کئی شمارے اور چند ایک اور شائع شدہ مضامین دستیاب ہوئے۔ ان تمام مضامین کو کتابی شکل میں مرتب کیا، مگر اس کتاب کی اشاعت میں بعض مشکلات کی بناء پر تاخیر ہوگئی (جن میں سب سے بڑی دشواری یہ کہ حکومت پاکستان نے ۱۹۸۴ء میں احمدیوں پر سخت پابندیاں عائد کر دیں، جن کی وجہ سے اس کتاب کا لاہور سے شائع ہونا ناممکن ہوگیا)۔ اسی اثناء میں حضرت ڈاکٹر سعید احمد خاں صاحب، امیر جماعت احمدیہ لاہور، کی مدد سے اور انجمن کے لائبریرین جناب قاضی عبدالحاد صاحب کی محنتِ شاقہ سے ہمیں اخبار "پیغام صلح" کی فائلوں

میں سے حضرت مولانا صاحب کے تمام مضامین کی فوٹو کاپیاں حاصل ہوگئیں۔ اس وسیع اور ضخیم ذخیرے کو دیکھ کر انسانی عقل حیران ہی رہ جاتی ہے کہ یہ مواد تو ایک انسائیکلوپیڈیا کے برابر ہے۔ اس صورت حال کا جائزہ لے کر یہی فیصلہ کیا کہ ان تمام مضامین کو (مع اُن کے جن کی اشاعت ملتوی ہوگئی تھی) بلحاظ موضوع تقسیم کرکے علیحدہ علیحدہ جلدوں میں شائع کیا جائے۔

یہی مناسب سمجھا گیا کہ اس مجموعہ کی ابتدا آپ کی تفسیر سورۃ فاتحہ سے کی جائے جو آپ رسالہ "روح اسلام" میں قسط وار لکھ رہے تھے، گو "مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ" تک پہنچ کر یہ تفسیر ناتمام رہ گئی تھی۔ لیکن یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اس میں متعدد دیگر آیاتِ قرآن کی بھی تفسیر موجود ہے۔ جلد ہذا باب دوم سے لے کر باب ششم کے اوّل حصہ تک اسی تفسیر پر مشتمل ہے۔ چونکہ یہ تفسیر آیت "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" سے شروع ہوتی ہے، اس لئے جب "بِسْمِ اللّٰهِ" کے متعلق آپ کا ایک سلسلۂ مضامین "پیغام صلح" کے شماروں میں ملا، تو اسے ابتدا میں بطور باب اوّل شامل کرلیا گیا۔ اس کے علاوہ چونکہ آپ کی تفسیر سورۃ فاتحہ کے عین آخر پر انسانی رنگ و نسل کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے یہ ذکر تھا کہ قرآن مجید نے "اختلاف الوان پر حکیمانہ بحث کی ہے"، تو اس کے بعد آپ کا "پیغام صلح" سے فلسفہ رنگ کے متعلق ایک سلسلۂ مضامین باب ششم کی تکمیل میں شامل کردیا گیا۔

ترتیب دیتے وقت ان تمام مضامین کا بغور مطالعہ کیا گیا ہے، اور اصل کی طباعت کی اغلاط کو درست کیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی آیات کے حوالے (یعنی سورت اور آیات کے نمبر) جہاں موجود نہیں تھے وہ درج کردیئے گئے ہیں، اور قرآن اور بائیبل کے تمام حوالوں کو پھر سے چیک کرلیا گیا ہے۔

ہماری دعا اور امید ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ حضرت مولانا صاحب مرحوم

کے مضامین اور مقالات کو "معارف الحق" کی جلدوں کی صورت میں شائع کرنے کا کام جاری رہے گا۔ یہاں میں جناب عبدالرزاق صاحب بمبئی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جو اس کام کی اہمیت پر زور ڈالتے رہے ہیں اور میری حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ آپ ہی اس مشکلات کے دور میں کتاب ہذا کی طباعت واشاعت کے ذمہ دار ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ ہم عاجزوں کے لئے اس کام میں تائید ونصرت الٰہی کی دعا کرتے رہیں۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْاَمِیْن۔

زاہد عزیز

Nottingham England

اکتوبر ۱۹۹۳ء

خراجِ تحسین حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ

حضرت مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی کی خدماتِ اسلامی، جو آپ نے تحریرات، تقریرات اور مناظرات کے ذریعہ سرانجام دیں، ان کے معترف، معتقد اور پسند کرنے والے افراد تو کثیر التعداد ہیں اور مختلف فرقوں اور مسلکوں سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ مگر ان میں سے بہت لوگوں کو اس بات کا بخوبی علم نہیں ہے کہ مولانا صاحب اپنے تمام کام کو حضرت مرزا غلام احمد صاحبؑ، مجدّدِ وقت و بانی سلسلہ احمدیہ، کا فیض قرار دیتے تھے اور انہی کے مشن کی تکمیل سمجھتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ آپ کو غیر مذاہب کے اسلام پر حملوں کو پسپا کرنے میں جو عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی، جبکہ دیگر مسلمانوں کے فرقوں اور جماعتوں کے علماء بے بس ہو چکے تھے، یہ سب حضرت مسیح موعودؑ اور جماعتِ احمدیہ لاہور کی صداقت کا ثبوت ہے۔

موجودہ دَور میں بہت لوگ ایسے ہیں جو پھل کے عمدہ اور نیک ہونے کا تو اعتراف خوشی سے کرتے ہیں، مگر کسی بنا پر اس کے درخت اور اس کی جڑ کو خراب اور ناقص سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ حضرت مولانا صاحب نے جو حضرت مرزا صاحب کے مقام اور کام کے متعلق لکھا اس کو پیش کیا جائے اور تاریخی نکتۂ نظر سے مستقل طور پر محفوظ کر لیا جائے۔

جب آپ کی مشہور انگریزی کتاب "MUHAMMAD IN WORLD SCRIPTURES" کا

دوسرا ایڈیشن تین جلدوں میں اشاعت کے لئے تیار ہوگیا تو آپ نے "پیغام صلح" میں اس کے متعلق مضمون لکھا جس کا آغاز مندرجہ ذیل ہے:

"حضرت مسیح موعود نے اپنی سب سے پہلی تصنیف لطیف براہین احمدیہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق دعوے پر ۳۰۰ دلائل دینے کا وعدہ فرمایا تھا۔ آپ نے اس کتاب کو چار مجلدات میں شائع کیا جس میں دنیا کے تمام علماء مذاہب کو مخاطب فرما کر قرآن مجید کو بے نظیر کتاب اور آنحضرت صلعم کا معجزہ عظمیٰ اور آپ کے صدق دعوے پر برہان بینہ قرار دیا۔ یہ کتاب اپنی نوعیت اور موضوع کے اعتبار سے ایک بے نظیر تصنیف ہے اور حضرت صاحب کے خداداد علم اور اس صدی کا مجدد ہونے کی روشن دلیل ہے۔ یہ اصل کام ہے جو جماعت احمدیہ کی ساری کوششوں کا مرکز اور محور ہونا چاہیئے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کیا جائے گا وہ حضرت مسیح موعود کے نام پر معنون اور آپ ہی کا فیضان اور کام سمجھا جائے گا۔

براہین احمدیہ وہ کتاب تھی جس نے علماء زمانہ سے خراج تحسین وصول کیا اور یہی وہ کتاب تھی جسے پڑھ کر میرے والد مرحوم حضرت صاحبؑ کے گرویدہ اور آپ کی بیعت کرنے کے مشتاق ہوگئے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اسی چشمۂ معرفت سے پانی پیا۔ آریوں اور عیسائیوں کے چوٹی کے علماء سے کامیاب مناظرے اور مباحثے کئے۔" (پیغام صلح، مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۶۷ء ص ۷)۔

اس کے بعد آپ اپنی کتاب کا تعارف کرواتے ہیں، اور اس میں، براہین احمدیہ کی طرز پر، رسول کریم صلعم کی صداقت پر دلائل کی تعداد کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح جب آپ نے ایک مرتبہ "پیغام صلح" میں صداقت قرآن مجید پر ایک سلسلۂ مضامین تحریر کرنا شروع کیا، جس کا ابتدائی حصہ اس کتاب "معارف الحق" کے باب اول میں شامل ہے، تو اس کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"(۱) مجدّدِ وقت نے اپنی سب سے پہلی تالیف "براہین احمدیہ" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کی جو رسم پیدا کی ہے، اس کا تقاضا ہے کہ حضور رسالتمآب سے قرآن مجید کے واسطے سے عشق کیا جائے۔ مسیح موعود کی صداقت کے دلائل کثرت سے ہیں، مگر حضرت صاحب کا عشقِ قرآن ان کے صدقِ دعویٰ پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ حقائق و معارف قرآنیہ کا ایک ناقابل تردید مرقع "براہین احمدیہ" جیسی بے مثل کتاب تھی اور اسی مشکوٰۃ نبوت کی تجلی ان کی متعدد تصانیف میں جلوہ گر ہے۔ اسی کی ذیل میں ایک سعی ناتمام عنوان بالا (یعنی "قرآن مجید، بائیبل اور وید پر ایک نظر"۔ ناقل) کے ماتحت کی گئی ہے۔" (پیغام صلح، مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۳۷ء، ص ۷)

اس کتاب کے باب ششم کا وہ حصہ جو عنوان "قرآن مجید میں رنگوں کا فلسفہ" سے لے کر آخر تک ہے، "پیغام صلح" کے جس سلسلۂ مضامین سے وہ اخذ کیا گیا ہے، اس کی ابتدا ہی میں مولانا صاحب تحریر کرتے ہیں:۔

"معارف قرآن مجید اور حضرت مسیح موعود: علماء امت کا اس امر پر اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے حقائق اور معارف قیامت تک کھلتے

رہیں گے۔ یہ امر بھی ظاہر ہے کہ آیت "لَا یَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ"
کی نصّ صریح کی رو سے جس شخص پر ان معارف قرآنیہ کا کثرت
سے انکشاف ہو وہ شخص کافر نہیں ہو سکتا۔ امت مسلمہ کی ساری
تاریخ ایسا شخص پیش کرنے سے قاصر ہے جو کثرت سے قرآن مجید پڑھتا
ہو اور جس کا وظیفۂ زندگی محمد رسول اللہ صلعم کی صداقت اور قرآن
مجید کی حقیقت ایسے دلائل اور براہین سے ثابت کرنا جس کی
نظیر علماءِ سلف اور اس کے ہمعصر علماء میں نہ پائی جاتی ہو ہمارے
اس زمانہ میں بقول ڈاکٹر اقبال مرحوم، مرزا غلام احمد ہی وہ شخص
ہے جس نے قرآن مجید کے ذریعہ محمد رسول اللہ صلعم کے ساتھ عشق کا
اظہار کیا۔ آپ نے اپنی سب سے پہلی تالیف براہین احمدیہ میں
آنحضرت صلعم کی صداقت پر جو دلائل اور براہین قرآن مجید
سے پیش کئے ہیں وہ معارفِ قرآنیہ کا ایک روشن باب ہے۔
اس کے بعد بھی آپ نے اپنی دوسری کتب میں اِن موتیوں کو
جگہ جگہ بکھیرا ہے۔ کاش مسلمان مخالف علماء کی کتب پڑھنے کی
بجائے خود حضرت صاحب کی کتب کا مطالعہ کرکے ان کے بارے
میں انصاف کرتے۔ براہین احمدیہ میں یہ دعویٰ کہ ۳۰۰ دلائل
اس قسم کے پیش کئے جائیں گے کسی مصلحت ربّی سے پورا نہ
ہوا۔ اگر حضرت صاحب معارف قرآن مجید اور دلائل و براہین
صداقت رسول اللہ صلعم کو ختم کر جاتے تو ہمیں تلاش و جستجو
کی لذّت سے محروم کر دیتے بلکہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ اظہارِ
عشق کی راہ بھی مسدود کر جاتے۔ مگر یہ لوگ انسان کے غور و فکر

پر مہر لگانے کے لئے نہیں بلکہ اسے زیادہ تیز اور مجلّٰی کرنے کے لئے آتے ہیں۔" (پیغام صلح، ۶ فروری ۱۹۴۶ء، ص ۵)

ایک مرتبہ حضرت مولانا صاحب نے اپنے علمی مضامین کی اشاعت کے انتظام کے لئے ایک مالی پیش کش کا اعلان اخبار "پیغام صلح" میں کیا، اور اس کے آخر میں لکھا:

"اس سلسلۂ مضامین کا مقصد براہین احمدیہ کی تکمیل ہے۔"

(مورخہ یکم مئی ۱۹۶۸ء، ص ۴)

اس لئے مناسب ہوگا اگر کتاب ہذا کا دوسرا عنوان **تکمیلِ براہین احمدیہ** سمجھا جائے۔

باب اوّل

بسم اللہ

(۱) حرف "ب" اور لفظ "اسم"

قرآن مجید کا بے نظیر افتتاح قرآن مجید کی ابتدا، بلکہ اس کتاب مقدس کی ہر سورۃ کی افتتاح بسم اللہ سے ہوتی ہے۔ "اللہ کے نام کی مدد کے ساتھ" اللہ تعالیٰ جو خالق کائنات ہے۔ اس نے ہماری ہر ضرورت، احتیاج اور تڑپ کا جواب اس عالم اسباب میں پیدا کیا ہے۔ ہم اپنی خلقی کمزوری اور بے مائیگی کی وجہ سے اس کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اعانت ہی ہماری حفاظت، تربیت اور ترقی کے اسباب کو ہم تک پہنچاتی ہے۔ پس انسان جو اپنی ذات سے فقیر محض ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جو ذاتی طور پر غنی اور صمد ہے ان دونوں میں رشتہ اور تعلق صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ یہ فقیر اپنی ہر ضرورت اور احتیاج اس صمد باری کے دروازہ پر لے جائے اور اسی سے مدد اور اعانت کا طالب ہو۔

بسم اللہ میں سب سے پہلا حرف "با" ہے۔ جو طلب اعانت کے لئے آتا ہے۔ یہ طلب اعانت کا حرف انسان کی بے سروسامانی اور اللہ تعالیٰ کی ذات غنی کے دو مختلف نظارے پیش کرتا ہے۔ ایک بے نوا فقیر (انسان) کے جذبات اور احساسات ایک طرف ہیں اور فیضان الٰہی کے موجزن چشمے دوسری طرف۔ بے بس اور بے کس طفل نوزاد ایک جانب ہے۔ اس کی ہر چیخ و پکار پر اپنی پوری توجہ اور کامل محبت کے ساتھ مائل ربوبیت دوسری طرف۔ اس کا

فرض ہے روئے اور چیخے، اس کی طرف اپنے ہاتھ پھیلائے۔ اور اس کی محبت کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی ہر ضرورت اور احتیاج پر دوڑ کر آئے۔ کسی الہامی صحیفہ کی اس قدر شاندار افتتاح مجھے نظر نہیں آئی جو فطرتِ انسانی اور اس کے خالق و مولےٰ کی صفات کا یہ پر کیف مرقع کھینچ سکی ہو۔ فالحمدُ للہ ربّ العالمین۔

عربی زبان کے امّ الالسنہ ہونے پر لطیفہ

زبانِ عرب میں مفرد حرف "با" کے ایک معنی طلبِ اعانت یا استمداد ہیں۔ سنسکرت زبان میں اسماء کے آخر پر ابھی، بھیہ اور بھیام کی علامات اسی مفہوم کو ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن مفرد حرف "با" کے معنی سنسکرت زبان میں کچھ نہیں۔ وہ صرف ایک آواز یا حرف با کا نام ہے۔ زبانِ انگریزی میں بائی (By) مصاحبت اور معیت ظاہر کرنے کے لئے آتا ہے۔ لیکن مفرد حرف بی (B) بے معنی اور محض ایک حرف کا نام ہے۔ علم الالسنہ کا یہ اصول اگر درست ہے کہ مرکبات مفردات سے بنائے جاتے ہیں، اور ابتدائی زبان بالکل سادہ تھی، تو ظاہر ہے کہ سنسکرت، انگریزی وغیرہ کے یہ تمام الفاظ جو معیت، اعانت اور استمداد کا مفہوم رکھتے ہیں، مرکب ہونے کی وجہ سے عربی زبان کے مفرد حرف "با" سے لئے گئے ہیں جو زبانِ عرب میں بے معنی نہیں بلکہ بیسیوں معنی رکھتا ہے۔

عربی حروفِ ہجا دنیا کی تمام زبانوں کی بنیاد ہے

عربی زبان کی ہجے دنیا کی زبانوں کی بنیاد ہیں۔ یہ امر لاطینی، یونانی، جرمن، فرنچ، عبرانی، سریانی، کلدانی اور انگریزی حروف کے نام سے ظاہر ہے۔ انگریزی میں الفابیٹ (Alphabet) الف، بے، تے کا مرکب ہے۔ یونانی، لاطینی وغیرہ زبانوں میں بھی قریباً قریباً یہی

نام ہے۔ اے، بی، سی، ڈی (A, B, C, D,) درحقیقت ابجد کے اجزا ہیں۔ کے، ایل، ام، این (K, L, M, N) کلمن کی برید ہے۔ کیو، آر، ایس، ٹی، (Q, R, S, T,) قرشت کے مقطعات ہیں۔ ایکس، وائی، زیڈ (X, Y, Z) ثخذ کی ترتیب پر ہیں۔ باقی کے حروف ابجد آدم کے عین مطابق تھے کیونکہ انگریزی حروف۔ یونانی اور لاطینی کے حروف سے ماخوذ ہیں جن کی ترتیب ابجدِ آدم سے لی گئی ہے۔ اس ترتیب کی بنا، پر ان تمام زبانوں میں حرف "با" حروفِ ہجے کا دوسرا حرف ہے۔ عربی زبان کے ام الالسنہ ہونے پر یہ دوسری دلیل ہے کہ ابجد میں با کی قیمت دو کا عدد ہیں۔ یورپ کی تمام علمی اصطلاحات میں بائی Bi, By کے معنی دو کا عدد ہیں مثلاً بائیسکل (Bicycle) دو پہیوں والا۔ اسی طرح بائی فولڈ (Bifold) بائی گیمی (Bigamy) وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستان کی ملتانی، گجراتی زبانوں میں بیا، انگریزی میں بائی (B i)، سنسکرت میں بھیام، لاطینی میں (B e)، ژندی میں ایبی یا ایوی، گاتھ میں (B e) اور بائی جرمن میں (B i)، دو عدد کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی دلیل بالکل ظاہر ہے، کہ حرف "با" حروفِ ہجے میں دوسرا درجہ رکھتا ہے۔ مگر سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں "با" حروف ہجے کا دوسرا حرف نہیں۔ تو سنسکرت میں بھیام اور ملتانی، گجراتی وغیرہ میں بیا دو کے عدد کی علامت کیسے قرار پا گیا؟ سنسکرت اور اس کی بیٹی پوتیوں میں تو حروف ہجے کا دوسرا حرف کھا (ख) ہے۔ ہم نے ابھی ثابت کیا ہے کہ یورپ کی تمام زبانوں نے الفابٹ (الف، بے، تے) عربی سے لی ہے۔ مگر ایک ہوشیار پنڈت نے اپنے استاد کا حقِ نمک یوں ادا کیا کہ ہر ایک چیز کی شکل مسخ کر دی تاکہ دنیا ایجاد کا سہرا اس کے سر پر باندھ دے۔ لیکن اس

سہرے کا ایک موتی ایسا بھی تھا جو اپنے رنگ کی شوخی اور چمک دمک سے دُرِّ عدن ہونے کی شہادت دے رہا تھا۔ موجودہ علم الالسنہ کی بناء پر دو کے عدد کا مفہوم ظاہر کرنے کے لئے "با" نہایت سادہ اور مفرد صورت ہے، مگر سنسکرت کا بھیام مرکب ہے۔ اور یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ مرکبات مفردات سے ترکیب پذیر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ یورپین زبانوں کے الفاظ Bi, Be, By وغیرہ کا رشتہ حرف "با" سے بہت قریب ہے اور بھیام سے بمراحل دُور ہے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ زبان سنسکرت کو عربی سے بگاڑ کر بنا لیا گیا ہے۔ دُنیا کی تمام علمی زبانوں میں عربی ابجدِ آدم کی ترتیب موجود ہے، مگر سنسکرت اور اس کی بیٹی پوتیوں نے اپنی حقیقی ماں سے انحراف کیا ہے، اور سنسکرت میں اسماء کے آخر میں بھیام (علامت تثنیہ) اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ اس گھر میں بہت سا مال مسروقہ موجود ہے۔

قرآن مجید کی علمی ترتیب۔ لفظ اسم

حروف "با" کے بعد قرآن مجید کا پہلا لفظ اسم ہے، جس کے معنی نام ہیں۔ کسی چیز سے تعلق، نسبت اور واسطہ پیدا ہو جانے کے بعد جسے حرف "با" ادا کرتا ہے، انسان کے لئے اس چیز سے معرفت سب سے پہلی ضرورت ہے۔

علم کے تین درجے ہیں۔ احساس و شعور، ادراک اور تصور Sensation Perception, Conception, حیوان میں اشیاء کا احساس ہوتا ہے مگر فکر یا Conception نہیں ہوتا۔ کسی چیز کا نام رکھنا اسی فکر پر منحصر ہے کیونکہ اسم درحقیقت اصل شے پر کسی نشان کا نام نہیں، بلکہ دماغ کے اندر شے کے تصوّر پر حکم یا نشان کو اسم کہا جاتا ہے۔ اور تصوّر حیوان میں نہیں۔ اسے

کسی چیز کے موجود ہونے کا احساس تو ہوتا ہے لیکن اس پر غور و فکر کر کے معرفت حاصل کرنا یہ صرف انسانی روح کی خوبی ہے۔ (۲) کائناتِ عالم کے اندر جو کچھ موجود ہے اس کی حقیقت ہماری نگاہوں سے مخفی ہے، ہمارے فہم اور فکر میں صرف اسماء آتے ہیں اور انہی سے ہم علم حاصل کرتے ہیں۔ (۳) جو کچھ بھی اس عالمِ ہست میں وجود پذیر ہوتا ہے، اس سے بہت عرصہ پیشتر اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ گویا نام پہلے آتا ہے اور شے بعد میں آتی ہے۔ پس ہر چیز کا نام ہی اس چیز کی معرفت کا ذریعہ ہے اس لئے قرآن شریف نے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ اس کا اسم یا نام قرار دیا ہے۔ وید اور بائیبل دونوں اس علمی ترتیب سے محروم ہیں۔ رگ وید کی ابتداء اگنی کی تعریف سے، یجروید کی اناج اور طاقت سے، اتھروید کی پانی کے فوائد سے، اور بائیبل کی زمین و آسمان کی پیدائش سے ہوتی ہے۔

عربی زبان میں فلسفہ اسماء

دُنیا کی قابلِ ذکر زبانوں میں کسی ہستی کے اظہارِ معرفت کے لئے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ آرین سلسلہ کی زبانوں میں جرمن، اینگلو سیکشن، ڈچ، آئیس لینڈک، گاتھک، سویڈش، لاطینی، یونانی، سنسکرت، زندی اور فارسی میں وہ لفظ قریباً قریباً نیم (Name) یا نام ہے۔ اور سامی زبانوں (کلدانی، سریانی، عربی اور عبرانی) میں وہ لفظ قریباً قریباً شیم یا اسم ہے۔ چنانچہ رگوید میں آتا ہے:

"نام دہرندرم نام دیوتا"۔ مجھے دیوتاؤں نے اِندر نام دیا ہے۔

اور بائیبل عبری میں شیم ہے۔ چنانچہ یرمیاہ ۱۱: ۲۱ میں ہے:

"بشیم یہوہ"۔ خدا کے نام میں (نبوۃ نہ کر)۔

آرین زبانوں کا لفظ نیم (Name) یا نام ان زبانوں میں اپنا کوئی فلسفہ

نہیں رکھتا۔ مغربی فلالوجسٹ کہتے ہیں کہ آرین سلسلہ کی تمام زبانوں کا یہ لفظ سنسکرت کے مادہ گیان اور جیان سے ماخوذ ہے اور یہ غلط ہے کیونکہ سنسکرت لغت میں لفظ نام کا مادہ گیان اور جیان نہیں۔ آرین زبانوں میں اس لفظ کا قدر مشترک یا جزو اعظم نم (ن اور م) ہے۔ گیان اور جیان دونوں میں صرف نون ہے مگر م ندارد ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت زبان میں کوئی مادہ نم نہیں، بلکہ خود نام بھی نامن سے ہے۔ زیادہ سے زیادہ سنسکرت لغت جو معنی اس کے ہمیں بتاتی ہے وہ بے شک البتہ تحقیق کے ہیں۔ مگر یہ معنی بطور مجاز ہیں نہ حقیقۃً کیونکہ ان معانی کے اندر لفظ نام کا کوئی فلسفہ موجود نہیں اور نامن خود لفظ نام سے بڑا ہے۔ مادہ کے لئے مختصر ہونا ضروری ہے۔

عربی زبان کا لفظ اسم اظہارِ معرفت کی ایک علامت یا نشان ہے کیونکہ زبانِ عرب میں وسم "کسی چیز پر نشان لگانے کو کہتے ہیں۔ سمّ کے معنی نشان ہیں۔ قرآن شریف میں ہے "حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ" (۷: ۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے نشان میں سے گزر جائے۔ پس اسم وہ نشان ہے جو کسی شئے کی معرفت کے لئے اس پر لگایا جائے۔ سم نہ صرف سامی زبانوں کے الفاظ شیم اور سمو وغیرہ کا ماخذ ہے بلکہ آرین سلسلہ کی زبانوں کے الفاظ سیما، سائن (Sign) اور سائنم (Signm) وغیرہ بھی اسی سے مشتق ہیں جن کے معنی نشان یا علامت کے ہیں۔

نام عربی زبان کا لفظ ہے

اس لفظ اسم کا ایک مادہ سمو بھی بتایا گیا ہے، جس کے معنی علو اور ارتفاع ہیں۔ اس بنا پر اسم وہ لفظ ہے جس سے مسمی کا ذکر بلند ہونا یا شہرت پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نام پانا، نام بلند ہونا، نامور، نام کیرتن، نام کرن وغیرہ محاورات، شہرت

پانے کے معنوں میں نہ صرف اُردو، فارسی، سنسکرت زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں، بلکہ قریباً قریباً ہر زبان میں مستعمل ہیں۔ انگریزی میں Renown کے معنی نامور یا مشہور کے ہیں۔ جن لوگوں نے نیم (Name) یا نام کا مادہ تلاش کرنے میں سنسکرت کی طرف توجہ کی ہے انہوں نے غلطی کی ہے اور خالی ہاتھ واپس لوٹے ہیں۔ اس لفظ کا مادہ وہ ہوسکتا ہے جس میں شہرت کا مفہوم پایا جائے۔ اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ "نام" بھی عربی کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہلکی آواز اُٹھانے یا بلند کرنے کے ہیں۔ اس بلیغ زبان میں آواز بلند کرنے کے تیس درجے ہیں، اور ہر ایک درجہ کو ایک الگ نام دیا گیا ہے۔ اس میں آٹھ درجے صوتِ خفی کے ہیں اور بائیس درجے صوتِ شدید کے ہیں۔

صوتِ خفی کے درجے ہیں: رز (نہایت خفیہ آواز) رکز (جو مکھی کی بھنبھناہٹ کے برابر ہو)، ہتمل (سرکی آواز کے برابر)، ہینمہ، دندنہ (جو نغمہ سے ملتی ہو)، نغمہ (اسے حسنِ کلام سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد درجہ نیاۃ ہے، اور اس سے اوپر آواز کا درجہ نام کہلاتا ہے اور یہ صوتِ خفی کا آخری درجہ ہے۔ اس کے بعد ۲۲ درجے صوتِ شدید کے ہیں۔ صوتِ خفی کے آخری درجہ اور صوتِ شدید کے ابتدائی درجہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں اس لحاظ سے "نام" عربی زبان میں ایسی آواز کا بلند کرنا ہے جو دوسرے کی سمجھ میں تو آسکے مگر ناگوار نہ ہو یا صوتِ شدید نہ ہو۔ صوتِ خفی یا صوتِ شدید کے ترتیب وار ۳۰ درجے مقرر کرنا، ان کے الگ الگ نام بتانا، یہ عربی زبان کے الہامی اور کامل زبان ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے۔ آج بڑی سے بڑی ترقی یافتہ زبانیں بھی اپنی لغت میں آواز کے اتنے درجے نہیں رکھتیں۔

پس دنیا کی تمام زبانوں میں اظہارِ معرفت کے لئے جو الفاظ (Name) یا نام وغیرہ استعمال ہوتے ہیں ان کا ماخذ عربی زبان کا لفظ نیم یا نام ہے۔ جو

ایسی آواز بلند کرنے کو کہتے ہیں جو مسمی کو دوسری اشیاء پر شہرت دیدے، دوسرے لوگوں کو وہ شے سمجھا دے، کیونکہ عربی میں نئم اس آواز کو کہتے ہیں جو بیّن اور واضح ہو اور اتنی خفیہ نہ ہو کہ دوسروں کو سمجھ نہ آسکے۔

(۲) اللہ۔ اس لفظ کی فوقیت وجامعیت

ابتدا میں انسان کو زبان کی تعلیم نیچر کی آوازوں کی نقل سے دی گئی، جیسا کہ صوت کے اتار چڑھاؤ کے ۳۰ درجوں سے ظاہر ہے۔ پس کسی شے کے اظہار معرفت کے لئے لفظ "نام" اس بنا پر رکھا گیا کہ اس نے بیّن الفاظ میں مسمی کو سمجھا دیا، اور اسے "اسم" اور "رشیم" سے اس لئے تعبیر کیا گیا کہ وہ اس شئے کے لئے بطور ایک نشان یا (Sign) کے تھا۔ اللہ اُس ذاتِ باری کا اسم ذات ہے جو کائناتِ عالم کی خالق ہے۔ اسمِ ذات اللہ کو دنیا کی کل زبانوں کے اسماءِ الٰہی پر ایسی فوقیت اور جامعیت حاصل ہے جیسے ذاتی نام کو اپنے مسمی کی تمام صفات پر حاصل ہوتی ہے۔ اس اسم اللہ میں باقی تمام زبانوں کے اسماءِ الٰہیہ کے بالمقابل کثرتِ خصوصیات حاصل ہیں، جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں کیا جائے گا۔

اللہ کے معنی

اللہ جس کے معنی ہیں مستجمع جمیع) صفاتِ کاملہ، یعنی جس میں تمام صفات، خوبیاں اور اتم کُن موجود ہیں اور کامل رنگ میں موجود ہیں، یہ ہستی باری تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اس نام کے تصوّر میں قرآن مجید کی بنا پر دو مقاصد مطلوب ہیں:۔

(۱) انسان کی ذاتی اصلاح اور تہذیب

(۲) مذاہبِ عالم میں اتحاد

جس ہستی سے تعلق قائم کر رہے ہو یا جس کی معرفت کا سبق تمہیں دیا جا رہا ہے یا اس سے اعانت کے طالب ہوئے ہو، جان لو کہ وہ ہمہ حسن اور خوبی ہے اور حسن و خوبی کو پسند کرتا ہے۔ اس کے حضور حاضر ہونے کے لئے پاک لباس کی ضرورت ہے۔ جو تقویٰ کا لباس ہے، یا تمہارا بھی حسین ہونا شرط ہے مگر حسنِ عمل کے ساتھ، نہ تناسب جسم کے ساتھ۔ جس طرح عطار کو طبعاً بدبو ناگوار ہے اسی طرح ہمہ خوبی ذات کو بدی اور عملِ مکروہ ناپسند ہے۔ جو اپنے کپڑے دھوتے ہیں بس وہ اسی کے ہوتے ہیں۔ ذات باری کا یہ حسین تصور اصلاح نفس اور تہذیبِ روح کے لئے از بس ضروری ہے۔

اسم ذات اللہ کا تصور مذاہب عالم میں اتحاد کی بنیاد ہے۔ یہ نام کسی ایک صفتِ باری پر دلالت نہیں کرتا بلکہ تمام صفاتِ باری تعالیٰ کا مظہر ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں کوئی ایسا اسم موجود نہیں جس کے معنی مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ ہوں یا جیسا کہ پروفیسر لین (Lane) نے اس کا ترجمہ کیا ہے:

Comprising all the Attributes of perfection

دنیا میں ہر شخص کی حیثیت صرف انفرادی نہیں بلکہ اس کی جماعتی حیثیت اکثر صورتوں میں فائق ہے۔ اس لئے خدا کے تصور میں ان دو اصولوں کو اپنے سامنے رکھنا ضروری ہے کہ اس کی ذات میں وہ صفاتِ حسنہ موجود ہیں جن کی روح انسانی کو اپنی تہذیب کے لئے ضرورت ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کی ذات میں وہ خوبیاں بھی موجود ہیں جن پر ایمان لانا نسلِ انسانی میں قیامِ امن یا صلح وسلامتی کا موجب ہو سکے۔ اسم ذات اللہ کے مفہوم میں یہ دونوں اُمور بدرجہ اتم موجود ہیں، یعنی ایک تو وہ ذات اپنے اندر صرف خوبیاں ہی رکھتی ہے۔ اس سے اس کی ذات میں ہر قسم کے عیب اور نقص کی نفی ہو گئی، یعنی ہر ایک صفت کمال

میں بے نظیری اور بے مثالی اس کی ذات کا خاصہ ہے اور دوسرے یہ کہ کوئی خوبی اور کمال کی صفت ایسی نہیں ہوسکتی جس کو دنیا نے عقلمند اور دانا، یا انسان کا ترقی یافتہ دماغ حسن و خوبی قرار دے اور وہ اس ذات میں نہ پائی جاتی ہو۔ چنانچہ اسم اللہ کے یہ معنی قرآن مجید نے دوسری جگہ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۷: ۱۸۰) بتائے ہیں کہ اللہ ہی کے لئے تمام اعلیٰ درجہ کے نام یا صفات ہیں۔

دیگر مذاہب کے اسماء الٰہیہ

اسلام میں خدا کا تصور کس قدر بلند ہے۔ یہ امر دوسرے مذاہب کے تصورِ خدا کے ساتھ مقابلہ کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہودی مذہب، عبری زبان اور بائیبل مقدس نے اس ذات کا نام یہوہ اور ایلوہیم بتایا ہے۔ عیسائی مذہب ان دو ناموں کے علاوہ الفا (Alpha) اور امیگا (Omega) اور خدا محبت کو پیش کرتا ہے۔ ہندو اپنی ہندی میں پرماتما، پر برہم، پرمیشور، اور اوم اس کے اعلیٰ نام قرار دیتا ہے۔ ایرانی اسے خدا کہتے ہیں۔ پارسی یزدان اور ہرمز سے اسے یاد کرتے ہیں۔ انگریز اس کا نام گاڈ (God) بتاتے ہیں۔ سکھ ست کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ چند ایک نام اس ذات کے مختلف مذاہب اور زبانوں کے ہم نے پیش کئے ہیں۔ اس پر دوسرے مذاہب کے اسماء باری کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ایلوہیم کے معنی عربی لغت میں معبود کے ہیں، جس کی واحد "الوہ" ہے اس لئے یہ اسم معبودِ حقیقی اور معبودانِ باطلہ دونوں میں استعمال ہوا ہے۔ دیکھو خروج ۱۲: ۱۲ اور ۲۰: ۳۔ لفظ یہوہ جس کے صحیح تلفظ میں سخت اختلاف ہے، اس کے معنی "وہ جو ہے"، الفا کے معنی "الاول"، امیگا کے معنی "الآخر" ہے محبت ایک حاصلِ مصدر ہے نام نہیں، تاہم ایک صفت خاص ہے۔

پر برہم۔ بہت وسیع اور بڑا۔

پرماتما۔ اعلیٰ روح

پرمیشور۔ بڑا مالک

یہ سب نام مرکب ہیں اور حرف "پر" سے ترکیب پذیر۔

"اوم"، مصدر "او" سے (اسم فاعل) "حفاظت کرنے والا"۔ اس مصدر سے اویں، دیومن، اومنا، اوماسہ، اوماہہ وغیرہ الفاظ بنے ہیں، جن کے معنی حسب ترتیب "حفاظت کرنے والی"، "محافظ"، "دو حفاظت کرنے والے" اور "سب حفاظت کرنے والے" ہیں۔

فارسی نام "خدا" خود آئندہ کا مخفف ہے۔ یزدان کے معنی خالق ہیں۔ گاڈ (God) مصدر گڈ (Good) سے ہے، جس کے معنی اچھا یا معبود ہیں۔ سکھ دھرم کا ست بمعنی حق ہے۔

مذاہب اور اقوام کے یہ سب اسماء باری معبود، موجود، اوّل و آخر، اعلیٰ روح بہت وسیع، بڑا مالک، محافظ، خود بخود، خالق، حق، عقل و نور (بدھ)، اس ذات کی صرف ایک ایک صفت کو ظاہر کرتے ہیں لیکن اسم ذات "اللہ" ان تمام صفات اور ایسی ہی سینکڑوں صفات پر حاوی ہے اور اسم ذات صرف وہی ہو سکتا ہے جو تمام صفات کا موصوف ہے۔

مذاہب کے اسماء الٰہی میں اتحاد کا رشتہ

متذکرہ بالا تمام مذاہب اور اقوام میں اس ہستی کے جو نام پائے جاتے ہیں، اگرچہ وہ ایک دوسرے سے بدرجہ غایت مختلف ہیں اور خدا کی سب سے اعلیٰ صفت کے متعلق ہر ایک قوم اور مذہب کا خیال بالکل جدا ہے، تاہم ایک بات سب میں یکساں پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ اس معبودِ حقیقی کی ایک صفت

کو ہی یہ سب قومیں اور مذاہب بیان کر رہے ہیں اور ان میں کوئی ایک بھی صفت ایسی نہیں جو منافی شانِ باری ہو۔ سارے نام ایک ہی ذات کے ہیں اور سب اسی ایک محبوب کے گن گا رہے ہیں۔ اور اگر یہ سچ ہے اور یقیناً سچ ہے تو پھر خداوند ایلوہیم کے ماننے والے اور یہوہ پر اعتقاد رکھنے والے اوم، پرماتما، پربرہم، پرمیشور اور لفظ خدا سے کیوں بَیر رکھتے ہیں۔ کیا وہ خدا کی صفات کے منکر ہیں، اور اوم پر یقین رکھنے والے خدا کے نام یہوہ اور ایلوہیم سے کیوں نفرت کرتے ہیں۔ کیا زبان کے اختلاف سے اصل شے کی حقیقت بدل گئی۔ انگور یا سیب کا کسی زبان میں بھی نام لو مگر اس کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ تو اوم پر اعتقاد رکھنے والے خدا کی صفت یہوہ اور ایلوہیم یعنی پوجیہ اور سمت (ہست) ہونے کے کیوں منکر ہیں۔ ہندوؤں کو خدا کے فارسی نام سے کیوں چڑ ہے، اور عیسائیوں کو اس کے سنسکرت نام سے کیوں عناد ہے۔ زبانیں گو جدا جدا ہیں مگر سب اس معبودِ حقیقی کا نام اپنی اپنی بولی میں لیتے ہیں۔ قرآن شریف مذاہب کے اس جھگڑے کو یوں مٹاتا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (۱۴: ۴) "ہم نے ہر ایک رسول کو اس کی قوم کی زبان میں رسالت دی"۔ اسماء اور صفات ایک تھے، مگر زبان کے فرق نے اسے الگ الگ کر دیا۔ اب بھی لوگوں کے دماغ میں خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی اسماء کی کیفیت ایک ہے مگر زبان پر آتے ہی یہ کیفیت پارہ پارہ ہو کر بکھر جاتی ہے۔ اتھرو وید نے اس حقیقت کو یوں ادا کیا ہے:۔

جنم بھرتی بہودا وِ واچسم ناناد ھرمانم پرتھوی
یتھاؤ کسم

जन्म बिभर्ति बहुधा इव वाचसम्
नाना धर्माणम् पृथ्वी यथा अवकाशम्।

لوگوں کی بود و باش کے لحاظ سے زمین مختلف، بولی بولنے والے دھرم (مذاہب) رکھتی ہے۔ دنیا میں بلاشبہ مختلف عقائد رکھنے والے بے شمار مذاہب موجود ہیں، لیکن اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بہت حد تک درست معلوم ہوتی ہے کہ مذاہب کے اختلافات کا بیشتر حصہ محض اختلافاتِ زبان پر مبنی ہے۔ ہندو اپنی زبان میں خدا کا نام سن کر تو خوش ہوتے ہیں اور اس نام کا وِرد کرنا بڑے ثواب کا موجب سمجھتے ہیں۔ مگر جب اسی نام کا عربی یا عبری اور پارسی زبان میں ترجمہ کر دیا جائے تو اس سے نفرت کرتے ہیں۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ ملک و قوم و زبان کی حد بندیوں سے بالا ایک نام ہے، تمام اسماء حسنیٰ خواہ عبری کے ہوں، سنسکرت کے ہوں، پارسی کے ہوں یا دنیا کی کسی اور زبان کے، ان سب کا موصوف اللہ ہے کیونکہ وہ کسی ایک صفاتی نام پر دلالت نہیں کرتا بلکہ مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ ہے۔

(۳) اللہ۔ خدا کا ذاتی نام

غالباً ہر لکھا پڑھا انسان جانتا ہے کہ اسماء دو قسم کے ہوتے ہیں:۔

(۱) اسماء ذات (Proper Names)

(۲) اسماء صفات (Attributes)

صفات اکثر اور بیشتر مشترک ہوتی ہیں۔ اس لئے کسی چیز کی محض صفات بیان کرنے سے اس کی بالکلیہ شناخت نہیں ہوتی۔ نیز کسی شے کی صفات شماری ایک ایسا لمبا راستہ ہے جس پر چل کر بہت دیر کے بعد ہم اس کی معرفت تک پہنچتے ہیں، اور کبھی بالکل نہیں پہنچتے۔ لیکن اسم ذات ایک خطِ مستقیم ہے جو ہمیں فوراً منزلِ مقصود پر لے جاتا ہے۔ بعض اوقات کسی شے کی صدہا صفات سن کر بھی ہمارا آخری سوال یہی ہوتا ہے کہ وہ ہے کیا؟ اس کا نام کیا ہے۔ جس کی آپ اتنی خوبیاں بیان کر رہے ہیں۔ اگر متعدد صفات بیان کرنے کی بجائے صرف اس کا نام بتا دیا

جاتا تو ہر شخص کے ذہن میں اس کا نام سنتے ہی اس کی تمام صفات صورت پذیر ہو جاتیں۔

میں نے بتایا ہے کہ صفات اکثر اور بیشتر مشترک ہوتی ہیں۔ اس لئے اس طرز کلام سے ایک شخص گمراہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً وید کہتا ہے "وہ تھا، وہ ہے، وہ ہوگا" "وہ ایک ہے"۔ رشی اس کو بہت کر کے پکارتے (رگوید)۔ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اس میں صریح طور پر خدا کا ذکر ہے، لیکن کیا یہ اگنی اور سورج کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کیا اس منتر سے ہمہ اوست اور ویدانت کا عقیدہ پیدا ہو کر ہر چیز کو خدا نہیں سمجھا گیا۔

بائیبل میں خدا کا نام "یہووہ" ہے، جس کے معنی ہیں "وہ ہے" اور اس میں زور ہے پر ہے۔ جو صرف اس کی موجودگی کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ہر صفت موصوف ہونے کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔

اسلام کے سوا تمام مذاہب اس خدا کی صرف ایک ایک صفت کو اس کا اعلیٰ نام قرار دے رہے ہیں۔ اس پر ہم ان سے یہ عرض کرتے ہیں کہ یہ تمام صفات جو آپ لوگ اس ذات کی بیان کر رہے ہیں، بہت اچھی، نہایت مناسب اور خدا کی شان کے شایاں ہیں، مگر ہم ان اعلیٰ صفات کے رکھنے والی ہستی کا نام پوچھتے ہیں کہ کیا ہے، اور اس کا ذاتی نام وہی ہونا چاہیئے جو ان تمام صفات پر حاوی ہو یا ان کا قائم مقام ہو۔ خدا کا تصور کامل نہیں کہلا سکتا جب تک اس کی کل صفات کو اپنے اندر جمع کرنے والا کوئی اس کا اسم ذات نہ ہو، کیونکہ کوئی ایک خاص صفت یا صفاتی نام دوسری تمام صفات کا موصوف نہیں کہلا سکتا۔ اس کا علیم ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا علم کامل ہے، مگر یہ کہ وہ زندہ ہے، قادر ہے، کریم ہے، رحیم ہے، ان صفات کا موصوف علیم کو کیسے ٹھہرایا جائے جسے واضع نے صرف کمال علم کی صفت کو ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا ہے۔ پس اس ذات کا ہر وہ نام جو مختلف مذاہب اور

اقوام میں رواج پذیر ہے اسم ذات یا مستجمع جمیع صفات کا ملہ کا مفہوم پیدا نہیں کرتا، اور اسمائے صفات اپنے مشارٌ الیہ اسم ذات کے بغیر گمراہی اور شرک کا موجب ہو سکتے ہیں۔

اسمِ ذاتِ باری تعالیٰ دنیا میں ایک ہی ہے

اگر کل قوموں اور ملکوں کا خدا ایک ہی ہے، تو اس کا صحیح تصوّر بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اس لئے اس کا ذاتی نام جو فی الحقیقت تصوّرِ ذاتِ باری کا نقطۂ مرکزی ہے ایک ہی ہونا چاہیئے۔ اگر خدا کا یہ تصوّر کہ وہ مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ ہے، معقول اور درست ہے، اور اس پر کسی قسم کی زیادتی از روئے عقل ناممکن ہے، تو پھر اس کا ذاتی نام بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس تصوّر کو ہمارے ذہن میں پیدا کر دے، اور اس کا یہ نام اس کی باقی کل صفات پر ایک گونہ فضیلت رکھے گا، اور وہ دنیا کی کل قوموں اور مذاہب کا مشترک نام ہو گا۔ مذاہبِ عالم کے تصوّرِ ذاتِ باری میں رشتۂ اتحاد یا حبل متین کا کام دے گا۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسا کوئی لفظ عربی زبان کے سوا دنیا کی کسی زبان میں موجود نہیں ہے جس کے معنی مستجمع جمیع صفات کاملہ ہوں، خواہ وہ زبان سنسکرت ہو، عبرانی ہو، فارسی ہو، انگریزی ہو، یا کوئی اور قدیم سے قدیم زبان ہو۔ فی الحقیقت یہ دعویٰ ہمارا اپنا دعویٰ نہیں ہے۔ قرآنِ کریم نے خود اس کی تحدی کی ہے، فرمایا:۔

هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (۱۹ : ۶۵)

یعنی، اے مخاطب، کیا تو اس نام کے مقابل کوئی اور نام بھی جانتا ہے کہ جو معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اس کے برابر اتر سکے یا خدا کے تصور کا ایسا اعلیٰ مفہوم پیدا کر سکے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں اصول یہ ہے کہ جب کسی

مضمون یا عبارت کا ترجمہ کسی ایک زبان سے دوسری زبان میں کیا جاتا ہے تو ہمیشہ اسماءِ ذات (Proper Names) کا ترجمہ نہیں کیا جاتا۔ باقی تمام عبارت اور صفات کا ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً آپ کسی شخص کے متعلق کوئی مضمون انگریزی، عربی، فارسی یا سنسکرت زبان میں لکھئے تو اس شخص کے نام کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کریں گے، ورنہ مضمون بے معنی اور مبہم ہو جائے گا۔ اسی طرح خدا جو تمام دنیا کی اقوام اور مذاہب میں ایک معروف ہستی ہے، اور تمام الہامی مذاہب اس خدائے واحد کی طرف سے ہیں، اس کے ذاتی نام کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کر کے اس ایک پر اعتقاد کو مبہم بلکہ باعثِ فتنہ کیسے بنایا جا سکتا تھا۔

علاوہ ازیں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ذہنِ انسانی نے بتدریج ارتقاء کی منازل کو طے کیا ہے۔ اس لئے زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کا تصوّرِ ذاتِ باری بھی زیادہ شائستہ اور مکمل ہوتا گیا ہے۔ تاہم جس طرح خدا کی ذات ہمیشہ سے ہر صفت موصوف موجود تھی، اسی طرح اس کا ذاتی نام بھی جو اس تصوّر کو ظاہر کرتا تھا، موجود تھا، اگرچہ ذہنِ انسانی میں نہ تصوّرِ ذاتِ باری کامل تھا اور نہ اس نام کا صحیح مفہوم ہی دلنشیں تھا۔

خدا کے اسم ذات کے لئے چند ضروری شرائط

قرآن کریم کے جلّ الحمد اللہ میں یہ بھی ایک خوبی ہے کہ اسم اللہ کو تمام قسم کی حمد (خوبی اور تعریف) کا موصوف اور مستحق ٹھہرایا گیا ہے اور سارے قرآن کریم میں اسی اسلوبِ بیان کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کسی ایک جگہ بھی اس نام کو کسی دوسرے موصوف کی صفت نہیں قرار دیا گیا۔ بعینہٖ جس طرح کوئی شخص پیپل کے نام کو اس کی کسی دوسری صفت کی صفت نہیں قرار دے سکتا۔ اسی طرح خدا کے اسم ذات کو بھی تمام صفات کا موصوف ہونا چاہیئے۔ جو شخص اپنی مذہبی کتاب میں سے کوئی اور لفظ اس ذات کے لئے بطور اسم ذات پیش کرے اس کو چاہیئے کہ وہ اس کتاب میں

سے یہ بھی ثابت کرے کہ وہ نام ہمیشہ ہمیشہ اس کی کتاب میں باقی تمام صفات کے موصوف کے طور پر استعمال ہوا ہے اور کسی دوسرے صفاتی نام کی صفت واقع نہیں ہوا کیونکہ صفات تو ہمیشہ ذات کی تابع ہوتی ہیں مگر ذات کسی ایک صفت کے نیچے نہیں لائی جا سکتی۔

۲۔ عربی زبان میں لفظ اللہ کبھی کسی غیر معبود یا کسی اور شے کے لئے استعمال نہیں ہوا لسان العرب میں لکھا ہے:

اِسْمٌ مُخْتَصٌّ لِلّٰهِ لَا يَجُوْزُ اَنْ يُّسَمّٰى بِهٖ غَيْرُهٗ "یہ اسم اللہ ذاتِ باری کے لئے خاص ہے اس لئے یہ جائز نہیں کہ کسی اور شے کا نام اللہ رکھا جائے۔"

پس اس بنا پر اسم ذاتِ باری تعالےٰ کے لئے یہ بھی ایک ضروری شرط ہے کہ اس کا اطلاق کسی دوسرے چیز پر نہ ہو سکے تاکہ توحید الٰہی میں شبہ وارد نہ ہو سکے۔

۳۔ دنیا میں اگر فی الواقعہ کوئی چیز اپنی صفات کے لحاظ سے اَحد اور لاشریک ہو تو اس کے نام کا کوئی مصدر، دھاتو یا مادہ (Root) نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ مصدر یا مادہ سے ہمیشہ الفاظ کی برادری پیدا ہوتی ہے اور اس برادری کے تمام افراد آپس میں ایک گونہ اشتراکِ معنوی رکھا کرتے ہیں۔ مگر خدا چونکہ رشتے اور برادریوں سے پاک ہے۔ اس کے نام کا بھی کوئی مصدر یا مادہ نہیں ہونا چاہئے تاکہ اس کی ہستی شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے پاک رہے۔ عربی زبان میں لفظ اللہ کا کوئی مادہ اور مصدر نہیں۔ جو صاحب اس نام کے مقابل اس ذات کا کوئی اور اسم ذات پیش کریں تو یہ خوبی بھی ان کو اس نام میں ثابت کرنی پڑے گی۔

پنڈت رام چندر دہلوی کے اعتراض کا جواب

بعض حضرات اس دلیل پر یہ اعتراض کریں گے کہ جب لفظ اللہ کا کوئی ماخذ یا مادہ نہیں ہے تو کس طرح معلوم ہوا کہ

اس لفظ کے معنی مستجمع جمیع صفات کاملہ ہیں کیونکہ الفاظ ہمیشہ مصدری معانی کی بنا پر اپنا مفہوم ظاہر کرتے ہیں۔ میرے دوست، پنڈت رام چندر دہلوی نے دورانِ مناظرہ میں اس پر یہ بھی مستزاد کیا کہ جب لفظ اللہ کا کوئی مادہ نہیں تو اللہ کے معنی ہی کیوں مستجمع جمیع صفات کاملہ ہیں۔ پلاّ اور رکلاّ کے یہ معنی کیوں نہیں۔ ان لوگوں کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی زبان میں بھی ابتداءً اسماء مصادر سے نہیں بنائے گئے اور نہ دنیا میں کوئی ایسا زمانہ گذرا ہے کہ جب لوگ صرف مصادر اور مادوں کو استعمال کرتے تھے اور پھر ان سے اسماء اور افعال بنائے گئے ہوں۔ ہمارے آریہ دوستوں کا عقیدہ تو یہ ہے کہ وید ہی وہ کتاب ہے، جو نسل انسانی کو سب سے پہلے دن دی گئی اور لوگوں نے نہ صرف مختلف زبانیں بلکہ سنسکرت زبان بھی ان ہی ویدوں سے سیکھی۔ اس سے پہلے لوگوں کی کوئی زبان نہ تھی۔ اگرچہ یہ ایک نامعقول خیال ہے کیونکہ زبان جاننے کے بغیر ویدوں کا سمجھنا کیسے ممکن تھا تاہم پنڈت رام چندر کی اس بودی دلیل کو کہ جس پرماتما نے گنگے کو زبان دی اسی پرماتما نے ان کو زبان نہ جاننے کے باوجود وید سمجھا دیئے۔ ہم تسلیم کئے لیتے ہیں اور ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا ویدوں میں مصادر اور مادے ہی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں بلکہ اسماء اور افعال استعمال ہوئے ہیں اور اس سے پیشتر تو آپ کے خیال میں زبان کا وجود ہی نہیں تھا تو افعال کس زمانہ میں مصادر اور مادوں سے بنائے گئے اسماء اور افعال کے مادے اور مصدر بتانے والا پانی منی تو ہزاروں سال بعد ہوا۔ علم الالسنہ سے یہ ثابت ہے کہ ہر ایک زبان کی طبعی ترتیب یوں ہے کہ پہلے اسماء ہوتے ہیں پھر ان سے افعال بنتے ہیں اور ایک عرصہ دراز کے بعد جب قواعدِ زبان کی تدوین ہوتی ہے تو چند ایک ہم شکل اسماء اور افعال سے ایک قدر مشترک نکال کر ان کا مادہ یا مصدر قرار دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر اسماء اور افعال کے مصادر اور مادوں میں اختلاف پایا

جاتا ہے اور بعض افعال اور اسماء ایسے بھی ہیں جن کے متعلق ابھی تک کچھ طے نہیں ہوا کہ ان کا مادہ کیا ہے۔ علماءِ سنسکرت بھی اس میں شامل ہیں۔

جن اسماء اور افعال کے مادے اور مصادر معلوم نہیں ہو سکے اہل زبان ان کو استعمال کرتے ہیں اور ان کے معانی کے لئے اہل زبان ہی سند سمجھے جاتے ہیں۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کا انکشاف وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (۲ : ۳۱) میں کیا ہے کہ آدم کو پہلے اسماء ہی سکھائے گئے اور نسل انسانی کا ہر ایک بچہ پہلے زبان کے اسماء ہی سیکھتا ہے افعال کا مرتبہ بعد میں آتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے آریہ دوست بھی اپنے بچوں کو پہلے مصادر اور مادے نہیں سکھاتے۔ بابا۔ چاچا۔ ماتا۔ دودھ وغیرہ اسماء ہی سکھاتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ افعال سکھاتے ہیں۔ دھاتو اور مصادر تو شائد گورو کل میں پڑھے بغیر کوئی سیکھتا بھی نہیں۔

پس الفاظ کے معانی کی صحت کا معیار ان کے دھاتو اور مصادر نہیں بلکہ اہلِ زبان کا استعمال ہے ورنہ ہم پوچھتے ہیں کہ مصادر اور مادوں کے معانی کی صحت کا معیار کیا ہے آپ اس کے سوا کچھ نہیں بتا سکتے کہ اہلِ زبان کا استعمال۔ پنڈت رام چندر دہلوی سے شملہ میں ہم نے یہ سوال کیا تھا کہ :-

۱۔ اوم کے معنے حفاظت کرنے والے کیوں ہیں ؟

۲۔ تھوم[1] کے معنی حفاظت کرنے والا کیوں نہیں ؟

آپ اس کا جواب یہ دیں گے کہ چونکہ اوم کا مصدر اُو ہے کہ جس کے معنی حفاظت کرنا ہیں۔ لہٰذا اوم کے معنی حفاظت کرنے والا۔ میں پوچھتا ہوں اُو کے معنی حفاظت کرنا کیوں ہیں ؟ آپ اس کے سوا کیا جواب دے سکتے ہیں کہ اہلِ زبان

---

[1] : یہ ثوم (لہسن) کا پنجابی لفظ ہے۔ یہ پلاّ اور کلاّ کا ترکی بہ ترکی جواب تھا۔

اس کو اسی معنی میں استعمال کرتے ہیں ورنہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تھوم کے معنے حفاظت کرنے والا ہیں اور اس کا مصدر تُھو ہے اور آپ از روئے قواعدِ زبان اس کی تردید نہیں کر سکتے۔ سوائے اس کے کہ آپ یہ کہدیں کہ سنسکرت لغت یا زبان اس کی شہادت نہیں دیتی۔ پس الفاظ کے معانی کے لئے اصل معیار اہلِ زبان کا استعمال ہے نہ اور کچھ۔ البتہ عربی زبان میں جو الفاظ کا فلسفہ ہے اس کو ہم کسی اور موقعہ پر بیان کریں گے۔ پس لفظ اللہ کے معنوں کے لئے سند لغتِ عرب اور اہلِ زبان، کی شہادت ہے کہ جو اس کے معنی مستجمع جمیع صفات کاملہ بتاتی ہے اور یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ خدا کی کوئی برادری نہیں اس لئے اس کے نام کی بھی برادری نہیں ہونی چاہئے۔ کیونکہ اسماء ہمیشہ مسمیات کے باہمی تعلقات اور رشتوں کے لحاظ سے اپنے مادہ کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ خدا کی برادری نہ ہونے سے عربی زبان میں اس کے نام کی بھی کوئی برادری نہیں اس لئے اس کے مادہ کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہونی چاہئے۔

اسم ذات باری معلوم کرنے کا ایک اور معیار

جو صاحب اپنی کتاب یا مذہبی زبان میں سے اس ذات کا کوئی نام پیش کریں ان کو یہ بھی لازم ہے کہ وہ کوئی ایسا نام پیش کریں کہ اس لفظ کا تثنیہ اور جمع کا صیغہ اس کتاب یا زبان میں نہ ہوتا کہ بہت سے خدا ہونے کا شبہ نہ ہو۔ کیونکہ اگر اس کے ذاتی نام کا تثنیہ اور جمع بھی استعمال میں آتے ہوں تو خدا کے ایک ہونے کی کوئی دلیل اس کتاب کے اندر نہ رہے گی۔ اسی طرح اس نام کی تانیث بھی نہیں ہونی چاہئے تاکہ مذکر اور مونث (د.یوتا اور د.یوی) دو خدا سمجھے جانے کا دھوکا نہ ہو۔ جیسا کہ بعض مذاہب اسی غلطی سے میاں بیوی دو خدا مان بیٹھے۔

اسم ذات اللہ کے سوا جتنے بھی نام اس ذات کے غیر مذاہب کی کتابوں سے ہم نے گذشتہ صفحات میں گنوائے ہیں وہ اسم ذات اس لئے نہیں ہو سکتے کہ:

۱۔ بعض نام مرکّب ہیں اور مفرد الفاظ سے مل کر بنے ہوئے ہیں۔

۲۔ خدا اور غیر خدا دونوں پر ان اسماء کا اطلاق ہوتا ہے۔

۳۔ وہ ایسے صفاتی نام ہیں جو ایک ایک صفت کو ظاہر کرتے ہیں۔ تمام صفاتِ باری پر حاوی نہیں ہیں۔

۴۔ الہامی کتابوں میں ان تمام اسماء کو باقی تمام صفات کا موصوف نہیں ٹھہرایا گیا۔

۵۔ ان کا ترجمہ دوسری زبانوں کے ایک ایک لفظ میں ہو سکتا ہے۔

۶۔ ان کے مادے اور مصادر ان کی زبانوں میں موجود ہیں کہ جن سے خدا کے نام کی برادری پیدا ہوتی ہے۔

۷۔ ان کا تثنیہ، جمع اور تانیث ان زبانوں کے اندر موجود ہے کہ جس سے کثرت آلہہ کا شبہ ہو سکتا ہے۔

اسم ذات اللہ ان تمام نقائص سے پاک ہے۔

یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں میں خدا کا نام نامعلوم

بائیبل کا خداوند یہوہ (Yehovah) جو اس ذات کا غیری نام ہے، ہمیشہ معرض تحریف میں رہا ہے، اور اس کا صحیح تلفظ آج دنیا میں کسی شخص کو معلوم نہیں۔ اس کی مختلف قراتیں یہوہ، یہاوہ، یہوا، اور یہوِ بتائی جاتی ہیں۔

خدا کا نام یہود میں گم ہو جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ خدا کا نام لینا بے ادبی خیال کرتے تھے۔ اس نام کی اس قدر حرمت اور تعظیم کی گئی کہ کوئی یہودی عام طور پر اپنی زندگی کے ۲۴ گھنٹوں میں اس کا نام نہیں لے سکتا تھا بلکہ مقدس ہیکل کے اندر سال میں ایک مبارک دن اور پاک ساعت میں قوم یہود کا سب سے بڑا بزرگ اپنے منہ کو خوب پاک کر کے صرف ایک مرتبہ اس نام کو پڑھتا، اور تمام یہود

خاموشی سے صرف اسے سن لیتے۔ علماء یہود نے خروج ۲۰/۷ اور استثنا ۵/۱۱ کی غلط تعبیر کرتے ہوئے خدا کا نام لینا قابلِ مواخذہ قرار دیا، اور کتاب احبار ۲۴/۱۶ کی تفسیر میں اس جرم کی سزا موت مقرر کی۔ اس فتوے کی بنا پر جو شخص بیت المقدس کے باہر خدا کا نام لیتا تھا وہ گردن زدنی اور کشتنی سمجھا جاتا تھا، کیونکہ کتاب استثنا ۱۲/۱۱ اور سلاطین اول باب ۸، آیات ۱۶، ۲۹ اور ۴۴ وغیرہ کی بنا، پر خدا کا نام صرف مقدس کاہن سے مقامِ ہیکل میں اور مقدس دن لیا جانا چاہئے تھا۔ ہیکل کے باہر عام لوگ خدا کے مقدس نام کی بجائے "اُدونئی" (Adonai) کہا کرتے تھے۔ خالد بن تراون نامی ایک شخص کو اس بنا، پر سزا دی گئی کہ اس نے ہیکل سے باہر اپنے شاگردوں کو خدا کا نام سکھا دیا تھا۔ اس بے معنی راز داری کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اس کا صحیح تلفظ یہود سے جاتا رہا۔

تورات مقدس سے یہ بھی ثابت ہے کہ خدا کا نام "یہوہ" قدیم نام نہیں بلکہ اس میں لکھا ہے:۔ "ابراہیم، اسحاق اور یعقوب پر میں نے (یعنی خدا نے) شدائی کے نام سے اپنے تئیں ظاہر کیا، اور یہوہ کے نام سے ان پر ظاہر نہ ہوا۔" (خروج ۶: ۳)

خدا کا نام مسیح نے بھی نہیں بتایا

خداوندِ عالم کا وہ نام جو جناب مسیح سے ۵۰۰ برس پہلے گم ہو گیا تھا چاہئے تھا کہ جناب مسیح وہ نام اپنے شاگردوں کو بتا جاتے۔ مگر چاروں انجیلوں میں یہ نام یہوہ ایک مرتبہ بھی نہیں آیا۔ عیسائیوں کا ایک نو ایجاد فرقہ یہوہ وٹنس (Jehovah Witnesses) ہے جو اس صدی کی پیدائش ہے۔ اس نے اناجیل کا ایک اپنا ترجمہ شائع کیا ہے اور انجیل میں جہاں کہیں خدا کا لفظ آیا تھا اس کی جگہ یہوہ لکھ دیا ہے۔ اس کے تین مشتری

دو عورتیں اور ایک مرد، مسلمانوں میں تبلیغ کر رہے تھے تو ایک دوست نے مجھے ان سے بات چیت کرنے کی دعوت دی۔ میں نے ان کے نام پر ہی اعتراض کیا اور کہا کہ یہ نام چاروں اناجیل میں ایک مرتبہ بھی موجود نہیں۔ یہ سنتے ہی جوان مشنری عورت نے چار پانچ آیتیں انجیل کی پڑھ سنائیں جن میں یہوہ آتا ہے۔ میں نے اپنی جیب سے یونانی انجیل کا نسخہ نکال کر پیش کیا اور کہا مجھے اپنا بناوٹی ترجمہ نہ سنائیے، اس میں سے ایک دفعہ یہوہ نکال کر دکھائیے جس پر وہ تینوں لاجواب ہوگئے اور مرد مشنری نے اقرار کیا کہ یونانی انجیل میں یہ نام نہیں۔

ہندوؤں کے یہاں بھی خدا کا نام ایک راز ہے

ہندوؤں کے ہاں بھی خدا کا نام ایک خفیہ راز سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ چاروں ویدوں میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ خالقِ کائنات کا ذاتی نام کیا ہے، بلکہ اس کی بجائے رگوید کے منتر میں آتا ہے: "رگوید کے منتر ایک اکشر میں سماء اعلیٰ پر موجود ہیں، جس میں سب دیوتا مقیم ہیں، جو اس کو نہیں جانتا، وہ رگوید کے منتروں کو کیا کرے گا" (رگوید-۱: ۱۶۴: ۳۹)

اس حرف یا اکشر سے مراد بعض لغت نویسوں نے لفظ اوم لیا ہے اور بعض نے سورج۔ پرانے خیال کے ہندو علما، اوم کو سورج میں مقیم مانتے ہیں۔ اسی بنا پر سورج کی تصویر انسانی چہرہ کی بنا کر اس میں اوم لکھ دیا کرتے ہیں۔ یجروید کے آخری باب کے ایک منتر کا ترجمہ بھی یہی کیا گیا ہے۔

اوم کے رسم الخط اور تلفظ دونوں میں ہندوؤں کے اندر اختلاف موجود ہیں۔ بعض اسے اوم پڑھتے ہیں، بعض اونگ، اور کئی ایک آنگ۔ رسم الخط کے اعتبار سے اس میں صرف دو حروف او، م ہیں۔ مگر از روئے قواعد آ + اُ + م تین حروف سے مرکب ہے۔ پھر اس کے ہر ایک حرف سے الگ الگ تین دیوتا مراد

لئے گئے ہیں، مثلاً "آ" سے مراد وشنو ہے، "اُو" شیو، اور "م" سے مراد برہما ہے۔ یہ تین دیوتا ہندو قوم کی تریمورتی یا تثلیث کہلاتی ہے۔

سوامی دیانند جی کا لفظ اوم کے ساتھ کھیل

سوامی دیانند جی بانی آریہ سماج نے اس تثلیث کو اڑا کر یہ نئی بات بتائی ہے کہ اوم کے اجزاء آ + اُو + م میں خدا کے بہت سے نام آجاتے ہیں۔ درحقیقت یہ لفظ اوم کے ساتھ ایک کھیل ہے جسے انگریزی میں Play on words کہتے ہیں۔ قابل غور یہ امر ہے کہ اگر آ + اُو + م سے مراد بہت سے خدا کے نام لئے جاسکتے ہیں تو یہ لفظ اوم کی خوبی نہ ہوگی بلکہ ان حروف کی خوبی ہوگی جن سے یہ مرکب ہے۔ اس صورت میں اگر اوم کو الٹا کر کے موا پڑھا جائے تو وہی تینوں حروف یہاں بھی موجود ہیں۔ پس اس کے اندر بھی پنڈت جی کے بیان کردہ سب خدا کے نام آجائیں گے اور اگر اسے "ماو" اور "وام" پڑھا جائے تو ہر ایک صورت میں حروف وہی رہنے کی وجہ سے مطلب میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ سوامی جی نے کہیں سے سن پایا کہ مسلمانوں میں خدا کا اسم ذات اللہ ہے جو تمام صفات کاملہ کا موصوف ہے۔ لفظ اوم صرف ایک صفاتی نام ہے اور وہ بھی خدا کا نہیں بلکہ کئی ایک معمولی مطالب "ہاں، آمین، اچھا، قبول، بہت خوب، منظور" کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ دیکھو واچسپتیہ کی مستند سنسکرت لغت جہاں اس کے یہ چھ معانی لکھے ہیں۔ سوامی جی نے بلا غور و فکر اللہ کے بالمقابل اوم کو کھڑا کرنے کی یوں کوشش کی کہ اس کی تین حرفی تثلیث کو بہت سے معانی کا حامل قرار دیا، مگر اتنا نہ سوچ سکے کہ حروف کی یہ شطرنج الٹ بھی سکتی ہے، تو اس صورت میں "ماو، وام، موا، وما" وغیرہ

کے بھی وہی معنے ہوں گے جو ادم کے ہیں۔ قواعدِ زبان کی بنا، پر ادوم کے معنی صرف حفاظت کرنے والا ہے۔

خدا کا اسم اعظم محمد صلعم کو بتانا تھا

یہود و نصاریٰ کی بائیبل کی شہادت

وہ لوگ جنھیں مذاہب عالم کی کتب اور ان کی تفاسیر دیکھنے کا موقعہ ملا ہے انہیں معلوم ہوگا کہ خداوندِ عالم کے صدہا ناموں میں سے ایک اس کا اسم اعظم ہے، جس کی تلاش میں ہر زمانہ کے یہود و ہنود، مجوس و نصاریٰ سرگرداں رہے ہیں۔ یوں تو دنیا کی کوئی زبان نہیں جس میں خدا کا نام نہیں۔ مجھے دنیا کی زبانوں میں خدا کے ۱۵۵ نام اور ان کے معانی پر فکر کرنے کا موقعہ ملا ہے، اور میں نے اپنی انگریزی کتاب "محمدان ورلڈ سکرپچرز" میں ایک سو صفحہ سے زیادہ اس کے متعلق لکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ جب بھی کسی نبی کو مبعوث کرتا رہا۔ اپنی ذات و صفات کی معرفت بھی اسے عطا کرتا رہا۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ قوموں اور انبیاء کی زبانیں الگ الگ تھیں۔ جو نام انہیں بتایا گیا ان کی زبان میں بتایا گیا۔ اس لئے خدا گو ایک ہے مگر نام ایک نہیں۔ تاہم یہ خیال بھی موجود ہے کہ ذاتِ خداوندی کا ایک سب سے اعلیٰ نام یا اسم اعظم بھی ہے۔

خدا کے نام پر اوپر کی بحث اس مسئلہ کا منفی پہلو تھا، یعنی خدا کا ذاتی نام نہ بائیبل کے پرانے عہد نامہ میں ہے، نہ نئے عہد نامہ میں، اور مزعومہ نام زبان پر لانے کی سزا قتل ہے۔ اب آجائیے اس مسئلہ کے اثباتی پہلو کی طرف۔ بائیبل کے مندرجہ ذیل حوالجات غور سے پڑھئے۔ حضرت داؤد اپنے زبور میں فرماتے ہیں:۔

۱۔ "خداوند ہمارے ربّ، کیا ہی بزرگ ہے تیرا نام، ساری زمین میں"
(زبور ۸: ۱، ۹)

۲۔ " وے جو تیرا نام جانتے ہیں تیرا بھروسہ رکھیں گے۔" (۹ : ۱۰)

۳۔ "میں اسے اُونچے پر بٹھاؤں گا کہ اس نے میرا نام جانا۔" (۹۱ : ۱۴)

۴۔ " مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے۔" (زبور ۱۱۸ : ۲۶، متی ۲۱ : ۹، ۲۳ : ۳۹، مرقس ۱۱ : ۹، لوقا ۱۹ : ۳۸)

۵۔ " نوجوان اور کنواریاں، بوڑھے بچوں سمیت خداوند کے نام کی حمد کریں، اس کا نام اکیلا عالیشان ہے۔" (زبور ۱۴۸ : ۱۲، ۱۳)

حضرت یسعیاہ، ضفنیا، زکریا اور میکا نبی فرماتے ہیں :۔

۶۔ "اس دن تم کہو گے کہ خداوند کی حمد کرو۔ اس کا نام لو۔" (یسعیا ۱۲ : ۳)

۷۔ " میرا ارادہ ہے کہ قوموں کو جمع کروں . . کیونکہ میں پھر اس وقت لوگوں کو پاک ہونٹ کر دوں گا تاکہ سب کے سب خدا کا نام لیویں اور ایک دل ہو کر اس کی بندگی کریں۔" (ضفنیا، ۳ : ۸، ۹)

۸۔ " وے خدا کے نام پر بھروسہ رکھیں گے۔" (ضفنیا، ۳ : ۱۲)

۹۔ " وے میرا نام لیں گے اور میں ان کی سنوں گا۔ میں کہوں گا یہ میرے لوگ ہیں اور وے بولیں گے کہ خداوند میرا خدا ہے۔" (زکریا ۱۳ : ۹)

۱۰۔ " اس دن ایک خداوند ہوگا، اور اس کا نام ایک ہوگا۔" (زکریا ۱۴ : ۹)

۱۱۔ " ہم لوگ خداوند کا نام لے کر ہمیشہ کے لئے اور ابد تک جئیں گے۔" (میکا ۴ : ۵)

۱۲۔ " وے اس کا نام لے کے اِدھر اُدھر چلیں گے۔" (زکریا، ۱۰ : ۱۲)

حوالجات کا تجزیہ

ان حوالجات سے ظاہر ہے کہ یہ آئندہ کے متعلق پیشین گوئیاں ہیں۔ ویسے بھی یہود و نصاریٰ

میں خدا کا نام لینا گناہِ کبیرہ ہے اور سزا قتل اور ہمیشگی کا جہنم ہے۔ حوالجات کا ماحصل یہ ہے :۔ خدا کا بزرگ نام (اسم اعظم) ساری زمین پر ایک ہے۔ اس کا نام جاننے والے (مسلمان) صرف ایک خدا کے نام پر توکل رکھیں۔ خدا کا نام جاننے اور بتانے والے کو اللہ تعالیٰ اُونچے پر بٹھائے گا یعنی وہ افضل الانبیاء ہوگا۔ جو آئے گا اور خدا کا نام لائے گا وہ مبارک انسان ہوگا۔ اس وقت خدا کا یہ نام بچے۔ بوڑھے جوان اور کنواریاں سب کو لینے کی تاکید ہوگی۔ اس دن تم کہو گے (بخلاف مسلک یہود و نصاریٰ) خدا کی حمد کرو اور اس کا نام لو (یعنی الحمد للہ رب العالمین پڑھو)۔ دنیا کی ساری قومیں ایک نام اللہ پر جمع کرنے کا خدا کا ارادہ ہے، اور لوگوں کو پاک ہونٹ کرنے کا یعنی شرک سے لاالٰہ الا اللہ پڑھوا کر پاک کیا جائے گا۔ اس ایک نام اللہ پر ایمان لاکر اس کی بندگی کریں۔ اس ایک نام اللہ پر نجات کا بھروسہ رکھیں گے۔ وے لوگ میرا نام لیں گے اور میں ان کی دعا قبول کروں گا۔ میں کہوں گا یہ میرے بندے (یا عبادی) وے بولیں گے کہ خداوند میرا خدا (ربنا اللہ)۔ اس دن (اسلام کے زمانہ میں) ایک خدا ہوگا، اور اس کا ایک نام اللہ ہوگا۔ اپنے ہر کام میں وہ اللہ کا نام لیں گے۔ کتنی عظیم الشان پیشین گوئیاں ہیں جو محمد رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں پوری ہوئیں۔

قرآن مجید کا بسم اللہ سے شروع ہونا معجزہ ہے

محمد رسول اللہ صلعم پر سب سے پہلی وحی بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ "اپنے رب کے نام سے پڑھ" کی تعمیل اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ اور اس میں حضرت داؤد کی پیشین گوئی کی تصدیق ہے۔ زبور کی اس آیت کا عربی ترجمہ جو بائیبل سوسائٹی نے شائع کیا ہے اس میں تقدیر عبارت یوں ہے :

مُبَارَکٌ الْآتِیْ بِاسْمِ الرَّبِّ ۔ (مبارک ہے وہ جو خداوند کے نام سے آتا ہے) گویا قرآن مجید کی سب سے پہلی وحی کے عین مطابق ہے۔ پھر انجیل میں اسی زبور کی تصدیق ہے (دیکھو حوالہ نمبر ۴ مندرجہ بالا)۔ جناب مسیح کے متعلق یہ پیشین گوئی اس لئے نہیں کی کہ جناب مسیح کی زبان سے یہوہ نام ایک مرتبہ بھی نہیں نکلا، اور سب سے بڑھ کر نبی ؐ اُمّی کا یہ معجزہ عظیم اس لئے ہے کہ صنفیا نبی نے پیشین گوئی کی تھی:۔

"میرا ارادہ ہے کہ میں خدا کے نام پر تمام قوموں کو جمع کروں"۔ مسیحی لوگ خدا تعالیٰ کے نام پر لوگوں کو جمع نہیں کرتے بلکہ مسیح کے نام پر تبلیغ کرتے ہیں۔ اقوامِ عالم کو ایک خدا کے نام پر جمع کرنے میں نکتہ یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی زبانوں میں خدا کے ۱۵۰ نام ہیں اور یہ تمام صفاتی نام ہیں جو کسی موصوف کو چاہتے ہیں، اور وہ موصوف اللہ ہے۔ محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ عظمیٰ یہ ہے کہ دنیا کی کل نسلِ انسانی کی زبانوں میں خدا کے ناموں کو اللہ کے رشتے میں پرو کر کل اقوامِ عالَم کو جمع کر دیا ہے۔

باب دوم

اَلحمدُ لِلّٰہ کی تشریح

حُسنِ کلام ہمیشہ تین مختلف زاویوں سے پرکھا جاتا ہے۔

الف:۔ کلام موزوں ہو اور جملوں کی ترتیب دلآویز ہو۔

ب:۔ فلسفیانہ نگاہ اور علم کے اعتبار سے۔

ج:۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے۔

ایک کلام بندشِ الفاظ اور جملوں کی ترتیب کے لحاظ سے اعلیٰ کلام کہلاتا ہے مگر فلسفہ اور عقل کی میزان میں پورا نہیں اُترتا۔ ایک اور کلام علم و عقل کے کانٹے پر درست معلوم ہوتا ہے مگر الفاظ ناموزوں، جملے پراگندہ اور عبارت بے ربط ہوتی ہے اگر حسنِ اتفاق سے کسی کلام میں یہ دونوں خوبیاں سمو دی گئی ہوں بندشِ الفاظ درست ہو اور علم و عقل کی میزان میں بھی پورا اترتا ہو مگر اس کا اثر انسان کے اخلاق پر اچھا نہ ہو تو اخلاقی اعتبار سے وہ کلام پست اور غیر مہذب کہلاتا ہے۔ قرآن مجید کا اعجاز حسنِ کلام ہے اس کی ہر آیت میں یہ تینوں خوبیاں موجود ہیں اس کا کلام نہایت موزوں اس کا بیان پُراز صداقت اور اس کا اخلاقی معیار نہایت اعلیٰ ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ فاتحہ پر غور کر کے دیکھا جائے تو یہ تینوں اصنافِ سخن اس میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

فاتحہ کے معنی:۔ فاتحہ کے معنی ہیں "کھولنے والی" یہ سورۃ انسان

کے دل میں ذوق سخن کے تین دروزاے کھولتی ہے یا حسنِ عبارت صداقت اور خلقِ عظیم کا ایک جامع نمونہ پیش کرتی ہے اس لئے اس کا نام فاتحہ ہے انسان کے لئے زمینی اور آسمانی برکات کا خزانہ ہونے کی وجہ سے اس کا دوسرا نام حدیث میں الکنز (خزانہ) بتایا گیا ہے یا یوں سمجھئے کہ یہ نہ صرف قرآن مجید کا خلاصہ ہے بلکہ انبیاء عالم کی تعلیمات کا ماحصل اور معرفت کا بیش بہا خزانہ ہے اس لئے اسے الکنز نام دیا گیا ہے۔ قرآن مجید جس کے مضامین کا خلاصہ نکالنا نہایت مشکل ہے کیونکہ اس کے حقائق بے شمار اور اس کے عجائبات قیامت تک ختم ہونے والے نہیں اور کتب انبیاء جن کے اندر بے حد تحریف اور تغیر و تبدل ہو چکا ہے اور ان کا بیشتر حصہ دنیا سے گم ہو چکا ہے ان کی تعلیمات میں سے حق تلاش کرنا گویا معدوم کو از سرِ نو وجود میں لانا ہے جو کسی انسان کی قدرت میں نہیں۔ وہ صرف عالم الغیب ہستی کا ہی کام ہو سکتا ہے کہ وہ صرف سات آیات کے اندر ان ساری خوبیوں کو جمع کر دے جو انبیاء عالم کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں کیونکہ انسان کا علم محدود اس کی عقل ناقص اور اس کی نظر کمزور ہے۔

سورۃ کا نام سبع مثانی کیوں؟

سورۃ فاتحہ کے وہ سب نام اور صفات جو احادیث میں مذکور ہیں ان میں سب سے اچھا نام وہی ہے جو قرآن مجید نے خود اس سورت کو دیا ہے فرمایا

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (۱۵ : ۸۷)

ہم تجھے سبع مثانی دے چکے ہیں اور وہ قرآن عظیم ہے۔ سورۃ فاتحہ کا نام سبع مثانی ہے سبع کے معنی ہیں "سات" مگر مثانی کے چار معانی قابلِ غور ہیں:۔

الف:۔ ایک ایسی وادی اور باغ جس کی روشیں یا راستے ایک دوسرے

کی طرف لوٹتے ہوں۔ یا بعض کو بعض پر لوٹانا (اَلْمَثَانِیْ مِنَ الْوَادِیْ مُعَاطِفُہٗ)

ب:۔ کسی شئے کی مثانی سے مراد اس شئے کی طاقتیں اور قوتیں ہیں (مَثَانِیُ الشَّیْءِ قُوَاہُ وَطَاقَاتُہٗ)

ج:۔ اس کے معنی تعریف اور خوبی ہیں سورۃ فاتحہ اس لئے مثانی ہے لِاَنَّھَا یُثْنٰی بِھَا عَلَی اللّٰہِ) اس کی آیات سے اللہ تعالیٰ کی ثنا اور تعریف کی گئی ہے۔

د:۔ نیکی کا بار بار دوہرایا جانا کثرت سے دوہرایا جانا (اَلْمَعْرُوْفُ مَرَّتَیْنِ فَاَکْثِرْ)۔

مثانی کے ان چار معانی کے لحاظ سے اس سورۃ میں ایک خوبی تو یہ ہے کہ اس کا ہر جملہ اپنی مزید تکمیل اور خوبصورتی کے لئے دوسرے یا اگلے جملہ کی طرف لوٹتا ہے اور ایک عجیب دلکشی پیدا کرتا ہے گویا وہ ایک پھلواڑی ہے جس کی سات روشیں ہیں مگر اس کی ہر روش اگلی روش سے جا ملتی ہے اور سب باہم ملی ہوئی اور مرتب ہیں اور یہ اس کا حُسن ہے۔

۲۔ اس سورۃ میں سات قوتیں اور طاقتیں (Energies) ہیں جو انسان کو اس قدر قوی اور تنومند بناتی ہیں کہ وہ ترقی کر کے سات منازلِ روحانی طے کر سکتا ہے۔

۳۔ اس میں سات قابلِ قدر خوبیوں کا ذکر ہے جن کے اپنانے سے انسان خلقِ عظیم کا مالک ہو سکتا ہے اور دنیا کے دوسرے لوگوں پر فتح اور غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

۴۔ اس سورت میں سات ایسی صداقتیں ہیں جو اٹل اور غیر متغیر ہیں اس لئے یہ ہمیشہ ہمیشہ دوہرائی جاتی رہیں گی اس کے تر و تازہ اور نئے نئے عجائبات

ہر دورِ زمانہ اور ہر شعبۂ علم میں ظاہر ہوں گے اور دنیا کا کوئی آنے والا علم۔ فلسفہ اور مذہب اس پر غالب نہ ہو سکے گا۔

سورۃ فاتحہ میں اعجاز معنوی

سورۃ فاتحہ میں مذکورہ بالا خوبیوں کے علاوہ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ نام رکھنے میں ایک اور نکتہ یہ ہے کہ مثانی کے چاروں معانی آپس میں ایک دوسرے کی تکمیل بھی کرتے ہیں مثلاً باغ میں پھولوں کی روشیں ہونا ضروری ہیں اور ہر روش کا خوبصورت اور قابلِ تعریف ہونا اس کی مزید تکمیل ہے اس سے جہاں نظر کو فرحت اور دل کو سرور ملتا ہے وہاں اس کے بنانے والے کی تعریف اور حمد بھی ہوتی ہے۔

۲۔ اس کے بعد یہ امر بھی مسلم ہے کہ ہر قسم کی خوبصورتی بذاتِ خود ایک طاقت اور قوت ہے مگر طاقت اور قوت دُہرانے سے تکمیل پاتی ہے اور اسی بات کو ہمیشہ دوہرایا جاتا ہے جس کے فوائد دائمی اور زندگی میں ان کی بار بار ضرورت ہو۔

پائیدار فلسفہ، مذاہب

اس سورت کے فوائد ہمیشہ ہمیشہ قائم رہینگے اور دہرائے جائیں گے اور اس کے عجائبات ہر دورِ زمانہ میں ظاہر ہوں گے۔ یہ ایک دعویٰ ہے اور بہت بڑا دعویٰ ہے مگر ہر دعویٰ محتاجِ ثبوت ہوتا ہے اس لئے اس امر پر غور کیجئے کہ اس سورت کو نازل ہوئے ۱۳۵۰ برس[ے] سے زیادہ عرصہ ہو گیا اور دنیا اس طویل زمانہ میں صدہا تغیراتِ ذہنی اور علمی دیکھ چکی تاہم قرآن مجید جیسا آج سے ۱۳۵۰ برس پہلے لوگوں کے لئے ہدایت اور نور تھا وہ آج بھی دنیا کی نئی نئی مشکلات اور پیچیدگیوں میں روشنی اور تسلی کا موجب ہے۔ بظاہر یہ امر محال نظر آتا ہے کہ جب دنیا اپنے ذہنی اور علمی ارتقاء کے لحاظ سے ڈیڑھ ہزار برس آگے بڑھ گئی اس کے لئے قانون وہی پرانا کافی سمجھا جائے کیونکہ ایک طرف اگر ملکی قانون نے اس عرصہ میں بے شمار تبدیلیاں پیدا کرلی ہیں

ے یہ مقالہ ساٹھ برس قبل لکھا گیا تھا۔ مرتب

تو اکثر مذاہب نے بھی اپنی شرائع اور کتب کے اندر صد ہا ردّ و بدل کر لئے ہیں یہاں تک کہ علم اور فلسفہ کی زمین بھی تغیرات سے نہیں بچ سکی بلکہ فلسفہ اور سائنس جتنی جلد اپنے مسلّمات اور معتقدات کو بدلتا رہا ہے غالباً دنیا کا کوئی اور شعبہ علم اس قدر جلد اپنے اصول نہیں بدلتا مثلاً

ہیگل کا فلسفہ (Hegel)

ہیگل کا فلسفۂ اضداد (Dialectics) ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا اضداد باہمی کی پیکار کا نام ہے ہر انسانی تصوّر سے اس کی ضد پیدا ہوتی ہے نئے اور پرانے تصوّر کے وصال سے ایک نیا تصوّر وجود پذیر ہوتا ہے کیونکہ ہر تصور فی حد ذاتہ ناقص ہوتا ہے اس لئے وہ مٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا ناقص تصور لے لیتا ہے مگر دوسرا تصور اپنے سابق تصوّر کی کلیتہً نفی نہیں کرتا بلکہ اس کے کھوٹ کو دُور کرتا اور جوہر کو باقی رکھ لیتا ہے۔ ہر تصوّر جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی جامع اور مکمل ہوتا جائے گا یہاں تک کہ اس میں مزید وسعت اور اصلاح کی گنجائش نہ رہے گی اور وہ مکمل اور ہمہ گیر ہو جائے گا پس اس اعتبار سے دنیا کا ہر دور پہلے دور سے وسیع تر اور جامع ہوتا ہے اور اس میں گذشتہ ادوار کی اعلیٰ خصوصیات اور ان کے صالح اجزاء یا جوہر موجود رہتا ہے جیسے بیج مٹ گیا مگر اپنا جوہر درخت میں وسیع تر کر گیا۔

مارکس (Marx) نے جو ہیگل کا شاگرد ہے اس اصول کو بنیادی طور پر تسلیم تو کر لیا مگر اس میں اصلاح یہ کی کہ اثر انداز صرف تصوّرات نہیں ہوتے بلکہ ان تصوّرات کے ماتحت جو مذہب یا تمدن پیدا ہوتا ہے وہ بھی قلوب انسانی پر اثر انداز ہوتا ہے اور انسانی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے پھر کچھ عرصہ بعد اس مذہب یا تمدن کے اندر سے اس کی تخریبی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

ہیگل اور مارکس دونوں اس اصول کو قانونِ قدرت قرار دیتے ہیں جو لابدّ

اور اٹل ہے مگر یہ ردّو بدل زیادہ تر ان خیالات اور مذاہب کے اندر ہوتا ہے جو محض انسانی دماغ کا نتیجہ ہوتے ہیں . . . . . سیاسی مذاہب بالعموم نصف صدی کے اندر اپنے اصول اور معتقدات بدل لیتے ہیں مگر الہامی مذہب کے بنیادی اصولوں کا ہزارہا برس تک قائم رہنا اور کثرت سے دوہرایا جانا ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ذہنی تصوّرات میں اگر ردّو بدل ناگزیر ہے تو علیم کل ہستی کے علم میں تغیّر اور تبدل ناممکن ہے سورۃ فاتحہ کا نام قرآن مجید نے اسی لئے سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِی رکھا ہے کہ یہ ایسی سات صداقتیں ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ دہرائی جائیں گی یہ کبھی پرانی اور فرسودہ ہو کر مٹ نہ جائیں گی بلکہ اس کے عجائبات ہر دور زمانہ میں ظاہر ہونگے۔

امن والے شہر کے سات دروازے

سورۃ فاتحہ کی سات صداقتیں ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں امن وصلح قائم رکھنے کے لئے اور با اخلاق قوم بننے کے لئے ضروری قرار دی جائیں گی اس بہت بڑے دعوے کا ثبوت صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم زمانہ حاضرہ کے اہم مسائل کا حل اس سورۃ میں قرآن مجید کی اپنی روشنی اور تفسیر کے ساتھ دکھا دیں۔ علماء اخلاق کے نزدیک قوموں کے عروج تہذیب وتمدن کی بنیاد صرف سات اخلاقی خوبیوں پر ہے جن کو اعلےٰ نیکیاں (Seven Cardinal Virtues) کہا جاتا ہے۔ علماء اخلاق اس نتیجہ پر بڑی کدوکاوش اور چھان بین کے بعد پہنچے ہیں مگر مکّہ کا نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلّم آج سے ۱۳۵۰ برس پیشتر اس حقیقت کا اعلان سورۃ فاتحہ کے اندر کر گیا اور اپنی امت کو یہ سورۃ سکھا کر بلکہ شبانہ روز پنجوقتہ نمازوں میں دہرانے کا حکم دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی امن والا شہر ہو سکتا ہے تو اس کے اندر داخلیکے بعد دیگرے انہی سات دروازوں سے ہو سکتا ہے امّتِ مسلمہ کا نصب العین انہی سات منازل کو طے کرنا اور بلد امین میں داخل

ہونا اور دنیا کی دوسری بھولی بھٹکی اور سیدھی راہ سے گم شدہ قوموں کے لئے قائد رہنما اور ائیڈیل قوم بننا ہے جس طرح اس زمین پر سات آسمان ہیں اسی طرح انسانی روح کے لئے سات اخلاقی اور روحانی منازل اور بلندیاں ہیں یہ حقیقت ہے اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ کی، کہ مومن کی نماز ان کا معراج یا وہ بلند سے بلند مقام ہے کہ جہاں انسان پہنچ سکتا ہے۔

سات اعلیٰ درجہ کی نیکیاں

علماء اخلاق جن کو سات اعلیٰ نیکیاں قرار دیتے ہیں وہ (Seven Cardinal Virtues) کہلاتی ہیں۔ باقی تمام نیکیاں اور اخلاقی خوبیاں انہی کی فروعات اور شاخیں ہیں اور وہ سات نیکیاں یا اعلیٰ اخلاق سبع مثانی بتفصیل ذیل ہیں:۔

۱۔ خدائے واحد کی ہستی پر مضبوط اور اٹل ایمان۔ (Faith in God)

۲۔ اُمید یا اپنے آپ پر ایمان۔ (Hope or Faith in self)

۳۔ انسانی فلاح و بہبود پر اپنی کوشش اور مال کو خرچ کرنا۔ (Charity)

۴۔ دوسروں کے حقوق کما حقہٗ ادا کرنا۔ (Prudence in Human Rights)

۵۔ عدل و انصاف۔ (Justice)

۶۔ نیکی کرنے میں کبھی نہ تھکنا۔ (Fortitude)

۷۔ جذبات پر حکومت اور ان میں اعتدال پیدا کرنا۔ (Temperance)

علماء اخلاق اور الہامی مذاہب سب ہی دنیا میں امن و صلح کے لئے قوموں میں اور لوگوں میں ان خوبیوں کا پایا جانا ضروری قرار دیتے ہیں مگر ان کی تفصیلات اور طریق عمل میں کچھ بنیادی غلط تصورات ہیں جن کی اصلاح اور تکمیل صرف قرآن مجید میں موجود ہے۔

الحمد یا ایمان باللہ کی خوبی:۔ (Faith in God)

اَل :۔ سب ۔ تمام
حَمْد :۔ خوبی ۔ تعریف اور شکر
لِ :۔ لئے یا واسطے یا ملکیت
اللہ :۔ اسمِ ذات خداوندِ عالم ۔ مستجمع جمیع صفاتِ کاملہ
ترجمہ :۔ تمام خوبیاں ۔ تعریف اور شکر اللہ ہی کے لئے ہے ۔

یہ پہلی بات ہے جس کا ایک مسلمان اپنی دعا میں اقرار کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان تمام الہامی مذاہب کا پہلا اصول ہے مگر خدا پر ایمان کہ وہ کوئی ہستی ہے یا موجود ہے یا ہمارا کوئی خالق اور مالک ہے ایمان باللہ کے لئے اس صورت میں کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اس میں اس ہستی پر ایمان کی شرط یہ ہے کہ اس کی ذات تمام صفاتِ کاملہ اور سب خوبیوں کی مالک ہے در حقیقت ایسی ہستی پر ایمان جس میں کوئی کمی اور نقص نہیں بلکہ وہ تمام صفاتِ کاملہ سے متصف ہے یہی ایمان مفید اور کامل ایمان کہلا سکتا ہے ۔ یعنی سب سے پہلے یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ ہستی ایک ہی ہے اور وہی ایک تمام صفاتِ کاملہ رکھتی ہے کہ جن کی ایک انسان اور کل مخلوق کی تکمیل کے لئے ضرورت ہے اور وہ اپنی صفات پر قدرت رکھتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں جہاں کہیں خدا کی حمد کا ذکر ہے بالعموم اسے یوں ادا کیا ہے :

سب حمد اُس کے لئے ہے ۔ جو تمام جہانوں اور انواعِ مخلوقات کا پروردگار کرنے والا ہے ۔ حمد اُس کی جو زمین و آسمان ، تاریکی اور روشنی سب کا خالق ہے ۔ حمد اُس کی جس نے رات آرام کے لئے اور دن کام کے لئے بنایا ۔ حمد اس کی ہے جس نے تمہاری بہترسے بہتر صورت بنائی ۔ تمہارے کھانے کے لئے طیّب اور پاکیزہ رزق دیا پھر وہ زندہ ہے اپنی ساری صفات کے ساتھ یہ اس کی کتنی بڑی خوبی اور تعریف ہے کہ اس نے آسمان و زمین کو جامد نہیں بنایا بلکہ ترقی اور ارتقاء کی منازل پر دوڑنے

والا بنایا جس سے اس کی کبریائی اور قدرت ظاہر ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ اس کی حمد جو بادلوں سے پانی اتارتا ہے اور زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ تعریف اس کی جس نے آسمان بنائے اور زمین بنائی صبح و شام اور دن کے مختلف حصوں میں کتر بیونت کی دن اور رات کی۔ سورج اور چاند کے ذریعہ تمہارے فائدے کے لئے سال و ماہ میں تقسیم اوقات کر دی۔ حمد کے لائق وہی ہے دنیا پر حکومت اسی کی ہے آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اسی کے قبضۂ اختیار میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اسی نے تمہیں بنایا وغیرہ وغیرہ۔

غور سے دیکھا جائے تو ان تمام آیات میں جن میں حمد الٰہی کا ذکر ہے تین طرح پر خدا کی ہستی پر دلائل کا سلسلہ قائم کیا ہے کائنات کی خوبصورتی۔ تخلیق اشیاء میں حکمت و صداقت کا پایا جانا اور تیسرے حسنِ سیرت یعنی اخلاق حسنہ اور نیکی کا دنیا میں موجود ہونا گویا کائناتِ عالم میں حسن، صداقت اور نیکی کا پایا جانا خدا کی ہستی پر دلالت کرتا ہے اس دعویٰ کے دلائل کائناتِ عالم میں سب جگہ موجود ہیں جنہیں معلوم کر کے انسان کا یہ ایمان صرف زبانی اور قولی نہیں رہتا بلکہ دل کی گہرائیوں میں اُتر کر مضبوط ہو جاتا ہے اور الحمد للہ کا جملہ نہ صرف اس کی زبان سے بلکہ اس کی جان اور قلب رُوح سے بڑے جوش کے ساتھ نکلتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر حسنِ کائنات کی شہادت

مناظرِ قدرت سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر استدلال قرآن مجید کے وسیع مضامین میں سے ہے اس کی دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی (۶ : ۹۵) اللہ تعالیٰ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑ کر درخت بناتا ہے بیج اور گٹھلی کے درخت بننے تک بیسیوں دلائل اللہ تعالیٰ کی ہستی کے اس میں موجود ہیں اتنے چھوٹے اور باریک بیج میں جو بعض اوقات ایک انچ کے چار ہزارویں

حصہ کے برابر ہوتا ہے اس میں بطور خلاصہ کتنا بڑا درخت موجود ہوتا ہے برگد کے درخت کا بیج کتنا چھوٹا ہوتا ہے مگر اس سے اس قدر عظیم الشان درخت پیدا ہوتا ہے جس کے سایہ تلے ہزار ہا آدمی آرام پاتے ہیں پھر فرماتا ہے درختوں کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا ہے

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ

(۵۰ : ۷، ۸) "اور اس زمین میں ہم نے ہر درخت کے خوشنما جوڑے بنائے ہیں اس میں بصیرت اور نصیحت ہے ہر ایک بار بار رجوع کرنے والے بندہ کے لئے"

بیج پھوٹنا، پودا اور درخت کی شکل اختیار کرنا، ان کا زوج زوج ہونا محض بقاء نوع کی غرض سے ہے مگر بیج صرف بقاء نوع کی کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی منزل مقصود کی طرف جاتے ہوئے اپنے لہلہاتے جوبن کی بہار دکھاتا اور پھولوں میں کھیلتا بھی جاتا ہے۔ سبز کھیتوں کا لہرانا کتنا دلآویز اور دیدہ افروز ہے۔ درخت محض لکڑی اور کوئلہ بننے کو جلدی نہیں کرتے بلکہ ہرے بھرے منظر سے اپنے حسن کی بوچھاڑ بھی کرتے ہیں۔ قرآن مجید بار بار فرماتا ہے۔ اٹھتے ہوئے بادلوں کو دیکھو، پہاڑوں کو دیکھو، سمندروں کی دلچسپیوں پر غور کرو بادل سمندر سے اُٹھ کر کتنا جانفزا منظر دکھاتے ہیں کہ مُردوں میں جان ڈال دیتے ہیں۔ بادل کا کام صرف پانی برسانا ہے مگر وہ اس کے ساتھ ہی اپنے گوناگوں دلکش رنگوں سے لوگوں کی آنکھ اور دل کو اپنے حسن کی نمائش بھی دکھلاتا ہے (ورنہ پانی تو شاید زمین کے نیچے نیچے بھی پہنچایا جاسکتا تھا) سمندر صرف دلکش بادل ہی نہیں اٹھاتا اپنی اتھاہ گہرائیوں سے نہایت خوبصورت موتی اور مرجان اُگلتا اور اپنی نیلگوں موجوں میں صدہا دلآویزیاں بھی رکھتا ہے۔ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ۔ (۵۵ : ۲۲)

آفتاب اور ماہتاب اپنی آنکھ مچولی کے کھیل سے دن اور رات اور مہ و سال ہی نہیں بناتے صبح و شام کے رنگین سہانے منظر پُرکیف دن اور شبِ مہتاب کی

بہار بھی دکھاتے ہیں۔ آسمان صرف رنگینیوں کا گلدستہ ہی نہیں اپنے ستاروں سے نور بھی برساتا ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے آسمان کو دیکھو وہ تاروں بھری رات کی قسم کھا کر تمہیں کیا بتاتا ہے ان تمام حسین و جمیل قدرتی نظاروں سے جنہیں دیکھتے دیکھتے تم اپنے آپ کو گھنٹوں کھو دیتے ہو ظاہر ہے کہ انسانی آنکھ اسے دیکھے یا نہ دیکھے کوئی ہستی اِن دلکش مناظر میں اپنا صبیح اور ملیح حُسن دکھا رہی ہے اور ہر کیفِ نظارہ میں قدرت اصل مقصد کو زیرِ دامن رکھ کر اپنے بے بہا حُسن کو نثار رہی ہے۔ عروسِ فطرت کا یہ صبیح اور مسکراتا ہوا چہرہ ہر دیکھنے والے کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کہ اس پردہ میں کوئی آفتابِ حُسن جلوہ افروز ہے ورنہ مُردہ بے حس اور بے رونق مادہ میں دل لُبھانے کی یہ ادائیں کہاں سے پیدا ہو گئیں یہ بھی سوچو کہ بیشتر اشیاء میں یہ حُسن نیمے عیاں نیمے نہاں یا زیادہ واضح الفاظ میں نیم برہنہ ہے۔ کیا ہم اس حُسنِ ناتمام کا راز پا سکتے ہیں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کامل خوبصورتی کائنات کی کسی چیز میں عیاں نہیں بلکہ خوابیدہ حسن ہے اور اشارات ہیں۔ اس کے متعلق قرآن مجید فرماتا ہے الحمدُ للہ وہ کامل خوبصورتی اس اللہ میں ہے۔ جس نے اپنے کمال حُسن پر یہ حسین مناظر بطور گواہ پیش کئے ہیں۔ نیچر چونکہ اس ہمہ تن حسن کا شاہکار ہے جس میں اس کا حسن منعکس ہے۔ کائنات کا یہ بے پایاں حُسن اور قلب کی اس کے ساتھ گرویدگی لذت اور اس کی معرفت میں ترقی فاطرِ فطرت کے موجود ہونے اور اس کے بے مثال حُسن کی بہت بڑی دلیل ہے۔

ہستی باری پر علمی (سائنٹیفک) دلائل

کائنات کے ساتھ ہمارا تعلق تین طرح پر ہے۔ جذبات کا تعلق۔ عقل کا تعلق اور مسرتِ حقیقی کا تعلق۔ جذبات دنیا میں ظاہری حُسن کی تلاش کرتے ہیں وہ شے جو آنکھوں کو مرغوب کانوں کو مطلوب، زبان کو خوش

اور مس کرنے سے لطیف محسوس ہوتی ہیں جذبات ان سے ملتے ہیں مگر کائنات عالم میں جہاں حسن کی کثرت ہے وہاں صداقتِ باطنی اور عقلی خوبصورتی کی بھی کمی نہیں۔ صحیفہ فطرت کا حسین چہرہ اکثر لوگوں کے سحر انگیز بلکہ جنون خیز ہے یہ دنیا کا (Aesthetic View) یا خوبصورتی کا منظر ہے۔ وہ لوگ جو رنگین نظاروں سے بیزار ہیں اور آرائشِ جمال کو اپنی جنت کا دشمن سمجھ کر اس سے لرزاں اور ترساں ہیں اور شاہدِ فطرت کے ساتھ صرف عقل کا تعلق رکھنا چاہتے ہیں ان کی نظرِ انتخاب کے لئے اس میں وہ خط و خال بھی موجود ہیں جنھیں دیکھ کر عقل و دانش بھی اپنے ہوش کھو دیتی ہے دنیا میں ایک طرف اگر جنتِ نگاہ وسیع اور لامحدود ہے اور فردوسِ گوش عریض ہے تو کائنات کی پہنائیوں میں فلسفہ حقہ اور سائنس کے لئے بھی لذت و سرور موجود ہے اور اس جنت عدن میں عقل جہاں چاہتی ہے اپنا زوج پالیتی اور لذت اندوز ہوتی ہے۔

کششِ ثقل اور نبی امّی کی وحی

ہر اُونچے سے اُونچے درخت کا پھل زمین پر آگرتا ہے۔ نہایت زور اور پوری قوت سے اُوپر پھینکا ہوا پتھر بالآخر زمین پر آرہتا ہے۔ کوئی شئے مردہ ہو یا زندہ زمین کی گرفت سے باہر نہیں جاسکتی۔ ان گنت سیارے اور ستارے گویا بے اندازہ وزن کے گولے فضا میں معلق ہیں یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہے اس قسم کے بے شمار واقعات انسان کو حیران کرتے تھے یہ روزمرہ کے واقعات معمہ ہی بنے رہتے اگر انسان ان تمام واقعات میں صداقت اور حکمت معلوم کرکے لطف اندوز نہ ہوتا یا انسان میں اس قسم کی کوئی قوت موجود نہ ہوتی جو کائنات میں اپنے جوڑے کو تلاش کرتی ہے مگر انسان کے دماغ میں میزانِ عقل رکھ دی گئی ہے۔ جو سوچتی ہے سیب زمین پر کیوں گرا اوپر کی طرف کیوں نہ چلا گیا؟ ہوا میں معلق کیوں نہ رہا؟

جو چیز آسمان کی طرف پورے زور سے پھینکی جائے اُوپر اُوپر نہیں چلی جاتی بالآخر زمین پر کیوں آ رہتی ہے؟ اتنی بھاری بوجھل زمین سیارے اور ستارے فضا میں تیرتے پھرتے ہیں گرتے نہیں؟ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

ایک مفکر ان باتوں پر غور کر کے کششِ ثقل کا اصول معلوم کر لیتا ہے اس مفکر کا نام نیوٹن ہے۔ نیوٹن یہ خیال کر کے ناچنے لگتا ہے جیسے اس کے کسی دماغی خلا نے اپنے جوڑے کو پالیا اس کے بعد جو شخص اسے سنتا ہے اس میں ایک لذت اور سرور محسوس کرتا ہے انسان کے دماغ کے اندر عقل اور خارج میں کائنات کے اندر اس کا زوج موجود ہے۔ جہاں یہ دونوں ملے یہ جنت کے ساتھیوں کی طرح ہمیشہ اکٹھے رہتے ہیں باہم لطف اٹھاتے بلکہ یک جان ہو جاتے ہیں جس چیز میں انسان کی عقل کو اپنا جوڑا نہیں ملتا اس کے لئے وہ تڑپتی اور بیقرار رہتی ہے۔ انسانی عقل کے لئے کائنات میں اس قسم کے بے شمار ازواج موجود ہیں جنہیں جان پہچان کر وہ آئے دن لطف اندوز ہوتی ہے کبھی کبھی واقعات بے شمار ہوتے ہیں مگر ان کی تہہ میں ایک ہی صداقت کار فرما ہوتی ہے۔ کششِ ثقل ایک اصول ہے مگر کتنے واقعات کا کلید بردار ہے حیوان صرف واقعات کو دیکھتا ہے مگر انسان ان واقعات کے اندر دلیل اور عقل کا جویا رہتا ہے۔ نیوٹن نے بڑے عرصہ کے غور و فکر کے بعد اپنی اور ہماری عقل کے لئے ایک لذت کا سامان تیار کیا مگر امّی عربیؐ اس سے صدیوں پیشتر اللہ تعالیٰ سے خبر پا کر ہمیں بتا گیا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَاۗءً وَّاَمْوَاتًا (۷۷ : ۲۵ تا ۲۶) کیا ہم نے زمین کو زندہ اور مردہ اشیاء اپنی طرف روک رکھنے والی نہیں بنایا۔ كِفَاتًا جس کے معنی روک رکھنے اور جمع کرنے کے ہیں اس کے ایک تیسرے معنی تیز رَو کے بھی ہیں مثلاً تَكَفَّتَ الطَّائِرُ وغیرہ اَسْرَعَ فِی الطَّيَرَانِ اڑنے میں نہایت تیز پرند تَكَفَّتَ فِی مَسِيْرِهٖ چلنے میں تیز

گویا اس مختصر سے جملہ میں سائنس کے دورِ جدید کے انکشافات کا اظہار کیا گیا ہے زمین اپنی تیزی اور گردش سے تمام زندہ اور مُردہ اشیاء کو اپنی طرف روک رہی ہے یا اپنے ساتھ لگائے ہوئے ہے۔

انسانی جسم کے عجائبات اور قرآن مجید

قرآن مجید میں ایک جگہ رب العالمین کی حمد اور دوسری جگہ وَلَهُ الْحَمْدُ کی دلیل کے طور پر فرمایا وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۴۰ : ۶۴) اس نے تمہاری صورت بنائی تو کیا خوب ہی بنائی۔ ظاہری شکل، ترتیب و تناسب اعضاء کے لحاظ سے خوبصورت بنایا تو یہ محض ایک جنتِ نگاہ ہے اور اس سے صرف تمہارے جذبات کا تعلق ہے اب اسی شکل و صورت اور ظاہری حسن و جمال سے نیچے اتر کر انسانی جسم کی ساخت پر غور و فکر کو دعوت دو وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا (۲ : ۲۵۹) جسم کے اندر ہڈیوں کو دیکھو کس طرح ہم انہیں اٹھاتے ہیں جمع کرتے ہیں یا ترتیب دیتے ہیں کیسے ان پر گوشت پہناتے ہیں اس پر غور کرنے سے ایک عالم اور اس کا علم دوسرے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ایک عظیم الشان نشان بن جاتا ہے۔ جانداروں کی ہڈیاں اور گوشت کی ساخت اور صنعت میں اللہ تعالیٰ کی ہستی پر بے شمار حکمتیں اور براہین موجود ہیں۔ ہڈیوں کا یہ حکمت نظام نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہستی پر گواہ ہے بلکہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ خدا زندہ خدا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ عجیب و غریب ورکشاپ انسان کا اپنا جسم ہے۔ جو اس قدر مختصر ہونے کے باوجود بے شمار اشیاء تیار کرتا رہتا ہے سب سے پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ ان کو پہلے بے جان سمجھا جاتا تھا یا یہ کہ وہ ابتداء میں فی الواقعہ مردہ ہوتی ہیں۔ مگر اس زمانہ میں یا کچھ عرصہ بعد ان کے اندر زندگی پیدا ہو جاتی ہے فرمایا

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (۳۶: ۷۸ - ۷۹) کافر نے کہا ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا کہو وہی جس نے پہلی مرتبہ انہیں بنایا اور وہ ہر قسم کی تخلیق جانتا ہے۔

جسم انسانی میں ہڈیوں کی تعداد ۲۶۰ ہے مگر ان کی ترتیب اور نظم پر انسانی جسم کی خوبصورتی اور ڈھانچ کی خوبصورتی کا انحصار ہے۔ ہر عضو کی ہڈی کی ایک خاص شکل اور اسی کے مطابق اس کی حرکت ہے۔ اکثر ہڈیوں کے ذریعے جسم کے قیمتی خزانوں کی حفاظت ہوتی ہے۔ وقت اور جگہ کے لحاظ سے ان میں بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کی تعمیر اور تیاری میں لاکھوں مزدور دن رات کام کرتے ہیں۔ بچپن میں نہایت نرم مگر قابلِ مرمت ہوتی ہیں لیکن بڑھاپے میں سخت اور بھربھری ہوتی جاتی ہیں دونوں وقت ان کے سیلز اور خلئے الگ الگ قسم کے ہوتے ہیں ۲۲ یا ۲۳ برس میں ان کی تکمیل ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک دَور یا ارتقائی منزل اور اس میں معقولیت ایک علیم اور حکیم خدا کی ہستی پر دلالت کرتی ہے چنانچہ آخر پر فرمایا قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۲: ۲۵۹) کہا میں نے خوب جان لیا کہ اللہ ہر چیز کو اس کے مناسب وقت اور مناسب حکمت کے ساتھ کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔

انسانی جسم کی جلد میں حکمت الٰہی

حیوانی زندگی کا دارو مدار اس کی حرارتِ عزیزی کے اعتدال پر منحصر ہے مختلف حیوانات میں یہ درجہ اعتدال یکساں نہیں بلکہ مختلف ہے تاہم زندہ مشینری کے مقررہ درجہ میں جہاں زیادہ کمی بیشی ہوئی کشتیٔ حیات کے ڈوب جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس اعتدال کو قائم رکھنے کے لئے انسانی جلد میں

حاصل کرتا ہے اور وہ بے شمار روغن اور چربی پیدا کرنے کی تھیلیاں ہیں جو بالوں کو چکنا اور نرم رکھتی ہیں اور جلد کی بیرونی سطح کو ملائم رکھتی ہیں۔ نیز بے شمار لچکیلے ریشے ہیں جن کی تہ میں چربی کی گدیاں ہیں گویا جلد کا یہ حصہ مرغن ثرید ہے جو بیرونی پردہ جلد کو تروتازہ رکھتا ہے۔ چربی کی یہ گدیاں بڑھاپے میں اکثر معدوم ہو جاتی ہیں تو جلد کے لچکدار اعصاب بوسیدہ لنگوٹی کی طرح اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے بابا جی سردی سے زیادہ ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی کریم مالش اور غازہ جھریوں کو مٹا نہیں سکتا۔

کلام پاک کا چوتھا اعجاز

آیت مندرجہ بالا کے بعد فرمایا وَسَرَابِيلَ تَقِيكُمُ بَأْسَكُمْ اور اس نے وہ سراپا بنایا جو تمہیں جنگ سے بچاتا ہے عام طور پر اس سے مراد زرہ بکتر لئے گئے ہیں جو انسان جنگ میں بچاؤ کے لئے پہنتا ہے لیکن اسے اس سے مخصوص کرنا ضروری نہیں اور اس سے مراد بھی ہمارا قدرتی لباس ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے ہمیں عطا کیا ہے۔ ورنہ ظاہری جنگ میں زرہ بکتر پہن کر اپنی حفاظت کرنا کوئی یقینی بات نہیں، البتہ ہمارے اندر جو فسادات اور زہریں پیدا ہوتی ہیں ان کا ازالہ ہماری جلد اور قدرتی سراپا کے ذریعہ ضرور ہوتا ہے باریک سی جلد کے انہی لطیف طبقات کے اندر بالوں کی کاشت اور نشوونما کا کارخانہ بھی موجود ہے بال تقریباً سارے جسم پر پیدا ہوتے ہیں گو بعض بعض جگہ وہ اس قدر باریک ہیں کہ نظر تک نہیں آتے ان تمام بالوں کی تہہ میں ایسے باریک پٹھے ہیں۔ جو خوف اور سردی کے وقت بالوں کو کھڑا کر دیتے ہیں جو حرارت عزیزی کو اعتدال پر رکھتے ہیں اور دوران خون کو برابر گردش میں رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور جسم کی قوت کو بحال رکھتے ہیں بالوں کے ساتھ جو ننھے ننھے عصبی ریشے ہیں وہ موچینی۔ خراش اور جلدی امراض

مسام ہیں جو سردی سے سکڑتے اور گرمی سے پھیلتے ہیں۔ جب موسم گرم ہوتا ہے تو رگیں پھیل کر زائد گرمی دفع کر دیتی ہیں اور پسینہ بہانے والے بیس لاکھ غدود کو اعصابی عروق پسینہ بہانے کا حکم دیتے ہیں (جس طرح ایک فائر بریگیڈ افسر آگ کی خبر پاتے ہی مکان پر پانی برسا دیتا ہے) اور وہ ایک دن میں تقریباً دو سیر پانی بہا کر باہر کی تیز گرمی کے بالمقابل ہماری صحت اور تسکین کے لئے جسم کو ٹھنڈا اور حرارتِ بدن کو اعتدال پر رکھتے ہیں مگر جب موسم سرد ہوتا ہے تو رگیں سکڑ جاتی ہیں اور مسام تنگ ہو کر باہر کی سردی کو روکتے ہیں اور اندر کی گرمی کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ نظام اس قدر منظم اور پُر حکمت ہے کہ انتہائی سردی اور گرمی میں خواہ ہم افریقہ میں ہوں یا قطبین پر انسانی صحت کی حرارت ۹۸٫۶ سے کم و بیش نہیں ہوتی۔ سردی اور گرمی کے علاوہ موسم برسات میں ہماری جلد ایک نہایت عمدہ برساتی کوٹ ہے جس کی مانند بڑے سے بڑا سائنسدان برساتی کوٹ تجویز نہیں کر سکتا یہ تفسیر ہے وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ کی جسے پورے طور پر نہ سمجھ کر مفسرین نے ہمارے کپڑوں کا لباس سمجھ لیا۔

اسی کے متعلق قرآن مجید کا ایک اور اعجاز

اوّل تو قرآن شریف کا یہ معجزہ ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس بعد بڑے غور اور عملی تجربات سے جلدِ انسانی سے متعلق ظاہر ہونے والے انکشافات کی طرف اس نے ایک چھوٹے سے جملہ میں بلیغ اشارہ کر دیا دوسرے یہ حکمت کے موتی ایک امّی کو دیئے گئے مگر یہاں آیت کا معجزہ اسی پر بس نہیں۔ عربی زبان کا لفظ سرابیل جمع کا صیغہ ہے اور اس کا واحد سربلہ ہے۔ سربلہ کے ایک معنی ثرید (ایک قسم کا کھانا) جس میں چربی اور روغن بہت ہوتا ہے۔ سردی گرمی اور پانی کے اثر سے محفوظ رکھنے کے علاوہ ہر ایک بال اور روئیں کی جڑ میں ایک کیسہ ہوتا ہے جس سے بال اپنی خوراک

حاصل کرتا ہے اور وہ بے شمار روغن اور چربی پیدا کرنے کی تھیلیاں ہیں جو بالوں کو چکنا اور نرم رکھتی ہیں اور جلد کی بیرونی سطح کو ملائم رکھتی ہیں۔ نیز بے شمار لچکیلے ریشے ہیں جن کی تہ میں چربی کی گدیاں ہیں گویا جلد کا یہ حصہ مرغن ثرید ہے جو بیرونی پردہ جلد کو تروتازہ رکھتا ہے۔ چربی کی یہ گدیاں بڑھاپے میں اکثر معدوم ہو جاتی ہیں تو جلد کے لچکدار اعصاب بوسیدہ لنگوٹی کی طرح اپنی گرفت ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے بابا جی سردی سے زیادہ ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں کوئی کریم مالش اور غازہ جھریوں کو مٹا نہیں سکتا۔

کلام پاک کا چوتھا اعجاز

آیت مندرجہ بالا کے بعد فرمایا وَسَرَابِيلَ تَقِيكُمُ بَأْسَكُمْ اور اس نے وہ سراپا بنایا جو تمہیں جنگ سے بچاتا ہے عام طور پر اس سے مراد زرہ بکتر لئے گئے ہیں جو انسان جنگ میں بچاؤ کے لئے پہنتا ہے لیکن اسے اس سے مخصوص کرنا ضروری نہیں اور اس سے مراد بھی ہمارا قدرتی لباس ہے۔ جو اللہ تعالےٰ نے ہمیں عطا کیا ہے۔ ورنہ ظاہری جنگ میں زرہ بکتر پہن کر اپنی حفاظت کرنا کوئی یقینی بات نہیں، البتہ ہمارے اندر جو فسادات اور زہریں پیدا ہوتی ہیں ان کا ازالہ ہماری جلد اور قدرتی سراپا کے ذریعہ ضرور ہوتا ہے باریک سی جلد کے انہی لطیف طبقات کے اندر بالوں کی کاشت اور نشوونما کا کارخانہ بھی موجود ہے بال تقریباً سارے جسم پر پیدا ہوتے ہیں گو بعض بعض جگہ وہ اس قدر باریک ہیں کہ نظر تک نہیں آتے ان تمام بالوں کی تہہ میں ایسے باریک پٹھے ہیں۔ جو خوف اور سردی کے وقت بالوں کو کھڑا کر دیتے ہیں جو حرارت عزیزی کو اعتدال پر رکھتے ہیں اور دوران خون کو برابر گردش میں رکھنے میں مدد دیتے ہیں اور جسم کی قوت کو بحال رکھتے ہیں بالوں کے ساتھ جو ننھے ننھے عصبی ریشے ہیں وہ موچینی۔ خراش اور جلدی امراض

کے وقت مخبروں کی طرح فوج کا کام دیتے ہیں۔ جسم پر کسی جگہ بال اکھاڑ کر دیکھئے ذرا سی جسم پر خراش آجائے فوراً یہ خبر رساں پیادے دماغ کی طرف دوڑتے ہیں تاکہ دماغ سے جسم کی سلامتی کا انتظام کیا جاسکے اور جب تک خاطر خواہ سامان اور علاج نہیں ہوجاتا وہ برابر چیخ و پکار کرتے رہتے ہیں آخر یہ ہماری جلد ہے کیا چیز؟ ہر ایک پھل اور سبزی کو دیکھئے اس کے اُوپر باریک سا چھلکا یہ اس پھل کے رَس وغیرہ بہہ جانے سے ہی نہیں روکتا بلکہ جراثیم کے لشکروں وغیرہ کے حملہ سے بھی بچاتا ہے۔ جو ہوا میں موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ جب اوپر کی جلد یا چھلکا خراب ہوجائے تو پھل متعفن اور مضرِ صحت ہوجاتا ہے ہر پھل اور زندہ جسم پر ہر وقت دو قسم کے حملے پے دَر پے ہوتے رہتے ہیں ایک باہر کے جراثیم کا حملہ اور دوسرا اندر کے فسادات کا خطرہ، ہماری باریک سی جلد دونوں طرف سے ہماری حفاظت کرتی ہے اور اس کے کروڑوں مسام اندرونی زہروں کو دُور کرکے پسینہ اور بخارات کے ذریعہ انسان کے جسم کی حفاظت کرتے ہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ جس نے فرمایا وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ بَاْسَکُمْ اور پھر ایسا عجیب وغریب لباس ہمیں پہنایا۔

قرآن مجید کا اِس آیت میں پانچواں اعجاز

جلد کے لئے موسم گرما ہی زیادہ ضرر رساں ہے اس لئے قرآن مجید نے فرمایا جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ ایسا لباس تمہارے فائدہ کے لئے بنایا۔ جو تمہیں گرمی سے بچاتا ہے۔ وہ لباس جو ہم بناتے ہیں وہ ہمیں سردی سے بچاتا ہے گرمیوں میں تو انسان اپنے کپڑے اتار دیتا ہے اس لئے کہتے ہیں کہ درخت اپنا لباس اتار دیتے ہیں تو انسان اپنے کپڑے پہن لیتا ہے لیکن جب درخت اپنے کپڑے پہن لیتا ہے تو انسان اپنا لباس اتار دیتا ہے ظاہری لباس کے اعتبار سے انسان کو لباس کی ضرورت موسم سرما میں ہوتی ہے مگر یہاں یہ نہیں

فرمایا جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْبَرْدَ کہ ہم نے تمہیں ایسا لباس دیا جو تمہیں سردی سے بچاتا ہے گرم کپڑے شال اور دوشالے، حقیقت یہ ہے کہ یہاں سوتی اور اونی کپڑوں کا ذکر نہیں بلکہ اُسی قدرتی لباس کا ذکر ہے کہ "جس کا نہیں سیدھا الٹا" ہماری جلد کو گرمی اور گرد جس قدر نقصان پہنچاتی ہے اور کوئی چیز نہیں پہنچاتی۔ آپ جانتے ہیں جلدی بیماریاں زیادہ تر اسی کی وجہ سے ہوتی ہیں اور جلد کی صحت اور تازگی برباد ہو جاتی ہے، اور ان دنوں سورج کی تیز روشنی آنکھوں پر بُرا اثر کرکے ان کو سکیڑ دیتی اور ان کے گرد حلقے ڈال دیتی ہے۔ جلد کے نیچے سے قدرتی روغن خشک ہو جاتا ہے اور غُلیوں کا دورِ زندگی ختم ہو کر جلد قبل از وقت مرجھا کر جھُریاں پڑ جاتی ہیں۔ انسانی جلد کی صنعت اور اس کی تروتازگی کا راز سمجھ لینے کے بعد موسم گرما کی حرارت اور اس کے تباہ کن اثراتِ بد کو دیکھتے ہوئے قرآن مجید کی آیت جَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے کہ سردی کی بجائے گرمی کا کیوں ذکر کیا اور لباس کو جو انسان بُنتا ہے اس کی بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے بنائے ہوئے لباس کا کیوں ذکر کیا۔ اب اس جگہ قرآن مجید نے ایک چھوٹا سا علاج بھی چہرہ اور آنکھوں کو گرمی اور گرد کے بُرے اثرات سے بچانے کا بتایا ہے اور وہ پانچ وقت کا وضو ہے اور یہ ایک نہایت ہی آسان اور بالکل مفت کا علاج ہے۔ جس کے ذریعہ ایک مومن اپنے چہرہ کی تازگی اور آنکھوں کی حفاظت کر سکتا ہے اس سے گرمی اور گرد دونوں کا مہلک اثر دور ہو جاتا ہے پابندِ صلوٰۃ مسلمان کے چہرہ پر نور اور رونق ہونے کا یہی راز ہے اور وہ شخص جو اپنے قدرتی لباس کو میلا اور غلیظ ہونے نہیں دیتا اس کی صحت اچھی رہتی ہے۔

آیت مذکور میں چھٹا اعجاز

آیت کتنی مختصر ہے لیکن آج تک اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے اس

آیت کی اُلٹی سیدھی تاویل کی گئی ہے کسی نے سوتی اور اُونی لباس سمجھ کر یہ کہا کہ گرمی سے بچانے والے لباس کا ذکر کرکے قرآن مجید نے سردی کے لباس کی بدرجہ اولیٰ ضرورت بتائی ہے۔ یہاں جس لباس کا ذکر ہے وہ قدرتی لباس ہے اور وہ لباس ہے جو اللہ تعالیٰ پہناتا ہے۔ آیت میں ایک اور معجزہ یہ ہے "تَقِيكُمُ الْحَرَّ" کے ممکن طور پر دو معنی ہو سکتے ہیں ایک تو وہ معنی جو عام طور پر ہر ایک مفسّر نے کئے ہیں اور وہ یہ کہ حَرّ وہ گرمی ہے جو موسم کی تبدیلی کی وجہ سے خارج میں پیدا ہوتی ہے اور دوسرے اس سے مراد وہ حرارت ہے جو انسان کے اندر ہوتی ہے کہ جس پر انسان کی زندگی کا انحصار ہے ہماری اندر کی گرمی کو بھی باہر نکلنے سے ہماری جلد کا پُرحکمت نظام روکتا ہے کون نہیں جانتا کہ جب ہم ہوائی جہاز میں پچیس تیس ہزار فٹ کی بلندی پر اڑتے ہیں تو باہر کے درجہ حرارت اور جہاز کے اندر کے درجہ حرارت میں تفاوت رکھا جاتا ہے اور یہ فرق شمالی اور جنوبی علاقوں میں بہت زیادہ ہوتا ہے یعنی باہر کا درجہ کتنا ہی گرا ہوا کیوں نہ ہو لیکن جہاز کو ائر کنڈیشنڈ بنا کر ہم اندر سے گرم رکھتے ہیں۔ بعینہٖ خارج میں گرمی ہو یا سخت سردی ہو مگر ہماری جلد میں کروڑہا مسام، بال، ۲۰ لاکھ کے قریب روغن پیدا کرنے کے غدود، چربی کے کیسے اور گدیاں، اعصابی ریشے اور خلیات کبھی پسینہ بہا کر اور زہریں اور زائد گرمی خارج کرکے ہمیں ٹھنڈا رکھتے ہیں اور اندر کی حرارت ۹۸ ½ پر ہی روکے رکھتے ہیں اور کبھی رگوں کے سکڑنے اور رونگٹے کھڑے ہونے سے ہم سردی سے محفوظ اسی درجہ حرارت پر رہتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں گویا حرارت سے یا حرارت کا بچاؤ ہے اس لئے آیت کے آخر پر فرمایا كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ۔ اللہ تعالیٰ نے تو تمہاری حرارتِ عزیزی۔ صحت۔ تروتازگی اور جان کی حفاظت کا سامان کر دیا ہے اب تمہارا کام اس نعمت کا شکریہ ادا کرنا اور اس کی قدر کرنا ہے

کہ اس لباس کو گندہ اور غلیظ نہ ہونے دو اور کیا حکمت ربی ہے کہ یہ لباس اس قدر باریک ہے کہ ایک انچ کا پچیسواں حصہ ہے مگر اس کے اندر چھ تہ بہ تہ طبقے ہیں اگر یہ محض لطیفہ نہ سمجھا جائے تو جلد کے ان چھ طبقات کا نام سَرَابِیل خود چھ حرفی لفظ ہے۔ جلد نہایت باریک اور مختصر ہے مگر اس کے فوائد بے شمار ہیں۔ دوسری طرف قرآن مجید کی آیت مختصر ہے مگر اس کے اندر مضامین نہایت وسیع ہیں کہنے کو یہ ایک آیت ہے مگر اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلائل بکثرت ہیں اس کے بعد فرمایا یہ اتمام نعمت اس لئے ہے لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ اِس نعمت۔ حکمت اور صداقت کا تقاضا ہے کہ تم سوچو ایک نبی امّی جو بایالوجی۔ بیکٹریالوجی۔ اناٹومی۔ فزیالوجی۔ علم الحیات۔ علم الجراثیم تشریح الاعضاء والاجسام وغیرہ۔ وغیرہ سے ناواقف محض تھا وہ قدرت کے باریک نکتے اور راز بغیر تعلیم اور وحی الٰہی کیونکر بتا سکتا تھا اس پر غور کرو اور مسلمان ہو جاؤ۔ اصل مضمون یہی تھا کہ کائنات کی پہنائیوں میں رنگ و بُو کی دیدہ افروزیوں یا حسن و خوبی کے ماسوا ہر قدرتی چیز میں حکمت فلسفہ اور صداقت بھی قدم قدم پر موجود ہے ورنہ روزمرہ کے مشاہدات اور انکشافات بے لطف ہی رہتے اگر ان کے نیچے صداقت اور حکمت موجود نہ ہوتی فی الجملہ نیچر کی ہر صنعت میں انتہائی کفایت مکان و زمان اور مواد موجود ہے جس میں

(Economy of space, Economy of time and Economy of matter)

کے باوجود افادیت اور صلاحیت کی مقدار کس قدر موجود ہے۔ جو انسان کے اندر ایک حکیم و حمید خدا کی ہستی پر ایمان اور یقین مضبوط کرتی ہے قرآن مجید اس قسم کے بے شمار دلائل سے بھرا پڑا ہے ایک طرف تو قرآن شریف میں علوم جدیدہ کے ان معارف کی طرف واضح اشارات موجود ہیں دوسری طرف نیچر کی ہر شئے کے اندر سائنسدانوں کی غوّاصیاں جو رات دن بے شمار علمی موتی نکالتی ہیں جن کی خبر پہلے سے

قرآن مجید میں موجود ہے۔ قدرت جو فاطرِ فطرت کا فعل ہے اور قرآن مجید جو اس ہستی کا قول ہے ان دونوں کے اندر تطابق اور توافق ہستی باری تعالےٰ پر ایک زبردست دلیل ہے جو دہریت اور تشکک کا قلع قمع کرتی ہے۔

ہستی باری تعالیٰ اور اخلاقِ حسنہ

حسن و صداقت کے علاوہ دنیا کی زندگی کا ایک پہلو اخلاقِ حسنہ یا نیکی اور حقیقی مسرت کا پہلو ہے۔ جسے دنیا کا یا اعمالِ انسانی کا (Ethic View) یا اخلاقی منظر کہا جاتا ہے اگر صداقت کے بغیر حُسنِ کلام بقولِ فلاسفہ حسین حماقت ہے اور اُن کے نقطۂ نگاہ سے کلام کا نوّے فیصدی حصہ ایسی موسیقی اور شعر ہے جو نادانی محض ہے اس لئے کلام کی حقیقی خوبصورتی اس میں حسن و صداقت دونوں کے پایا جانے سے ہے اگر یہ سچ ہے کہ صداقت کے بغیر خوبصورتیِ الفاظ حماقتِ محض ہے تو حُسنِ کلام سے معرّا صداقت بھی درخورِ اعتنا نہیں۔

دندانِ تو جملہ درد ہانند　　چشمانِ تو زیبرا بر دانند

کی قسم کا کلام شعر کو سوگوار عورت کے ہم پایہ بنا دیتا ہے مگر حُسن و صداقت دونوں مل کر بھی انسان کی کامل تسلی کا موجب نہیں ہو سکتے کلام کے اندر جب تک اپنی اور دوسروں کی بھلائی یا نیکی کی ملاؤنی نہ ہو اس کا بیشتر حصہ سامانِ جراحت اور قلبِ سلیم کے لئے ایک نشتر ہوتا ہے، نیکی سے ہماری مراد صرف زبان کی شگفتگی اور شائستگی نہیں بلکہ عمل بھی ہے، اُصولاً نیکی کا مفہوم اچھا اور بُرا چلن ہے مگر انسان اچھا کیوں ہو؟ بُرا کیوں نہ ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر مختلف مذاہب کا خیال نیکی کے بارہ میں اصولاً مختلف ہو تو اس کا نتیجہ سوائے بربادی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اس لئے سوشل تقاضاؤں اور تمدّنی ضرورتوں نے ہمیں اخلاق کے بنیادی اصولوں اور نیکیوں میں متحد کر دیا ہے مگر اس نیکی کا سرچشمہ

اور منبع انسان کا اپنا دماغی تخیل نہیں بلکہ وہ ذات ہے جس نے انسان کو بالطبع متمدن پیدا کیا ہے پس ہر قسم کی نیکی کی بنیاد الہام الٰہی پر ہے عقلِ انسانی نے نیکی کی تعریف کی تعیین اور حد بندی میں ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے مگر خدا جو کائنات کا صرف خالق ہی نہیں بلکہ اس کا بہی خواہ اور اس کا نشو و نما اور تربیت کرنے والا بھی ہے اس نے نیکی کے قیام کے لئے اپنے نیک بندوں کو ہر خطۂ ملک میں ہمیشہ ہمیشہ اپنے پیغام کے لئے چُن لیا ہے تا اَدھرم اور بے دینی کی جڑ کو نیست و نابود کر کے نیکی اور دین کی عمارت کو استوار کیا جائے یہ وہ ہموار زمین ہے جہاں وید۔ گیتا۔ تورات۔ ژند اوستہ۔ دھمہ پاد انجیل اور قرآن مجید ملتے ہیں۔ (گو بعض کُتب میں مذہبی علماء نے اس کے خلاف بھی کچھ ملا دیا ہے)۔

نیکی کیا ہے؟

حُسن اور صداقت کی طرح نیکی کی تعریف بھی آسان نہیں، حبشی، چینی، سفید فام اقوام اور سُرخ اقوام میں حُسن کا معیار ایک نہیں۔ قد و قامت، تناسبِ اعضاء اور صباحت و ملاحت رنگ میں بیسیوں نکتہ آفرینیاں ہیں جن کی وجہ سے حُسن صرف ایک وجدانی کیفیت بن کر رہ جاتا ہے۔

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی — کز تو مجنوں شد پریشاں وغوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی — گفت خامش شو کہ مجنوں نیستی

مرغ کو مرغی کی کک کک کے بالمقابل بلبل کی چہچہاہٹ ہرگز پسند نہیں تو لیلیٰ را بچشمِ مجنوں باید دید بھی درست ہے۔ حُسن و صداقت کی طرح نیکی کی تعریف بھی آسان نہیں ایک مُسلم کے اعتقاد میں قربانی اعلےٰ درجہ کی نیکی اور ثواب کا کام ہے جو اپنی بڑی سے بڑی اور پیاری چیز محض خدا کے لئے دے دینے اور اپنے سے غریب بھائیوں کو اپنی خوشی اور خورش میں شامل کر لینے کا سبق دیتی ہے

جس طرح

Affection for one can be a training ground and a stepping stone to affection for all.

کسی ایک سے محبت سب کے ساتھ محبت کرنے کی بنا اور تربیت گاہ ہو سکتی ہے مگر ایک جینی ہندو اور بدھ کے نزدیک نہ صرف یہ کوئی نیکی نہیں بلکہ ایک بہت بڑی بدی اور انتہائی ظلم ہے۔ ہندو کہتے ہیں ہمارے دھرم کا خلاصہ ہے آہنسا پرمو دھرما، کسی ذی روح کا دل نہ دکھانا ہی افضل مذہب ہے۔ اس لئے پارسی اور ہندو مذہب میں بھوکے انسان کی بجائے ایک کتے اور گائے کو گھی کے پراٹھے کھلانا زیادہ نیکی اور ثواب کا کام ہے مگر ایک عیسائی اور مسلمان اس معاملہ میں انسان کو جانور پر ترجیح دیتا ہے اور بھوکے انسان کو کھانا کھلانا اور اس کی جان بچانا زیادہ نیکی کا کام سمجھتا ہے نہ صرف غیر مذاہب کی یہ حالت ہے۔ خود مسلمانوں میں آجکل ایک ٹھیٹھ حنفی کے نزدیک وہابی اور قادیانی کو بُرا کہنا ثواب اور نیکی کا کام ہے انسانی برادری میں ذات پات کی تفریق ہندو دھرم کا جزو لازم ہے اور اس کی رعائت دھرم شاستر کا اصل الاُصول ہے مگر ایک مُسلم کے نزدیک یہ شرکِ عظیم، بداخلاقی اور فسادات کی جڑ ہے اور نیکی کے گلے پر تیز چھُری ہے پس عقل انگشت بدنداں ہے کہ نیکی کسے کہا جائے جبکہ تمام مذاہب میں عقلمندوں کی کوئی کمی نہیں۔

ہر مذہب اور قوم میں بعض متضاد اعمال نیکی کہلاتے ہیں جن کی وجہ سے ایک آزاد خیال شخص بآسانی مذہب کا منکر ہو جاتا ہے مگر جس طرح جذبات میں ہر جذبہ کا جوڑا ہے جس سے وہ ملتا اور لُطف اندوز ہوتا ہے اور عقل کے لئے ہر قدرتی

شے میں زوج ہے اسی طرح نیکی بھی کوئی منفرد شے نہیں۔ اکثر نیکیاں مذاہب کی باہمی تصدیق اور تائید سے نیکیاں ثابت ہیں اور ان کا ثبوت ان کی الہامی کتب سے ملتا ہے۔

یہ کتنی عجیب بات اور ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مذاہبِ عالم کی الہامی کتب آپس میں بُعد المشرقین اور ہزار ہا سالوں کا بعد زمانی اور شدید اختلافِ لسانی رکھنے کے باوجود اکثر نیکیوں کی تعیین میں متفق ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ وید۔ ژنداوستا۔ تورات۔ دھمہ پاد اور انجیل کہ جن کے زمانۂ نزول اور جائے نزول میں ہزار ہا برس اور ہزار ہا میل کا فرق ہے جن کی زبان۔ رسم الخط سب کچھ آپس میں مختلف ہے اور پھر ان مذاہب کی باہم اس قدر شدید دشمنی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی کتب کو چھونے تک نہیں دیتے مگر ان کی تعلیمات کا ایک حصہ لفظاً نہ سہی معناً ملتا ہے جو اس امر کی ناقابلِ شکست دلیل ہے کہ ان تعلیمات کا ماخذ اور منبع علمِ الٰہی ہے بلاشبہ وہ اٹل صداقتیں ہیں نہ صرف اس لئے کہ ان کتب کا دعویٰ خدا کی طرف سے ہونے کا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ انسانی عقل اور اقوام کا تجربہ بھی ان کی سچائی پر گواہ ہے اس کی صرف ایک مثال پر یہاں اکتفا کیا جاتا ہے۔

وید اور قرآن مجید کہاں ملتے ہیں؟

ہندوستان میں مختلف قوموں اور مذاہب کے لوگ آباد ہیں جن کا کلچر۔ تہذیب اور مذہب بدرجۂ غایت مختلف ہے تاہم اس ملک کے تین بڑے مذاہب قابلِ ذکر ہیں۔ ہندو دھرم، عیسائیت اور اسلام، اگر ان کے اصولِ اخلاق متحد ہو جائیں تو یہ ملک امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ ہندو دھرم ہندوستان کا مذہب ہے۔ عیسائیت کی پیدائش شام کا ملک ہے اور اسلام کا مرکز عرب ہے۔ ان تینوں مذاہب کی کتبِ مقدسہ الگ الگ ان کی زبانیں مختلف اور ان کے یومِ ظہور میں صدیوں کا ہیر پھیر جس کی وجہ سے اس قسم کا کوئی شائبہ موجود نہیں کہ

ان تینوں مذاہب کے انبیاء نے ایک دوسرے کی نقل اڑائی ہو۔ ہندو دھرم کے ظہور کے وقت عیسائیت اور اسلام یہاں موجود نہ تھا۔ جناب مسیح کے زمانہ میں ملک شام کے اندر ہندوؤں کا نام و نشان تک کوئی نہ جانتا تھا اور صدر اسلام میں عرب بیرونی دنیا سے بالکل ناواقف تھے اور لکھنا پڑھنا عیب کی بات سمجھتے تھے مسیحؑ سے پیشتر ہندوؤں کی کتب مقدسہ گوشہ گمنامی میں پہنچا دی گئی تھیں اور اسلام کے ظہور کے وقت انا جیل کا کوئی چرچا نہ تھا ان واقعات کی موجودگی میں ذیل کی حقیقت پر غور کیجئے۔ مضمون کی ابتداء میں سورۃ فاتحہ کے اندر سات آیات اور سات اخلاقی خوبیوں کا ذکر بتایا گیا ہے جو سات اعلےٰ نیکیاں بھی کہلاتی ہیں۔ یہ سات اعلےٰ نیکیاں از روئے عقل اقوام عالم میں امن و صلح کی ضامن ہیں مگر اس سے پیشتر کہ عقل اپنے تجربہ سے ان کی تصدیق کرے ہندوؤں کی پرانی کتاب مقدس رگوید میں لکھا ہے :۔

"سپت مریاداہ کویاہ تتکشوتاسام ایکام ات ابھی
امہورہ گات ایکوہ اسکبھم اُپ اسیہ نیلے پتھام وسرگے
دھرونیشو تستھوئے۔" (رگوید منڈل ۱۔ اسوکت ۳۵ منتر ۶)

"Seven are the pathways which the wise have fashioned; to one of these may come the troubled mortal. He standeth in the dwelling of the highest, a pillar, on sure ground where paths are parted."
(Translation by Prof. Griffith)

"سات (اخلاقی) حد بندیاں داناؤں نے بنائی ہیں ان میں سے ایک کو بھی توڑ دینے سے انسان گنہگار ہوتا ہے۔ یقیناً وہی بلند مقام پر قائم ہے جو اس صراطِ مستقیم پر ہے جہاں راستوں کا اختلاف نہیں۔"

ویدا اور شاستروں میں لفظ سپت (سات) بڑا مقدس اور قابل عزت

ہندسہ سمجھا جاتا ہے دوسرا لفظ منتر میں مَریادا ہے جس کی ترکیب سنسکرت لغت میں مشکوک ہے بعض لوگ اسے مَریا اور ادا کا مرکب سمجھتے ہیں اور 'ادا' کو پھرا + دا خیال کرتے ہیں۔ مَریَا فی الحقیقت عربی مَرْءٌ یا اِمرءٌ ہے جس کے معنی مَرد ہیں یا وہ جو مَردوں سے اختیار کی جاتی ہیں۔ کبھی یہ ان شہداء کے معنوں میں آتا ہے جو ملکی حد کی حفاظت کرتے ہوئے مارے جائیں۔ "مَریادَاہ" وہ حد بندیاں جو دو گاؤں کے درمیان ان کی حدود کو الگ الگ کرتی ہیں یا وہ اخلاقی خوبیاں اور اصول ہیں جن کے اندر رہنا انسان کے لئے ضروری ہے وید بتاتا ہے کہ یہ سات اخلاقی خوبیاں ہیں ان میں سے ایک کو بھی نظر انداز کر دینا انسان کو گنہگار بناتا ہے۔ اور ان کے اختیار کرنے سے انسان صراطِ مستقیم کے بلند مقام پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پس یہ وہ سات خوبیاں ہیں جو تمام مذاہب کی اساس ہیں اور اس میں عقلاً کوئی اختلاف نہیں اس منتر کا سورۃ فاتحہ کے ساتھ اشتراکِ معنوی ہے۔ اوّل تو دونوں میں سات نیکیاں یا سات عہد اور اقرار ہیں کہ جو نسلِ انسانی میں امن و صلح کے ضامن ہیں۔ ان سات حد بندیوں کو اگر عبور نہ کیا جائے تو سب طرف امن و امان رہتا ہے دوم قرآن مجید اور وید دونوں میں اسے منعم علیہ گروہوں کا آزمودہ راستہ بتایا ہے۔ سوم گلشنِ اخلاق میں وہ ایسی سات روشیں ہیں جن میں کوئی تضاد اور رستوں کا اختلاف نہیں مغضوب اور ضالین دونوں کی وہ راہ نہیں۔ ان نیکیوں میں سے ہر ایک نیکی ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے۔

چہارم: ان نیکیوں میں سے ایک نیکی کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو انسانی کامیابی کی منزل کھوئی ہوئی ہو جاتی ہے اور انسان یا مغضوب ہو جاتا ہے یا ضالین سے جا ملتا ہے۔

پنجم: اس صراطِ مستقیم یا سات خوبیوں کو اختیار کر کے انسان بلند مقام پر

کھڑا ہو جاتا ہے۔

ششم :۔ کتبِ انبیاء میں خواہ وہ وید ہوں یا تورات و انجیل، زند و ستا، اور دَہمپاد اس کے خلاف ان میں کوئی دوسرا راستہ مذکور نہیں۔

ہفتم :۔ از روئے عقل بھی ان نیکیوں میں کوئی نقص نہیں۔

قرآن مجید میں سبع (سات) ہے وید میں سپت سبت اور ہفت کا مترادف ہے۔ مرپاد سنسکرت میں اور مِرْصَاد عربی میں واضح اور وسیع راستہ کے لئے آتا ہے چونکہ آریہ بن قومیں عربی صاد کو صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتیں اس لئے مرصاد سنسکرت میں مرپاد ہو گیا۔

سورۃ فاتحہ اور وید منتر کے مضمون میں باوجود اختلافِ زبان و مکان و زمان اور قوم و مذہب اس قدر اتفاق اور اشتراک موجود ہے جو کوئی اتفاقی بات نہیں ہو سکتی بلکہ وید منتر کے ترجمہ اور مفہوم میں ایک خلاء عظیم موجود ہے اور اسے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے پاٹ دیا ہے۔ وید منتر کے الفاظ میں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ سات روشیں اور اخلاقی خوبیاں ہیں کون سی ہے نہ صرف اس منتر میں اور نہ اس کے بعد کے منتروں میں اور نہ چاروں ویدوں میں کسی دوسری جگہ ان سات اخلاقی خوبیوں کی کہیں تفصیل موجود ہے۔ البتہ ہندو پنڈتوں نے اپنے طور پر اس کے متعلق قیاس آرائی ضرور کی ہے۔ مگر سورۃ فاتحہ میں وہ سات خوبیاں موجود ہیں اور ان کا ذکر ہم پیشتر کر چکے ہیں۔

عیسائی مذہب اور سورۃ فاتحہ

سورۃ فاتحہ کی سات خوبیوں اور نیکیوں کا ذکر نہ صرف وید وغیرہ کتبِ غیر مذاہب میں ہے عیسائی مذہب کی کتاب مکاشفاتِ یوحنا میں بھی اس کی پیشگوئی موجود ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ یہ وہ سر مکتوم یا راز کی کتاب ہے

جسے سات مُہریں لگا کر بند کر دیا گیا تھا اور جس کے کھولنے والا کوئی مرد شروع دُنیا سے لے کر مسیح کے بعد یوحنا کے زمانہ تک بھی پیدا نہیں ہوا اس نے کہا کہ اس کا راز آئندہ زمانہ میں کھلے گا جب اس کی سات مہریں توڑ دینے پر دنیا کے اندر سات عظیم الشان فتنے (سیاسی مذہب) یا دجّالی جنگیں بپا ہوں گی۔ (مکاشفاتِ یوحنا باب ۵)

"پھر میں نے ایک اور زور آور فرشتے کو آسمان سے اُترتے دیکھا جو ایک بدلی کو اوڑھے اور اس کے سر پر دھنک تھا اس کا چہرہ آفتاب سا اور اس کے پاؤں آگ کے ستونوں کی مانند تھے اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کتاب کھلی ہوئی (سورۃ فاتحہ) تھی اور اس نے اپنا داہنا پاؤں سمندر پر اور بایاں خشکی پر دھرا ....." (مکاشفاتِ یوحنا باب ۱۰)

یوحنا جس کے مکاشفات انا جیل کا ضمیمہ ہیں اور جناب مسیح کے بعد کی کتاب ہے اس میں راز کی کتاب اور چھوٹی کھلی ہوئی کتاب سورۃ فاتحہ کے سوا اور کوئی کتاب نہیں کیونکہ یوحنا کے بعد کسی کتاب کا آنا یہ مسلماتِ مسیحی میں سے نہیں۔ پس چھوٹی اور کھلی کتاب سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ عبرانی میں ہے:-

وبید یُو سیفیر قاطن فاتوحہ

اور اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی کتاب فاتحہ تھی۔

آریوں، عیسائیوں اور یہودی کتب میں سورۃ فاتحہ کو "سات مہریں۔ سات راستے سات اخلاقی خوبیاں۔ سات نیکیاں۔ سات وادیاں۔ سات رشی۔ سات بہنیں سات زنار کے دھاگے۔ سات روشنیاں۔ سات نہریں۔ سات پد (منازل) سات پراک (ریاضتیں) سات پربوت (گھاٹیاں) سات بدھنہ (اصول ہندو اور بدھ مذہب میں کہلاتے ہیں) سات راز، سات شمعیں۔ سات مرتبہ صاف کی ہوئی

چاندی، سات مومی شمعیں "کے نام دیئے گئے ہیں۔

جملہ الحمدللہ سے عقیدہ ہمہ اوست اور دہریت کی تردید

الحمدللہ کی تشریح سے یہ ثابت ہے کہ ہر ایک خوبی، صداقت اور نیکی اللہ تعالےٰ کے لئے ہے کوئی اعلیٰ درجہ کی خوبی ایسی نہیں جو اس کی ذات میں بدرجہ کمال موجود نہ ہو۔ کوئی صداقت اور نیکی نہیں جسے عقلِ سلیم صداقت اور نیکی قرار دے اور وہ اللہ تعالیٰ میں پائی نہ جاتی ہو۔ جناب مسیحؑ فرماتے ہیں۔ "نیک تو ایک ہی ہے یعنی خُدا"۔ الحمدللہ کے جملہ کو قرآن مجید نے دوسرے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى (۷: ۱۸۰) تمام اعلیٰ درجہ کی کامل خوبیاں اور بہترین نام اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں۔ فی الحقیقت لفظ اللہ کے یہی معنی ہیں جیسا کہ پروفیسر لین (Lane) نے بھی اپنی عربی انگریزی لغت میں لکھا ہے

Comprising all the Attributes of perfection یعنی اللہ کے معنی ہیں مستجمع جمیع صفات کاملہ۔ پس جہاں کہیں بھی حُسن۔ صداقت اور اعلےٰ نیکی موجود ہے اس کا سرچشمہ اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔ پس خدا موجود ہے اور وہ ہمہ صفت موصوف وَجود ہے۔ بے شک یہ ایک دعوےٰ ہے مگر اس دعویٰ کا ثبوت کیا ہے؟ یہ اَمر قابلِ غور ہے کسی مسئلہ پر غور کرنے کے لئے سب سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ فلسفہ کا طریق بحث کیا ہے۔ علماءِ فن یہ کہتے ہیں کہ بحث ہمیشہ یقینیاتِ ذہنی (Mental certainties) سے شروع کرنا چاہیئے۔ اس اعتبار سے ہمارا سب سے پہلا یقین یہ ہے کہ 'میں موجود ہوں I exist, it is self-evident to you and a fact to me; میری ہستی میرے لئے ایک حقیقت ہے اور دوسروں کے لئے یہ مشاہدہ ہے۔ دوسرا یقین یہ ہے کہ میرے باہر خارج میں کائنات موجود ہے۔ زمین آسمان، سیارے ستارے چاند، سورج، لندن، پیرس اور لاہور وغیرہ مگر اس

کے بارہ میں علماء کے دو گروہ ہیں۔ سوفسطائی اور قائلین حقیقت (Idealists and Realists) دنیا کو مایا۔ فریب دھوکا، سراب سمجھنے والے ہمہ اوستی ہندو وغیرہ۔ ہمہ اوستی یا سوفسطائی دُنیا کی حقیقت کے بارہ میں تو شک کرتے ہیں مگر ان کی عملی زندگی کہ وہ بیماری و صحت، پانچ روپیہ کے نوٹ اور سو روپیہ کے نوٹ یہاں تک کھرے اور کھوٹے روپیہ میں خوب تمیز کرتے ہیں۔ وہ سائنس کے اکتشافات اور حقائق کو تو محض کہانی اور وہم کہیں گے مگر وہ مقررہ وقت پر گاڑی پکڑتے ٹکٹ خریدتے اور ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ بنیئے کی بد دیانتی پر انہیں غصہ بھی آتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں ماں بہن اور بیوی میں فرق خوب سمجھتے ہیں مگر دنیا کو وہم اور حلقۂ خیال، خیال کرتے ہیں۔ اس پر بھی اگر وہ اپنی ہستی اور کائنات کی موجودگی میں شک کریں تو ایک بات قطعی اور یقینی ہوگی کہ ان کا دُنیا کی ہستی میں شک کرنا بھی شکیہ ہوگا۔ یقین نہ ہوگا کیونکہ:۔

'You cannot doubt that you doubt;

اس لئے بُدھ مذہب کے پیرو دنیا کے بارہ میں ایک مہمل بات کہتے ہیں۔ کہ "دنیا میں کوئی سچائی (یا حقیقت) نہیں سوائے اس کے کہ دنیا میں کوئی سچائی (یا حقیقت) نہیں"۔ کوئی شخص یہ شک نہیں کر سکتا کہ وہ شک کرتا ہے بلکہ اپنے شک کا اسے یقین ہونا چاہیئے ورنہ اس کا شک فی الحقیقت شکیہ امر ہوگا کیونکہ وہ خود اس وہمی اور شکی دنیا کا فرد یا خود شک ہے اور شک سے یقین کا پیدا ہونا ناممکن ہے پس کائنات کا وجود قطعی اور یقینی ہے۔ الحمدللہ کا جملہ یہ بتاتا ہے کہ کائنات ہیں۔ جو کچھ ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ دنیا میں خوبصورتی، صداقت اور نیکی کا وجود ہے اور اس حقیقت کا کوئی سلیم العقل انسان انکار نہیں کر سکتا یا انکار کر کے مندرجہ بالا واقعات کی بناء پر سنجیدہ انسان کہلا نہیں سکتا۔

دہریت کی تردید

ہمارا تیسرا یقین یہ ہے کہ انسان اس کائنات کا جس میں ہر جگہ حُسن کی اس قدر کثرت، حکمت اور فلسفہ کی فراوانی اور نیک لوگوں کے نیک اعمال کی پُرمسرت دُنیا آباد ہے ہم اس کے پیدا کرنے پر قادر نہیں کائنات خود خلق ہے خالق نہیں، رہی انسان کی سائنٹیفک ایجادات اور مصنوعات جو اسے ہستی باری کے بارہ میں شک ڈالتی ہیں۔ یہ ایجادات صرف انکشافات (Discoveries) ہیں۔ سائنسدان اشیاء پر سے صرف پردے اٹھاتا ہے اور ہر شے کی ایک شکل کو نیچر کے قوانین کے ماتحت دوسری شکل دیتا ہے۔ نیز قوانینِ قدرت نے اس کے ہاتھ نہایت مضبوطی سے باندھ رکھے ہیں گویا وہ ان پر حاکم نہیں بلکہ ان کے ماتحت ہے ان کے خلاف وہ شمہ بھر ادھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ قدرت نے شروع دنیا سے یہ چیلنج ہر زمانہ کے فلاسفروں اور سائنسدانوں کو دے رکھا ہے ع

بنا سکتا نہیں اِک پاؤں کیڑے کا بشر ہرگز

اب اگر انسان نے اس عالم کو پیدا نہیں کیا تو کیا اس عالم نے انسان کو پیدا کیا ہے؟ یہ خیال صرف مذاقِ محض ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا خود بخود بن گئی اس پر یہ اعتراض ہوگا کہ دنیا نے اپنے آپ کو پیدا کرنے کی خواہش کیوں کی؟ جب دنیا کا ارادہ اور تمنا اس کے بننے سے پہلے موجود نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی تو دنیا اپنے آپ کیسے بنی؟ انسان کی صنعت اور خدا کی خلقت میں قدرِ مشترک پیشتر کا ارادہ اور خاکہ ہے۔ اس کائنات میں جو حُسنِ تنظیم اور معقولیت ہے وہ کسی پیشتر کے ارادہ کو ظاہر کرتا ہے کیا محض اتفاق حُسنِ نظم اور قوتِ تعقل کو پیدا کر سکتا ہے جو دنیا کے ہزارہا واقعات کی تنہا ذمہ دار ہے۔ پس کائنات کی مشینری ایک حکیم خالق کو ثابت کرتی ہے ورنہ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ انسان

خود تو عقلمند کہلاتا ہے مگر جس نے اسے پیدا کیا وہ اتفاق یا اندھا قانون ہے۔

ہستی باری تعالیٰ پر دوسری قسم کے دلائل

الحمدللہ کی تشریح میں پہلے بتایا جا چکا ہے کہ حمد کے اندر حُسن، صداقت، حکمت نیکی کا مفہوم موجود ہے جس پر کائنات کا مطالعہ گواہ ہے۔ سائنسدان اپنے وسیع علم اور تجربات کی بنا، پر تسلیم کرتا ہے کہ دنیا میں حُسنِ نظم، معقول ترقی اور عقلی اِرتقاء موجود ہے۔

"There is order, there is beauty, there is rational growth, development and rational evolution;

سائنس ایک مُنظّم اور منضبط علم ہے ورنہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ غیر منظم عالم سے منظم اور منضبط علم پیدا ہو اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ سورج، زمین، سیاروں اور ستاروں کی منظم اور باقاعدہ گردش ہے اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظم اور باقاعدگی ان کے اندر کہاں سے آئی اس دلیل کو آسانی سے آپ یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک کمرہ میں بہت سی گھڑیاں موجود ہیں اور وہ سب کی سب ایک ہی وقت بتاتی ہیں ان کو دیکھ کر ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ سب کی سب گھڑیاں باہمی صلاح اور مشورہ سے اپنے آپ کو ٹھیک رکھتی ہیں دوسرا کہتا ہے نہیں ان کو کیا سمجھ ہے کوئی انسان ان کا وقت ملاتا رہتا ہے تیسرا کہتا ہے نہیں یہ بھی امکان سے باہر ہے پیشتر سے ان کو کسی دانا کاریگر نے ایسا بنایا ہے کہ ان کی چال میں فرق نہیں آتا۔ گھڑیاں گو بڑی اور چھوٹی ہیں مگر وقت سب کا ایک ہے۔ بنانے والے نے سب کو ایسی نسبتی چال سے بنایا ہے کہ ان کے وقت میں فرق نہیں پڑتا۔ یہ ظاہر ہے کہ ان تینوں میں سے تیسرے آدمی کا خیال صحیح ہے بس یہ حُسنِ موزوں۔ نظمِ معقول اور ارتقاءِ عقلی جو کائناتِ عالم کی ہر چیز میں نظر آتا ہے وہ پیشتر سے کسی عقلمند حکیم کا اندازہ کردہ

ہے۔ اس دلیل کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے۔ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ۔ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (۳۶:۳۸،۴۰)

"سورج اپنے دائرہ گردش پر چلتا ہے یہ اندازہ غالب حکمت والے کا مقرر کردہ ہے نہ سورج یہ کرسکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کبھی دن کے اوپر دوڑ سکتی ہے ہر ایک جرم اپنے دائرہ گردش میں تیزی سے گھوم رہا ہے۔" یہ حسنِ دل پذیر یہ نظمِ معقول اور ارتقاءِ عقلی صرف اجرام کبیرہ سورج اور چاند وغیرہ میں ہی موجود نہیں بلکہ ہر قدرتی شئے میں یہ نظمِ کار اور نظام اوقات موجود ہے۔

اس نظم کار کی ایک اور مثال لیجئے۔ اگر یہ سوال ہو کہ نمکین سمندر کی مچھلیاں دریائی مچھلیوں سے زیادہ نمکین کیوں نہیں ہوتیں۔ حالانکہ سمندر کا پانی سخت کھاری اور دریا کا پانی میٹھا ہوتا ہے عام اصول تو یہ ہے کہ جو چیز جہاں پیدا ہوتی ہے وہ اپنے اردگرد کے مادہ سے ضرور متاثر ہوتی ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں

ہر چہ در کانِ نمک رفت نمک شد

مگر وہ مچھلی جو کھارے سمندر میں رہتی ہے اس کے اعصاب جو گوشت تیار کرتے ہیں وہ مرغی کے اعصاب سے زیادہ نمکین نہیں ہوتے۔ نہ صرف مچھلیوں بلکہ دوسرے بحری جانوروں کے خون میں نمک قریباً اتنا ہی جذب ہوتا ہے جتنا اور جانوروں میں قیامِ زندگی کے لئے ضروری ہوتا ہے نمکین پانی کی مچھلی اور شیریں پانی کی مچھلی میں فرق اس لئے نہیں ہوتا کہ ہر ایک زندہ جانور جو کچھ کھاتا ہے اس میں سے اسی کو انتخاب کرتا اور اسی قدر جزوِ بدن بناتا ہے جو ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح اجرام سماوی کی ایک تقدیر اور حد بندی ہے اسی طرح ہر قدرتی شئے کے لئے ایک حد اور اندازہ مقرر ہے۔ قرآن مجید اس دلیل کو یوں بیان فرماتا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا (۱۲:۳۵) دریاؤں کو تو دیکھو دونوں ایک جیسے نہیں ایک نہایت ہی شیریں ہے اور اس کا پانی نہایت خوشگوار ہے اور دوسرے کو دیکھو تو سخت نمکین اور کھاری ہے مگر دونوں میں سے تم لذیذ گوشت کھاتے ہو" دو مختلف مزہ کے پانیوں نہایت شیریں اور بدرجۂ غایت تلخ پانی میں رہنے کے باوجود مچھلی میں ایک خاص تناسب شیرینی اور نمک موجود ہے۔ جو حیوانی جسم کی پُر حکمت مشینری اور اس کے افعال میں ایک معقول ربط و ضبط ثابت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر اس قسم کے بیسیوں دلائل قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ سائنس کا کوئی شعبہ نہیں جس میں سے کئی ایک مثالیں اس میں بیان نہیں کی گئیں۔ اور ان سے ایک علیم و حکیم ہستی پر استدلال نہیں کیا گیا جس طرح ایک مثال علم ہیئت (Physics) سے استدلال پیش کی دوسری حیوانی تشریح الابدان (Biology) سے پیش کی گئی اسی طرح ایک دلیل علم الانسان (Human Psychology) سے دی جاتی ہے۔ کسی زمانہ میں سائنسدانوں کا خیال تھا کہ مادہ کُلہم مردہ ہے اور روح الگ ایک حقیقت ہے لیکن اب مردہ اور زندہ دو طرح کا مادہ تسلیم کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ زندہ مادہ مردہ مادہ سے ہی پیدا ہوا ہے اور یہ اس کا ارتقائی درجہ ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ اب مردہ مادہ سے زندہ مادہ پیدا ہونے کی کوئی مثال نظر نہیں آتی بلکہ زندگی سے زندگی پیدا ہوتی ہے۔

"In all probability, the actual conditions under which life was evolved in the past have disappeared with no likelihood of appearance. The origin of life remains a mystery, all forms proceeding as far as we know from previous forms, and that we have no evidence that any form of life is being evolved from non-living material."

(*Everyman's Encyclopaedia,* under *Life*)

"وہ حقیقی اسباب جن کے ماتحت ماضی قدیم میں حیات ارتقاء پذیر ہوئی وہ کلیتہً معدوم ہوگئے ہیں اس سے ملتی جلتی بھی کوئی شکل اب باقی نہیں رہی اس لئے حیات کی حقیقت معمہ بن گئی ہے جہاں تک ہمارا علم ہے ہر وجود کسی دوسرے سابقہ وجود سے پیدا ہوتا ہے اور ہمارے پاس اس امر کی کوئی شہادت نہیں کہ حیات کی کوئی شکل مردہ مادہ سے ارتقاء پذیر ہوئی ہو۔"

حیات کے بارے میں سائنسدانوں کا خیال آپ سُن چکے۔ اب قرآن مجید کی دلیل سے سُنیئے۔

"كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔" (۲: ۲۸)

اِس آیت میں کئی ایک نکات قابلِ غور ہیں۔

پہلا نکتہ:۔ عربی زبان کے قاعدہ کی رُو سے كَيْفَ کا خطاب یا سوال ہمیشہ ذوی العقول یعنی عقل رکھنے والی ہستی سے ہوتا ہے جس کے معنی کیفیت طلب کرنا وجہ بیان کرنا یا دلیل طلب کرنا ہوتا ہے۔ جو درحقیقت اپنے غور و فکر کو کام میں لانا ہوتا ہے اور یہ صرف انسان سے مختص ہے پھر طلب دلیل بھی عاقل

و بالغ سے ہوتی ہے نا سمجھ اور بچہ سے نہیں ہوتی۔

دوسرا نکتہ: زندگی کی کیفیت اگر بتا سکتے تو علماء اور فلاسفر ہی بتا سکتے تھے اور یہی لوگ ہیں جو زیادہ تر خدا کی ہستی سے منکر ہوتے ہیں پس قرآن مجید انہی عقلمند علماء سے سوال کرتا ہے یا زندگی کی کیفیت پوچھتا ہے مگر کیفیت پوچھنے میں۔

تیسرا نکتہ: یہ ہے کہ وجود اور حیات کی تعریف نہیں پوچھی گئی بلکہ اس کے ظہور و شہود ہونے کی کیفیت پوچھی ہے کیونکہ یہ فلاسفہ کی ایسی بحثیں ہیں جن میں وجود کی تعریف نہیں ہوتی بلکہ اس کا بیان ہوتا ہے ان لوگوں کا مذہب یہ ہے:۔

"It can be described but not defined."

"وجود و حیات کی تعریف نہیں کی جا سکتی بلکہ ان کا ذکر اور بیان ہو سکتا ہے۔"

گویا ان دہریہ علماء سے قرآن مجید ان کی دہریت اور انکار خدا کی کیفیت دریافت کرتا ہے اور وہ بھی ان کی ایک خاص حالت کو یاد دلا کر۔

چوتھا نکتہ:۔ یہ ہے کہ منکر کے ذمہ بار ثبوت نہیں ہوتا بلکہ قائل کے ذمہ ہوتا ہے اس لئے قرآن مجید یہ نہیں فرماتا کہ خدا کے نہ ہونے پر دلائل دو بلکہ دلائل خود دیتا ہے مگر ان دلائل پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

پانچواں نکتہ:۔ ہر شخص خواہ وہ دہریہ ہو یا ہستی باری تعالیٰ کا قائل اس پر ایک خاص حالت گذر چکی ہے یعنی اس وقت کہ تم مُردہ تھے اس نے تمہیں زندہ کیا۔ مُردہ سے مراد یہاں لاش اور میّت نہیں بلکہ مادہ کی وہ حالت ہے جو مردہ Lifeless کہلاتی ہے اس مردہ مادہ سے تمہیں زندہ کر دیا (Living matter) بنا دیا گویا یہاں سے زندگی کی ابتدا ہوئی۔

چھٹا نکتہ:۔ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ میں حرفِ تعقیب فا ہے (فَاَحْيَاكُمْ)، جو ثُمَّ کے بالمقابل استعمال ہوا ہے یعنی دو دفعہ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ

ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ میں ثُمَّ آیا ہے اور اس سے پہلے صرف ایک دفعہ فَاَ ہے فَاَ اور ثُمَّ دونوں حرفِ تعقیب کہلاتے ہیں یعنی بعد کے زمانہ کو ظاہر کرتے ہیں اور دونوں کا ترجمہ پھر ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک فوراً بعد کے لئے اور دوسرا ایک زمانہ بعد کے لئے آیا ہے اس صورت میں وَکُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاکُمْ کے معنی ہوں گے تم مردہ تھے فی الفور ہم نے زندہ کر دیا۔ گویا پہلی زندگی دفعۃً واحدہ پیدا ہوئی ہے اس نے ارتقاء کی لمبی چوڑی منزلیں طے نہیں کیں کیونکہ ارتقاء کی منازل وہ شئے طے کرتی ہے جس کے اندر ترقی کا مادہ کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہو اور وہ آہستہ آہستہ ظہور پذیر ہوتا جائے مگر مردہ مادہ کے اندر حیات کا شائبہ موجود نہ تھا پس پہلے پہل زندگی یا حیات دفعۃً واحدہ پیدا ہوئی گو مادہ پر اس حالت تک پہنچنے سے قبل عرصہ دراز گذر چکا ہو۔ قرآن مجید یہ فرماتا ہے کہ اس امر پر غور کرو کہ مردہ مادہ میں حیات اور زندگی اپنے آپ کہاں سے آگئی؟ صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں کہ ”جہاں تک ہمارا علم ہے ہر وجود کسی پہلے موجود سے وجود پذیر ہوتا ہے۔ اور ہمارے پاس اس امر کی کوئی شہادت نہیں کہ حیات کی کوئی شکل مردہ مادہ سے ارتقاء پذیر ہوئی“ کیونکہ مردہ سے مردہ ہی پیدا ہوگا مردہ سے زندہ پیدا نہیں ہو سکتا اسے تم معمہ اور راز کہہ کر ٹال نہیں سکتے پس زندگی یقیناً کسی زندہ ہستی نے پیدا کی ہے اور وہی اللہ ہے۔

نکتہ ہفتم:۔ اس کے بعد فرماتا ہے ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ پھر تمہیں مارتا ہے پھر زندہ کرتا ہے۔ قرآن مجید کی واضح تصریح کی بناء پر موت اور حیات تین حالتوں پر مشتمل ہے مثلاً اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا (۵۷ : ۱۷) اللہ تعالےٰ بادل سے پانی اتارتا ہے اور اس کے ساتھ مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے، گویا اس سے پہلے زمین مردہ تھی بارش سے زندہ ہوگئی۔ اس آیت میں زمین پر روئیدگی اور نباتات کے نہ ہونے کا نام موت ہے اور اس کا سرسبز ہو جانا حیات ہے پس زندگی کی پہلی شکل نباتات ہے یا زندگی سے مراد یہاں قوتِ نامیہ کا ظہور ہے دوسری قسم

کی موت وحیات کے متعلق فرمایا یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ ھٰذَا وَکُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا (۱۹: ۲۳) اے کاش میں اس (دردِ زہ) سے پہلے بے حس ہو جاتی یعنی دُکھ دَرد کا احساس مجھے نہ ہوتا۔ گویا زوالِ قوتِ حاسہ موت ہے یا کچھ محسوس نہ ہونا جیسے بے ہوشی وغیرہ ہو جانا اور دُکھ سُکھ محسوس ہونا یہ زندگی ہے یا حیوانی زندگی کا خاصہ ہے۔ تیسری قسم کی موت وحیات کے بارہ میں فرمایا اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ (۶: ۱۲۲) اور اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (۲۷: ۸۰) کیا وہ جو مردہ ہو اُسے ہم زندہ کر دیں، تو مُردوں کو سنا نہیں سکتا۔ یہاں مردہ اور زندہ سے جاہل اور دانا مراد ہے جن میں عقل اور سمجھ آگئی وہ زندہ ہیں ان تین مذکورہ بالا آیات میں تین طرح کی موت اور زندگی کا ذکر ہے۔

نکتہ ہشتم: ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ کے معنی ہیں پھر آہستہ آہستہ زندگی کی ایک ارتقائی شکل یعنی قوتِ ادراک واحساس پیدا ہو جاتی ہے جسے Consciousness Self-consciousness کہتے ہیں جس میں 'انا' یعنی 'مَیں ہوں' کا ادراک پیدا ہوتا ہے جو نباتات اور درختوں میں نہیں ہوتا مگر حیوانات میں ترقی پاتا جاتا ہے اور انسان میں تکمیل پذیر ہو جاتا ہے۔

نکتہ نہم: اس کے بعد فرمایا ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ آہستہ آہستہ انسان کے اندر عقلِ سلیم اور روحانی زندگی کا نشو ونما ہوتا ہے اور رُوحِ انسانی خدا شناسی اور معرفت کا سبق حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہے۔

نکتہ دہم: آیت کا خاتمہ اس جملہ پر ہوتا ہے ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ گویا اس کے بعد نہ کوئی موت ہے اور نہ واپسی (جیسا کہ آریوں کا خیال ہے) تا یہ ظاہر ہو کہ مُردہ مادہ سے زندہ ہو کر روح آگے ہی آگے ترقی کرتی چلی جاتی ہے معقول ارتقاء Rational Evolution کا تقاضا یہ ہے کہ جس خوبی کو کوئی چیز

حاصل کر لیتی ہے وہ اسے واپس نہ دے اور کائنات کا یہ ایک عام اصول ہے اور مسئلہ ارتقاء کا اصل اصول یہ ہے کہ عالم بحیثیت مجموعی آگے کی طرف دوڑ رہا ہے۔ معرفت الٰہی انسانی روح کا منتہاء مقصود ہے جس سے واپسی ناممکن اور نامعقول ہے۔ ہماری ابتدا مردہ مادہ ہے اور انتہاء حیاتِ کاملہ ہے جس میں معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے سادہ زندگی۔ احساس۔ ادراک اور تعقّل اس کی ترقی کے زینے ہیں۔ انسان کے اندر اَن دیکھے اور اَن بُوجھے خدا کا تصور پیدا ہو جانا بھی ایک بہت بڑا اعجاز ہے اس تخیل اور تصوّر کی بنا عقلِ انسانی نہیں بلکہ وحیِ الٰہی یا خود خدا ہے۔ اس سارے سلسلۂ موت و حیات میں ایک منکرِ خُدا کے لئے کئی ایک قابلِ غور باتیں ہیں:۔

۱۔ مُردہ مادہ سے زندہ مادہ کیونکر پیدا ہوا۔ موت سے زندگی کیسے پیدا ہوئی؟

۲۔ سادہ زندگی (نباتات) میں احساسِ دُکھ اور سکھ کیسے پیدا ہوا؟ اس میں اَنا، یا 'مَیں' کا تخیل کہاں سے آیا؟ اپنے سے الگ دوسرے کا تصور کیسے آیا؟

۳۔ اس میں علمِ حساب۔ استدلال اور تعقّل کیونکر پیدا ہو گیا۔

۴۔ روحِ حیات میں مذہبی حس کیسے پیدا ہوئی یا اپنے سے باہر اپنے بنانے والے کا خیال کہاں سے پیدا ہوا؟ جس نے اسے حیوانِ محض سے باخدا انسان بنا دیا اور محیّر العقول پیش خبریاں کرنے اور معجزات دکھانے لگا۔

۵۔ نہ صرف موت سے زندگی کا ہست ہونا ذاتِ باری تعالیٰ یا ایک حی و قیوم خدا کو ثابت کرتا ہے اور اس کے اندر ادراک و شعور و تعقّل معرفتِ وجودِ باری تعالیٰ پر دال ہے بلکہ موت اس سے بڑھ کر خدا کی ہستی کی دلیل ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصولِ ارتقاء کی رُو سے ہر چیز آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر انتقال اور موت جسے ہم حیوانی زندگی میں ہر جگہ دیکھتے ہیں ایک نامرغوب اور انسانی روح کے لئے نہایت ناپسندیدہ شئے ہے اور کوئی ذی حیات موت کے منہ میں جانا نہیں چاہتا بلکہ اس سے بچنے

کی ہزار ہا تدابیر بلکہ مکر و حیل کرتا ہے بالآخر چار و ناچار اس سے دوچار ہوتا ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ دوسری کوئی ہستی اسے اس طبعی مکروہ دروازہ سے بجبر و اکراہ گزارتی ہے اور اس دروازہ سے گذرے بغیر کوئی اگلی منزل میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ گویا اس موت میں ہی (گو وہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے) اس کی مزید ترقی اور بہتری ہے اگرچہ اپنی اس فلاح و بہبود کا اسے علم نہیں اور نہ اس کی طبعی خواہش ہے پس جبر و اکراہ جو بظاہر مرغوب سے نامرغوب کی طرف مگر اصل میں نقص سے کمال کی طرف لے جاتا ہے یہ ہر ذی رُوح کے اوپر علیم کل رب العالمین کے وجود کو ظاہر کرتا ہے جو ہر نوعِ مخلوق کو طوعاً و کرہاً اس کے کمال کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ فلسفۂ موت پر بقیہ بحث ہم جملہ رَبّ العالمین کے ماتحت کریں گے اور اس کے ساتھ ہی علماءِ نفسیات کے ہستی باری تعالےٰ پر شکوک کا ازالہ بھی کریں گے۔

جملہ الحمد للہ سے عقیدۂ شرک کی تردید

قرآن مجید کی آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا۔ سب تعریفیں اور صفاتِ حسنہ اللہ کے لئے خاص ہیں جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ حکومت میں اس کا کوئی شریک ہے اور نہ ذلّت سے بچانے والا اس کے سوا مددگار ہے۔ اسی کی تکبیر کا نعرہ بلند کرو۔ (۱۷: ۱۱۱)

یہ آیت قرآن مجید کی سورۃ کہف سے فوراً پہلے آتی ہے اس ساری سُورۃ میں اہلِ کتاب مشرکین سے خطاب ہے چنانچہ اس سورت کی ابتدا ہی اس آیت سے کی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا اس اللہ کی ہی سب حمد اور کامل تعریف ہے جس نے اپنے بندے پر ایسی کتاب نازل فرمائی جس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔ اس سورت کی ابتدائی اور آخری دس آیات کو

حسبِ ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فتنۂ دجّال سے بچنے کے لئے تلاوت کرنا چاہیئے۔ دجّال درحقیقت خدا کی ہستی کا منکر ہے مگر ان آیات میں اُسے خدا کا بیٹا تجویز کرنے والا بتایا گیا ہے۔ جو قوم کسی اپنے بزرگ کو خدا کا بیٹا مانتی ہے ظاہر ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر بھی ایمان رکھتی ہے اسے دجّال یا دہریہ کہنا بظاہر درست معلوم نہیں ہوتا۔ مسلمان اگر خدا کو واحد مانتے ہیں تو اہلِ کتاب باپ، بیٹا۔ روح القدس تین خدا مانتے ہیں۔ ان تینوں میں بہرحال خدا باپ پر بھی اعتقاد موجود ہے۔ اس لئے ان کو کم از کم منکرینِ خدا تو نہیں کہہ سکتے اور ہمارے علماء نے ان کو مشرکین سے الگ۔ اہلِ کتاب نام دیا ہے مگر اس تضاد کو سمجھنے کے لئے کسی قدر غور و فکر کی ضرورت ہے جس کی طرف علامہ مرحوم اکبرالہ آبادی کا ایک لطیفہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

ایک لطیفہ علامہ موصوف ایک مرتبہ سیتاپور (یوپی) تشریف لے گئے وہاں ان کا بیٹا کلکٹر ضلع تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر معززینِ شہر کا ہجوم ان کے استقبال کے لئے جمع ہوگیا۔ دوسری طرف ایک بنیا سیٹھ بھی اپنے کسی کام سے اسٹیشن پر پہنچا۔ اس نے اکبرالہ آبادی کے گرد لوگوں کا انبوہ دیکھ ایک شخص سے پوچھا یہ کون ہیں؟ اس نے کہا اکبرالہ آبادی! یہ سن کر سیٹھ صاحب لاپروائی سے منہ موڑ کر چل دیئے تو اس نے کہا سیٹھ صاحب یہ آپ کے کلکٹر صاحب کے باپ ہیں!! اس پر سیٹھ صاحب چونکے اور یہ کہتے ہوئے لوٹ آئے۔ ہیں! اُن کے باپ ہیں! اُن کے پتا ہیں!! اور بڑے جوش کے ساتھ آگے بڑھ کر اکبر سے ہاتھ ملایا۔

کسی صاحب نے سیٹھ صاحب کی بے رخی اور تپاک کا راز اکبرالہ آبادی سے کہہ دیا تو انھوں نے فرمایا اللہ میاں ایک مرتبہ یورپ تشریف لے گئے فرشتوں نے لوگوں سے ان کا تعارف کرانا چاہا، ملائکہ نے صاحب لوگوں کو بتایا

یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے زمین بنائی آسمان بنایا صبح خنداں اور موسم گل بنایا۔ صاحب لوگ لاپروائی سے ہوں ہاں کرتے رہے ملائکہ نے بات کو زیادہ مؤثر کرتے ہوئے کہا انھوں نے ہی آدم اور حوا تم سب کے ماں باپ کو پیدا کیا۔ صاحب بہادر ان خشک باتوں سے تنگ آکر چلنے لگے تو ملائکہ نے بالآخر کہا کہ یہ آپ کے خداوند یسوع مسیح کے باپ ہیں جس پر صاحب بہادر چونکے اور کہا او اُن کا باپ ہے۔ ویل اُن کا باپ ہے۔ یہ لوگ باپ کی تعظیم بیٹے کی وجہ سے یا واسطہ سے کیا کرتے ہیں اور خدا باپ کی بجائے خدا بیٹا پوجا کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہ حالت اس وقت یورپ کی ہے کہ وہ خدا باپ کو قابلِ ذکر نہ سمجھ کر بیٹے سے دعائیں مانگتے ہیں، اس پر قرآن مجید فرماتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا ۔ سب صفاتِ حسنہ اور کُل خوبیاں اس ذات میں موجود ہیں جس کا نام اللہ ہے اور اس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۹۱، ۹۰، ۱۹) قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں گے اور زمین شق ہو جائے گی اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر گر جائیں گے کیونکہ یہ خدا کا بیٹا پکارتے ہیں۔ خدا کا بیٹا پکارنا اس قدر خطرناک کیوں ہے؟ فی الحقیقت خدا کا بیٹا بنانا باپ کی وفات کا اعلان ہے بیٹے کی ضرورت صرف اسی مخلوق کو ہوتی ہے جنھیں آج یا کل مرنا ہو اس لئے کہ بیٹا کی تمنا دراصل غیر کی تمنا نہیں بلکہ اپنے آپ کو چاہنے کی تمنا ہے۔ چونکہ ہم اپنے آپ کو بے حد چاہتے ہیں اس لئے مجبوراً اپنے نہ رہ سکنے کی صورت میں بیٹا چاہتے ہیں یا اپنے قائم مقام کی تمنا کرتے ہیں۔ کیونکہ بیٹا ہماری کمی کو پورا کرتا ہے۔ نقص اور کمی یہ ہے کہ ہمیں خود زندہ نہیں رہنا۔ یہ کوئی مذاقیہ کلام نہیں آپ مسیحی تھیالوجی (الٰہیات) کو پڑھیئے اس میں بعض صفات باپ سے مخصوص ہیں اور بعض بیٹے سے مختص ہیں۔ مثلاً

عدل کی صفت باپ میں ہے۔ رحم کی صفت بیٹے میں ہے باپ لوگوں کے اعمال کا بدلہ دے کر انصاف کرنا چاہتا ہے۔ بیٹا رحم کے جذبہ سے متاثر ہو کر مجسّم ہوتا ہے باپ غیر مجسّم اور بے رحم ہے۔ جہاں خدا کا بیٹا بننے کا خیال آیا باپ کی حمد اور تعریف اڑ گئی۔ اس کمزور عقیدہ کی وجہ سے خدا باپ پر سے یورپ کا ایمان ڈھیلا ہو گیا کیونکہ انسان طبعاً اپنے معاملہ میں عدل نہیں چاہتا بلکہ رحم چاہتا ہے۔ اس لئے وہ طبعاً اُسی خدا کو پکارتا ہے جس میں رحم ہے۔

۲۔ صفتِ عدل صفتِ رحم سے ادنیٰ ہے۔ باپ کا عدل کسی دوسرے کا لحاظ تو کیا کرے گا اس نے اپنے بیٹے کو بھی جو اسی کی شکل اور صورت تھا بدلہ لئے بغیر نہ چھوڑا۔ قرآن مجید کے کمالات میں سے یہ بھی ہے کہ سورۃ کہف کو جس میں خدا کا بیٹا ہونے کی کامل تردید موجود ہے الحمدللہ سے شروع کیا اور یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حمد میں تین امور بطور خلاصہ موجود ہیں۔ حُسن۔ صداقت، نیکی، خدا باپ ہے یا خدا ہمارا باپ ہے کا تصوّر تو پیارا اور خوبصورت تصوّر ہو سکتا ہے لیکن خدا بیٹا ہے یہ ایک کمتر تصوّر ہے۔ جو باپ اور بیٹا دونوں کی خوبصورتی کو کھو دیتا ہے اور باپ کو کمزور اور ناقص اور معطل خدا قرار دیتا ہے۔ بلحاظِ صداقت تین خداؤں کا تصوّر ہر ایک خدا کو ناقص خدا قرار دیتا ہے۔ پھر تین کو ایک سمجھنا۔ ایک دوسرے کو باپ بیٹا بھی کہنا اور پھر تینوں کو ازلی ابدی کہنا۔ باپ کو عِلّت اور بیٹے کو معلول کہنا اور پھر علّت و معلول کو ایک کہنا باپ کو صرف خدا اور بیٹے کو خدا اور انسان کا مرکب کہنا یہ تمام عقاید از روئے عقل باطل ہیں اور نہ ان باتوں کی بُنیاد جناب مسیح کے اپنے کسی قول پر ہے مسیح نے کسی جگہ نہیں کہا کہ میں ہی خدا کا بیٹا ہوں وہ خدا کا بیٹا ہونے میں سب نیک لوگوں کو شامل کرتے ہیں۔

نیکی کے زاویہ نگاہ سے مسیحیّت :۔ جناب مسیح کے سیدھے سادے

مذہب کو پیچ دار معمہ بنانے والی بنیادی غلطی جس کی وجہ سے ان پر خدا کا غضب نازل ہوا قرآن مجید نے مندرجہ ذیل غلطی بتائی ہے۔ ذَالِكَ جَزَاءُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيَاتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا (۱۸:۱۰۶) انھوں نے میری آیات اور رسولوں کا مذاق اڑایا۔ الہامی کتب اور رسولوں کا انکار درحقیقت اللہ تعالےٰ کا انکار ہے چنانچہ موجودہ عیسائی مذہب نے پولوس کی تقلید میں انبیاء کی شریعت کو 'معاذ اللہ' لعنت قرار دیا ہے (نامۂ گلتیون ۳ : ۱۳ اور رومیوں ۷ : ۷ وغیرہ) اور جناب مسیح کو شریعت سے آزاد کرنے والا بتایا۔ یہ ظاہر ہے کہ قانون اور شریعت سے انبیاء کی غرض لوگوں کو نیک بنانا یا کم از کم لوگوں کو نیکی کی تعلیم دینا تھا۔ شریعت سے آزادی کے معنی لاقانونیت، بے راہ روی اور انبیاء سے بغاوت ہے۔ ایک آزاد دل سے بُرے جذبات اسی طرح ٹپکتے رہتے ہیں جس طرح ایک بوسیدہ جھونپڑی کی چھت سے بارش کا پانی ٹپکتا رہتا ہے گناہ میں آزادی کے لائسنس سے فائدہ اٹھا کر ڈاکٹر فرائیڈ نے اپنا فلسفۂ احتباسِ جذبات (Repression) اخذ کیا ہے یعنی کسی جذبۂ شہوانی کو روکنا انسان کی صحت پر بُرا اثر ڈالتا ہے اس لئے جب بھی کوئی جائز و ناجائز خواہش انسان کے دل میں پیدا ہو اسے فوراً پورا کر لینا چاہیئے۔ اور اسی لائسنس گناہ کے رسیّا یورپ کے شراب فروش دنیا میں our Lord's whisky کا اشتہار دیتے ہیں۔ یعنی "ہمارے خداوند کی معجزانہ شراب" اور پھر اس معجزانہ اور اسی مقدس شراب کے نشہ میں ان عیش پرستوں نے زانیہ عورت کو مسیح کے سزا نہ دینے کے واقعہ سے انبیاء کی تعلیم کے خلاف زنا کا ناقابلِ سزا ہونا سمجھ لیا۔ دُوسروں کے مال و دولت اور ملک پر قبضہ کرنے کے لئے حواریوں کا پرائے کھیت سے بالیں توڑنا اور مسیح کا اس جرم کی حمایت کرنا کافی ثبوت سمجھ لیا گیا جھوٹ اور باطل پروپیگنڈا کرنے کے لئے سینٹ پال کا یہ

فتویٰ موجود ہے۔

" ہر طرح سے جھوٹ یا سچ سے مسیح کی منادی کی جاتی ہے۔" (نامۂ فلپیوں ۱:۱۸)

شراب، زنا، دوسروں کے غصب حقوق اور جھوٹ یہ ساری برائیوں کی جڑ ہے جو خدا اور خدا کے رسولوں کی شریعت کا انکار کرنے سے پیدا ہوتے ہیں جس قوم کے یہ اعمال ہوں ان کی تعلیم اور عقیدہ دونوں خدا کی حمد کے خلاف ہیں۔ اور ان کا تہذیب و تمدن ہلاکت کے گڑھے پر کھڑے ہیں۔ قرآن مجید اس کا علاج یا نجات کی راہ اللہ تعالیٰ کی بے نقص حمد کرنا قرار دیتا ہے۔ ان کے موجودہ عقائد خدا کی حمد کے خلاف ہیں وہ ذات جو ہمہ صفت موصوف ہے حُسن صداقت اور نیکی کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بالمقابل عقیدہ ابن اللہ انسان کے فطرتاً گنہگار اور محتاج کفارہ ہونے کو ثابت کرتا ہے اور یہ ماننا کہ انسان فطرتاً یا وراثتہً گنہگار ہے انسان کے دل کی قوت کو کہ وہ گناہ کا مقابلہ کر سکتا ہے کمزور کرتا ہے اور شیطان کی طاقت اور قوت کو انسان کے دل پر محیط کرتا ہے۔ اس عقیدۂ ابن اللہ کی بناء پر گویا خدا کی قدرت اور شیطان کی طاقت کا مقابلہ ہے جس میں خدا ایک شکست خوردہ رُوح اور شیطان ایک فتح نصیب جرنیل نظر آتا ہے کیونکہ جناب مسیحؑ سے پہلے خدا نے تمام انبیاء علیہم السلام کو شیطان یا گناہ کا مقابلہ کرنے کے لئے شریعت دی جو بالآخر ناکام ثابت ہوئی اور شیطان کا بول بالا رہا۔ اس کے بعد خدا کا بیٹا آیا شیطان نے اس کو بھی پچھاڑ دیا اور اس کے خاص شاگردوں میں گھسا رہا۔ اور گناہ کم نہ ہوا بلکہ زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا۔

سورۂ کہف کی ابتداء الحمد للہ سے کر کے اللہ تعالےٰ نے یہ بتایا ہے کہ عقیدۂ نصاریٰ کے خلاف اس کتاب کا ایک مقصد دُنیا میں خدا کی حمد کو قائم کر کے انسان کو گمراہی اور ضلالت سے بچانا ہے۔ اور انسانیت کا جوہر حقیقی کہ وہ بدی کا مقابلہ کر کے دُنیا میں نیکی کی بنیادوں کو مضبوط کرے پیدا کرنا ہے خدا

کے بیٹے کا عقیدہ خواہ وہ بیٹا مسیحؑ ہو، کرشن ہو یا رام ہو اللہ تعالیٰ کی حمد کو بٹہ لگاتا ہے۔

توحید کامل مسئلہ ابن اللہ اور اوتار خداوندی

ایک خدا کے ماسوا دوسرے خدا کا ہونا حمد الٰہی کے خلاف ہے۔ یہ امر کسی قدر محتاج تشریح ہے مسیحی لوگ عقیدۂ ابن اللہ کی رُو سے صرف مسیحؑ ہی کو خدا کا بیٹا ہونا نہیں مانتے بلکہ انتہا، ضلالت یہ ہے کہ مسیحی ہو کر ہر ایک مسیحی اپنے آپ کو خُدا کا بیٹا سمجھتا ہے اس لئے وہ خدا کو باپ کہہ کر پکارتے ہیں۔ علماء کے نزدیک توحید دو قسم پر ہے:

۱۔ ہمارا ایک خُدا ہے (Henotheism)

۲۔ خدا ایک ہی ہے (Monotheism)

پہلا اعتقاد اُن مذاہب کا ہے جو خدا کو اپنا باپ خیال کرتے ہیں اُن کا عقیدہ ہے کہ ہمارا ایک خُدا ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اس خیال نے خدا کو باپ بنا دیا اور قوم خدا کا بیٹا بن بیٹھی اس سے یہ گمراہ کن تخیل پیدا ہوا کہ وہ خدا کی مثل اور مانند ہے "جیسا باپ ویسا بیٹا" اس تصوّر سے قوم کے اندر یہ تکبّر اور غرور پیدا ہو گیا کہ میں خدا کا اکلوتا بیٹا ہوں گوری قوموں کا عزو راسی عقیدہ کی ایک شاخ ہے جو اپنے سوا، دوسری کو حقیر اور ذلیل سمجھنے لگیں ایک طرف اگر جرمن اور ہندوستان کی آریہ نسل نے یہ کہا کہ:۔

آریہ ایشور پترہ۔ اریسیہ آپتیم اتی آریہ

Arya eashwar putrah aryasya aptyam iti arya.

आर्य ईश्वरपुत्रः आर्यस्य अपत्यम् इति आर्यः।।

"آریہ ایشور کا بیٹا ہے۔ ایشور کی اولاد ہونے سے وہ آریہ ہے۔"

ان کا ورن (ذات) اعلےٰ ہے اور خون زیادہ رنگین ہے ان کے علاوہ کل اقوام شُودر اور کالی چمڑی والے (Black) ہیں تو دوسری طرف بنی اسرائیل خدا کا بیٹا بلکہ پہلوٹھا بیٹا ہے۔ مسیحی دنیا نے کہا ہم کیوں کسی سے پیچھے رہیں۔ مسیح ایک تو سلسلۂ نسب کے لحاظ سے خدا کا بیٹا ہے کیونکہ وہ آدم کا بیٹا ہے اور آدم خدا کا بیٹا (لوقا ۳ : ۳۸) مگر یہ دُور کے رشتہ سے بنی آدم میں ہو کر خدا کا بیٹا بننا ایک عام بات ہے جو ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس لئے انجیل نویسوں نے خود اپنے بیان کردہ نسب نامہ پر سیاہی پھیر کر یعنی مسیح کو بن باپ بنا کر براہِ راست اسے خدا کا بیٹا کہدیا اور مریم صدیقہ کو باوجود یوسف کی بیوی بتانے اور اُس سے صاحبِ اولاد ہونے کے اب تک اُسے مقدّس کنواری کہتے ہیں یہ ایک سائنسدان اور فلسفہ نواز قوم کی بوالعجبیاں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اللہ میاں کو بھی ایسی بھولی قوم پر غصّہ نہ آنا چاہیئے۔ اس لئے گمراہ کن دراصل امر یہ ہے کہ یہ لوگ مسیح میں ہو کر سب خدا کے بیٹے بن بیٹھے ہیں اور ایک انگریز کی چھینگلی کے خون کو ایران کی پوری آبادی کے خون سے زیادہ گراں سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تکبر اور تمرد نسلِ انسانی میں تفرقہ ڈالتا ہے اور کمزوروں پر ہر قسم کے ظلم و ستم کو جائز ٹھہراتا ہے۔ یہی وہ خوفناک تصوّر ہے جس کے بارہ میں قرآنِ مجید نے فرمایا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۱۹ : ۹۰، ۹۱)

توحیدِ باری تعالیٰ کا دوسرا تصوّر جسے خدا ایک ہی ہے کا تصوّر کہا جاتا ہے اس کی رُو سے نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ شریک نہ ہمسر اور نہ اس کے کسی فرضی بیٹے میں سے ہو کر (Holy Communion) کوئی قوم خدا کا بیٹا بن سکتی ہے۔ توحیدِ الٰہی کا یہ تصوّر صرف اسلامی تصوّر اور توحید کا کامل اور حقیقی تصوّر ہے۔ اس عقیدہ کی رُو سے زمین کی سطح پر جس قدر انسان آباد ہیں بلحاظ پیدائش وہ سب مساوی ہیں

دنیا میں انسان گورے ہوں یا کالے مشرقی ہوں یا مغربی۔ برہمن چھتری۔ بنی اسرائیل سید مغل پٹھان سب بحیثیت پیدائش برابر ہیں انسان کو بزرگی صرف عمل کی دی گئی ہے ذاتی فضیلت اور بزرگی صرف ایک خدا کو حاصل ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ہمہ صفت موصوف ذات صرف اللہ ہی کی ہے۔ جو کل قوموں اور ساری مخلوقات کا ایک اکیلا رب ہے 'یہ مونوتھی ازم' یہ خالص اور کامل توحید ہے جس کے سامنے بالآخر ساری مغرور اور متکبر قوموں کو جھکنا پڑے گا عام خیال یہ ہے کہ توحید کا عقیدہ اسلام سے بیشتر بھی مذاہب میں موجود تھا لیکن مختلف مذاہب کی کتب مقدسہ کے مطالعہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم میں ایک خدا پر ایمان کے باوجود یہ تعصب بھی موجود تھا کہ وہ خدا صرف ان کا ہی خدا ہے۔ دنیا کی دوسری اقوام یا دوسرے ممالک کے لوگوں کا وہ خدا نہیں بلکہ ان کے اپنے اپنے خدا ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی غالب تھا کہ اُس کی اپنی قوم دنیا کی دوسری اقوام کے بالمقابل ایک برگزیدہ اور اعلےٰ قوم ہے۔ آریوں کا یہ عقیدہ تھا کہ وہ ہی ایشور کے بیٹے ہیں تو اس کے علاوہ ان کی ایک ضمنی تقسیم بھی تھی۔ کیونکہ آریہ تین الگ الگ قوموں برہمن چھتری اور ویش (بنیئے) کا مجموعی نام تھا۔ ان تینوں قوموں کے خدا الگ الگ تھے۔ برہمن کے دیوتا (خدا) کا نام اگنی تھا کشتری کے خدا کا نام اندر تھا اور بنیئے کا خدا وشنو دیوتا کہلاتا تھا اور شُودر کو غیر آریہ یعنی جن کا خدا کوئی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

بنی اسرائیل کے اندر پے در پے کئی ایک عظیم الشان انبیاء مبعوث ہوئے مگر یہودی اقوام نے کبھی تسلیم نہیں کیا کہ وہ خداوند یہوہ[1] (Yahveh) ان کے ماسوا

---

[1] یہود و نصاریٰ میں خدا کا نام ایک عرصہ دراز سے Jehovah لکھا اور پڑھا جاتا تھا مگر اس کا صحیح تلفظ اب یَہْوَہ (Yahveh) تسلیم کر لیا گیا ہے۔

دوسری غیر اسرائیلی اقوام کا بھی خدا ہے۔ اعتقاد کے علاوہ عوام کا مذہب یہ تھا کہ جب خدا برہمن کا اوتار لیتا تھا تو چھتریوں کو تہ تیغ کر دیتا تھا جیسا کہ پرشو رام نے کیا اور جب چھتری قوم میں اوتار لیتا تھا تو برہمنوں کو قتل کر دیتا تھا جیسا کہ رام چندر نے راون کو۔ جو برہمن تھا اُسے اس کے خاندان سمیت ہلاک کر دیا۔ عزیب شودروں میں کبھی پرماتما نے اوتار نہیں لیا۔ کیا لُطف کی بات ہے کہ زمانۂ قدیم میں نہ صرف قومیں ایک دوسرے کے خلاف لڑتی تھیں بلکہ ان مختلف قوموں کے خُدا بھی ایک دوسرے کے مقابل جنگ آزما ہوتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان میں اوتار لے کر اپنی اپنی قوم کی مدد کرتے تھے۔ بعض قوموں کے خداؤں کو جنگ کی ایسی لَت تھی کہ وہ جنگوں میں بالاُجرت شامل ہوتے تھے چنانچہ رگوید میں لکھا ہے۔

کون مجھ سے اِندر (خدا) کو دس گابوں کے عوض خریدتا ہے۔
یہ اِندر جو میرا ہے ؟ جب وہ دشمن کو مار ڈالے تو خریدنے والا
اس کو مجھے واپس دیدے۔ (رگوید منڈل ۴ سوکت ۲۴ منتر ۱
اس زمانہ میں ۱۰ گابوں کی قیمت قریباً ۳۰ روپیہ ہوگی۔)

حقیقت الامر یہ ہے کہ قوموں کے معتقدات اور خیالات کالے بادلوں کی طرح جمع ہو کر ان پر ہی برستے ہیں اگر لوگ ان مرنے والوں کی آوازوں پر کان دھریں جو وید کے زمانہ کی آریہ اور غیر آریہ (وسیلیوں) کی اندھا دھند جنگوں۔ مہابھارت میں خُون کی ندیوں۔ رام چندر، پرشو رام۔ کرشن اور شنکر آچاریہ کے دھرم یُدھوں (مذہبی جہادوں) کے قتلِ عام سے فضاءِ عالم میں گونج رہی ہیں اور یورپ کے میدانوں، افریقہ کی دلدلوں روس کے ویرانوں۔ انگلینڈ کی قبروں اور پولینڈ نیز جرمنی کے شہروں۔ اٹلی کے جزیروں میں تڑپتی ہوئی لاشوں، عورتوں اور بچوں کی آہوں کو سُنیں کہ وہ کس بات کا ماتم کر رہی ہیں تو

انہیں معلوم ہو کہ وہ ایک قوم کا دوسری قوم پر تفوق، پیدائشی برتری۔ نسلی بزرگی اور اپنے آپ کو خدا کا بیٹا سمجھ لینے کا نتیجہ اور نیشنلزم کا بھوت ہے جو فی زمانہ ملٹری ازم کے دیوتا کا اوتار لے کر قوموں کو جہنم کی دہکتی ہوئی آگ میں جھونک رہا ہے۔ اس فساد انگیز عقیدہ اور شیطان کی غلامی کا علاج قرآن مجید کی پہلی آیت کا جملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ہے جس کی مزید تشریح کرتے ہوئے سورۂ کہف کی پہلی آیت میں بتایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتَابَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا۔ ان رشیوں منیوں اور انبیاء کے بالمقابل جن کو خدا اور خدا کا بیٹا سمجھا جاتا ہے جن کی پیدائش مافوق الفہم اور جن کی زندگی محیر العقول معجزات کا مجموعہ سمجھی جاتی ہے ایک خدا کا بندہ مبعوث کیا جاتا ہے۔ جو خدا کا بیٹا ہونے پر فخر نہیں کرتا بلکہ ہماری طرح ہی زندہ رہنے اور فوت ہو جانے کا اقرار کرتا ہے جس نے خود فرمایا کَفٰی بِہٖ فَخْرًا اَنْ اَکُوْنَ لَکَ عَبْدًا وَکَفٰی بِیْ شَرَفًا اَنْ تَکُوْنَ لِیْ رَبًّا "میرے لئے یہ فخر کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں اور میرے لئے یہ عزت بس ہے کہ تو میرا رب ہے۔" ؎

چہ عظمت وادہ یارب بخلق آں مکرم را
کہ ای عبدہ گوید بجاء قول سبحانی

اس اللہ کے بندہ پر اللہ تعالیٰ کی کامل حمد نازل کی جاتی ہے جو اپنے آپ کو نہ خدا ٹھہراتا ہے اور نہ خدا کا بیٹا۔ جس کے دل میں نسلِ انسانی کے کسی گروہ اور کنبہ کے لئے کوئی کجی نہیں اور نہ گمراہی۔ وہ اپنی ذات اپنی قوم اور اپنے ملک کی محض پیدائشی فضیلت کا مدعی نہیں وہ کُل اقوام عالم کے لئے خدا کی طرف سے ان کے سارے حقوق ادا کرنے کا عہد ہے۔ البتہ اس سے انکار کرنے والے کے لئے اس کے بھیجنے والے کی طرف سے شدید جنگ کا الارم ہے۔

علماءِ اخلاق نے اقوامِ عالم میں امن و صلح اور اتحاد قائم رکھنے کے لئے سات نیکیوں (Seven Virtues) پر ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری قرار دیا ہے ان نیکیوں میں سے سب سے پہلی بات خداوندِ عالم پر ایمان لانا ہے اور یہ بھی مسلّم ہے کہ اس کے بغیر کوئی تہذیب اور تمدن قائم نہیں رہ سکتا۔ مگر سورۃ فاتحہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محض اس قدر ایمان کہ کوئی ہمارا خدا ہے ہرگز کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ کل قوموں کا خدا ایک ہی ہے وہ حُسن و صداقت اور نیکی کا خدا ہے اور ان تین باتوں کو یعنی حُسن و صداقت اور نیکی کو پسند کرتا اور اس کا نیک اجر دیتا ہے کوئی بڑے سے بڑا انسان اس کا بیٹا نہیں اور نہ کوئی خاص قوم اس کا بیٹا ہے نہ موجودات میں سے کوئی اس کا شریک اور ہمسر ہے نہ ہو سکتا ہے۔ اور دُنیا کے تمام انبیاء برحق اور کُل قومیں بلحاظ پیدائش سب کی سب مساوی اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

علمی زندگی میں الحمدللہ

الحمدللہ ایک تعلیمی جملہ یا ایک خبر ہے جس کے معنی ہیں تمام خوبیاں، تعریفیں اور شکر تمام اللہ ہی کے لئے ہے۔ اس تعلیم یا اقرار پر عمل صرف زبان سے الحمدللہ کہہ دینے سے نہیں ہو سکتا قول اور اقرار کا اثر ہماری زندگی میں نمایاں ہونا چاہیئے حمد میں بطور خلاصہ حُسن، صداقت اور نیکی تین امور مضمر ہیں ایمان باللہ Faith in God کا مفہوم اسلام میں یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے کلام اس کی ہر صفت اور فعل میں حُسن، صداقت اور نیکی کا پہلو موجود ہے پس اس کائنات کو اس نے کسی بُرے ارادہ سے پیدا نہیں کیا بلکہ اس کا ہر فعل موجبِ حمد و شکر ہے اور اس کی صفاتِ حسنہ کو ظاہر کرتا ہے۔ انسان جو کائناتِ عالم میں اس کی ایک بہترین مخلوق ہے اسے پیدا کرنے میں یا اس کی فطرۃ میں اور اس کی زندگی کی نیابت مقرر کرنے میں

اس کے خالق و مالک کا ارادہ اور مشیت ہرگز بُری نہیں ہوسکتی۔ وہ گھاس جو آج پیدا ہوتی اور کل تنور میں جھونکی جاتی ہے اسے پیدا کرتے ہیں اگر فلسفیانہ نگاہ اور کیمسٹ (ماہرِ کیمیا) کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اس خالق نے کس قدر دلچسپی کا اظہار کیا ہے کہ اس جیسا ایک تنکا دُنیا کے تمام کاریگر اور سائنسدان مل کر بھی نہیں بنا سکتے اور اگر جھڑ جائے تو اس کے ساتھ دوبارہ بعینہٖ لگا نہیں سکتے انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کے بنانے تعویر میں تعدیل اور کمالِ حُسن تک پہنچانے میں کس قدر حُسن و خوبی، عقل و خرد اور حُسنِ اخلاق کا ذخیرہ وافر کام میں لایا گیا ہوگا انسان کے بارہ میں یہ خیال کہ وہ پیدائش سے بُرا۔ فطرتاً یا وراثتہً گنہگار اور ہیچ پیدا کیا گیا ہے ایک غلط خیال اور وہم باطل ہے قرآن مجید نے الحمدللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۶۴ : ۳)

وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۴۰ : ۶۴)

اس نے تمہاری شکل بنائی تو نہایت ہی حسین شکل بنائی اور اسی کی طرف تمہارا ٹھکانا ہے۔ احسن مبالغہ کا صیغہ ہے کہ اس سے زیادہ حسین اور جمیل اور کوئی نہیں اور پھر اس کی نہایت اور نہایت اللہ تعالےٰ ہے اسی کی طرف واپسی اور رجوع ہے اس نے تمہارا نقشہ کھینچا تو نہایت حسین کھینچا۔ (جو خود بنانے والے کو بھی پسند آیا۔) اور کھانے کو پاکیزہ رزق دیئے سو وہ اللہ۔ جو رب العالمین ہے۔ برکت والا ہے یعنی اس نے انسان کی پیدائش بہترین پیمانہ پر کی ہے اور خزانۂ حُسن و صداقت و نیکی سے اسے خوب مالا مال کیا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵ : ۴)

ہم نے انسان کو بہترین میزان حسن۔ وعقل اور نیکی کے اعلیٰ پیمانہ پر پیدا کیا ہے۔ اس کے بعد فرمایا :۔ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ جس سے بالعموم یہ مراد لی جاتی ہے کہ پھر اسے لوٹا دیا۔ اَسْفَلَ سَافِلِيْن یا اسے ذلیل سے ذلیل حالت کی طرف لوٹا دیتے ہیں مگر جس قسم کے جواب میں یہ فرمایا اس میں انسان کی ذلت کا ذکر نہیں۔ یہاں تو ذکر ہے کہ انسان بہترین میزان پر پیدا کیا گیا ہے مگر اس کے بعد ذلیل ہو جانے پر اس میں کوئی گواہی نہیں۔ وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ، انجیر اور زیتون۔ طور سینا اور یہ امن والا شہر گواہ ہیں کہ انسان نہایت ہی اعلیٰ پیمانہ پر پیدا کیا گیا ہے مگر اعلیٰ پیمانہ پر پیدا کرنے کے بعد اس کو ہم ذلیل کر دیتے ہیں اس پر نہ انجیر اور زیتون کی گواہی ہے اور نہ طور سینا و بلد امین کی اور نہ اس میں یہ ذکر ہے کہ ہم اس کے اعمال بد کی سزا میں اسے ذلیل کر دیتے ہیں کہ وہ احسن تقویم پر پہنچنے کے بعد اسفل سافلین میں گرا دیا جاتا ہے دونوں جگہ اللہ تعالےٰ فاعل ہے اور انسان مفعول ہے یعنی جسے ہم نے اعلیٰ پیمانہ اور میزان پر پیدا کیا ہے اسے ہی ہم (ہٗ کی ضمیر اسی طرف جاتی ہے) اَسْفَلَ سَافِلِيْن میں لوٹا دیتے ہیں۔ اگر یوں اسے اَسْفَلَ سَافِلِيْن میں لوٹا دینا تھا تو پھر اسے اعلیٰ پیمانہ پر پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ نیز احسن تقویم حسنِ ظاہر باطنی عقل و تمیز وغیرہ اور نیکی تینوں صفات پر مشتمل ہے جن کی بناء پر انسان باقی مخلوقات سے اعلیٰ اور افضل ہے مگر بدی سے لازمی طور پر تینوں حیثیتوں سے انسان نیچے نہیں گرتا بالعموم نیکی کے مقام سے نیچے اُتر آتا ہے احسن تقویم پر بحیثیت مجموعی انسان کے پیدا کرنے کا ذکر ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی انسان اَسْفَلَ سَافِلِيْن میں نہیں گرتا انبیاء۔ اولیاء اور صلحاء اس ذلیل حالت میں ہرگز نہیں گرتے۔ پس ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سَافِلِيْن کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ

پھر اسے رکھ دیا نیچے سے نیچے یا نہایت نیچے۔ جہاں اس کے ارد گرد چاروں طرف مزاحمت کرنے والی قوتیں اور طاقتیں موجود ہیں اور یہ نیچے رکھ دینا بطور سزا نہیں بلکہ انسانی جدوجہد اور قوت ظاہر کرنے کے لئے ہے کہ وہ اپنی کوشش سے اُوپر اٹھے اور ترقی کرے سو یہ اونچا چڑھنے والے لوگ وہ ہیں۔ جو ایمان لاتے اور اُوپر چڑھنے کا عمل بجالاتے ہیں۔ ان کا اجر غیر منقطع یا لاانتہا ہو جاتا ہے اسے پورے طور پر سمجھنے کے لئے انسانی بچہ کی پیدائش کے وقت کی کمزوری کو دیکھو جو تمام حیوانات کے بچوں سے کمزور پیدا ہوتا ہے اپنی جان کی حفاظت میں وہ خود اور اس کے والدین بہت کمزور نظر آتے ہیں پھر اس قوت اور طاقت کو دیکھو جو اس کے اندر بطور بیج رکھ دی گئی تھی جو آہستہ آہستہ اسے ایک اعلیٰ درجہ کا ڈاکٹر، انجینیر، پہلوان، فلاسفر، شاعر، سائنسدان اخلاق اور نیکی کا مجسمہ بنا دیتی ہے کہ وہ کائنات کی بڑی سے بڑی قہری قوتوں پر غالب آجاتا ہے۔

قرآن مجید کی رُو سے دکھ کا فلسفہ

پس الحمدللہ کا جملہ ایک مسلمان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسانی زندگی کا نصب العین اور مقصد صرف آرام اور راحت نہیں بلکہ ایک اعلیٰ درجہ کا کیرکٹر اور سیرت پیدا کرنا ہے۔ کشمکش حیات اور انسانی زندگی کی جدوجہد انسان کے اُوپر مصائب کے پہاڑ اٹھالاتی ہے انہی دکھوں اور مصائب کو دیکھ کر ایک ماہر نفسیات خدا کی ہستی کا منکر ہو جاتا ہے مگر ہم کسی راستہ کو دو مختلف نقطۂ خیال سے دیکھ سکتے ہیں ایک اس لحاظ سے کہ جس راہ پر ہم چل رہے ہیں وہ اپنی منزل سے ہمیں دور دور لے جا رہا ہے ہماری دل بستگی اس نقطہ سے وابستہ ہے جہاں سے ہم نے سفر شروع کیا اس خیال سے ہم اپنا ہر قدم جبر اور قہر سے اٹھتا ہوا محسوس کریں گے اور راستہ کی ناہمواری دکھ اور مصیبت کا پہاڑ نظر آئے گی اور انسان

آگے بڑھنے کی بجائے مڑ کر پیچھے ہٹنے کو ترجیح دے گا اور آگے بڑھنے کی نسبت خودکشی کو اچھا سمجھے گا جس کے معنی درحقیقت خدا کی ہستی کا انکار ہے دوسرے نقطۂ خیال سے زندگی کا راستہ آگے کی طرف اور محبوب کی طرف لے جا رہا ہے ایسی صورت میں ہم نہایت ذوق وشوق سے اس پر قدم مارتے ہیں۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی کا راستہ جس پر ہم چلنے کے لئے مجبور ہیں وہ اسے اصل منزل سے دور دور نہیں لے جا رہا بلکہ قریب قریب کرتا جاتا ہے ہمارے احساسات جن باتوں میں سکھ محسوس کرتے ہیں اور جن امور میں آرام و راحت پاتے ہیں وہ سب ہماری بھلائی اور ترقی کے لئے ضروری ہیں اور ہمارے محبوب کے قریب لے جانے کے لئے ہیں نہ اصل منزل سے روکنے کے لئے چنانچہ فرمایا:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲: ۱۵۵، ۱۵۶)

خوف واحتیاج نقصان مال اور جان۔ دنیا کی امیدیں اور تمنائیں یہ سب حصولِ کمالات کے ذرائع ہیں آزمائش کی ان سب باتوں سے جو پست ہمتی یا طاقت پیدا ہوتی ہے وہ ایک انسان اور قوم کی زندگی یا موت کا فیصلہ کرتی ہے جو شخص اور قوم ان کے خوف سے آزاد ہوگئے اس کے لئے بشارت کے سوا کچھ نہیں رہا ہر قسم کی مصیبت جو ان مسافرانِ راہِ خدا پر پڑی ان کے پاس اس کا صرف ایک ہی جواب تھا ڈر کس بات کا؟

دوسری کوئی چیز ہمارا مطلوب اور مقصود حیات تو تھی نہیں اس لئے ہم نے ان سے قطع تعلق کر لیا اور خدا کی خاطر کر لیا اب ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہمارا ہے بس چلے چلو خدا کی طرف جو ہمارا اصل مطلوب اور محبوب ہے یہی لوگ ہیں جن

پر اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور مزید برآں رحمت ہے اور یہی لوگ اللہ کی طرف جانے والی شاہراہ پر سوار ہیں۔ یہی وہ پاک لوگ ہیں جن کے منہ سے ہر بڑے سے بڑے دکھ اور مصیبت کے وقت الحمد للہ کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ قرآن مجید میں حضرت ایوبؑ کی زندگی کا اسوہ حسنہ اسی لئے پیش کیا گیا ہے کہ ان کے مال و دولت کی انتہائی بربادی کے باوجود، ان کے پیارے اہل و عیال کی ان سے جبری جدائی، نہایت دردناک بیماری میں مبتلا ہونے پر ان کے منہ سے خدا کا شکوہ نہ نکلا بلکہ ہر مصیبت کے بعد جو مصیبت ان پر آتی گئی اسے الحمد للہ کہہ کر گوارا کر لیا۔ حضرت ایوبؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ دکھوں اور مصیبتوں کی انتہا ہو جانے پر بھی الحمد للہ کے سوا اور کچھ ان کے منہ سے نہ نکلا جس طرح تاریکی کے اندر ہیرا زیادہ سے زیادہ روشنی دیتا ہے اسی طرح ان لوگوں کا کیرکٹر مصائب کی تاریکیوں میں زیادہ سے زیادہ چمکتا ہے۔ خدا پر ایمان کا ثبوت، حکومت دولت اور ہر قسم کی نعمتوں کے میسّر آنے پر دل سے الحمد للہ کا نکلنا ہے وہ شخص جو آسائشوں کے اندر پھنس کر نہیں رہ جاتا اور عیش و آرام میں خدا کو بھول نہیں جاتا وہ تکبر اور غرور سے ظلم اور عیش و عشرت کی محفلیں گرم نہیں کرتا اس کا ایمان اللہ تعالیٰ پر مضبوط ہے وہ دُنیوی نعمتوں کو صرف اپنی تن آسانی پر خرچ نہیں کرتا بلکہ انہیں تنگ دست خدا کی مخلوق پر صدقہ کرتا ہے وہ بادشاہ ہے مگر اپنے فقر پر فخر کرتا ہے ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس امر میں دنیا کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ ہیں باوجود بادشاہ ہو جانے کے اپنے لئے نہ تخت بنوایا نہ تاج سر پر رکھا نہ اپنے لباس میں موتی ٹانکے نہ دولت گھر میں رکھی نہ عیش کے سامان جمع کئے۔ روکھی سوکھی روٹی کھائی اور کھجور کی سخت چٹائی پر استراحت فرمائی۔ جو ملا وہ خدا کی راہ میں مساکین اور غربا پر خرچ کر دیا آپ کی زندگی اور موت دونوں کا مقصد اللہ تھا اور اپنی امت کو

بھی یہی سبق پڑھایا۔ اِنَّا لِلّٰہ ہماری زندگی اللہ کے لئے ہے۔ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن اور ہماری موت بھی اللہ کے لئے ہے اس نبیٔ پاک کا درجہ کتنا بلند ہے جس کی روزانہ زندگی میں بغیر کسی ناغہ اور تعطیل کے مصائب اور راحت کی مزاحمتوں کے باوجود صبح اٹھتے ہی خدا کی حمد اور شکر دوپہر کو اس کی حمد سہ پہر کو اس کی تعریف۔ شام کو شب کو اس کا شکر اور آدھی رات کو اُٹھ کر الحمدللہ زبان اور دل دونوں سے نکلتا ہے خدا کی ہستی پر یہ زبردست ایمان اور اس کی حمد کا ولولہ انگیز سبق اور پھر اس کے ذریعہ قوم کی زندگی کا یقین ہی تھا کہ اپنے پیروں کو کم از کم ۳۲ مرتبہ روزانہ خدا کی حمد کرنے کا حکم دیا پھر کسی عزیز اور محبوب کی موت و فوت کے انتہائی رنج کے وقت اور بڑی سے بڑی خوشی کے وقت خدا کی حمد ہی کرنا سکھائی ایسے اوقات میں خدا کی حمد ہی دنیا کے دکھوں اور مصائب کے مہلک نتائج سے مخلصی اور نجات کا ذریعہ ہے۔

باب سوم

ربّ العالمین

دُوسری نیکی اور خوبی اُمید، یا اپنے آپ پر اعتماد Faith in Self ہے۔ رَبّ: پیدا کر کے بتدریج ترقی اور نشوونما دے کر کمال تک پہنچانیوالا۔

اَلْ: تمام۔ کل

عَالَمِیْن: عَالَم کی جمع (علم کا ذریعہ۔ معرفت الٰہی کا سامان) رَبُّ الْعَالَمِیْن کا ترجمہ ہوا تمام عالموں (انواعِ مخلوقات) کا پیدا کرنے والا نشوونما دینے والا، ترقی دے کر کمال تک پہنچانے والا ہر اصلح وجود کو بقا عطا کرنے والا۔

جملا الحمدللہ میں اگر ذات خداوندی کے کمالِ حُسن کا ذکر تھا تو رَبُّ العالمین میں اس کے کمالِ احسان کا بیان ہے۔ اس کی تشریح اور تفسیر میں خود ہی فرمایا۔ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (۲۰ : ۵۰) ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اسے حصولِ کمال کی راہ پر لگا دیا۔ وہ صرف ہمارے جسم کا ہی رب نہیں بلکہ ہماری رُوح کا بھی رب اور اسے کمال تک پہنچانے والا ہے ایک اور جگہ انسان کے متعلق فرمایا:

یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ (۸۲ : ۶، ۷)

اے انسان تجھے کس چیز نے اپنے ربّ سے ورغلا دیا اس نے تجھے پیدا

کیا۔ تیری جسمانی بناوٹ کو درست کیا تیرے دماغی اور رُوحانی قویٰ کی جس شکل پر چاہا تعدیل کی یعنی تمام قویٰ میں نہایت اعلےٰ تنظیم پیدا کر دی۔ پھر فرمایا:۔ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰى (۸۷:۱-۳)

سب سے اعلےٰ اپنے ربّ کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اعضاء جسمانی کو درست بنایا جس نے تیری قوتوں کا صحیح اندازہ مقرر کیا پھر تجھے کمال تک پہنچایا۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رب اور ربّ العالمین کے ماتحت قرآن مجید کی بیشتر آیات کا ماحصل یہ ہے:۔

۱۔ اس عالم کی ہر چیز کی ترتیب تخلیق یا بناوٹ سے اس کے بنانے والے کا پتہ چلتا ہے یا اس کے رب ہونے پر استدلال ہوتا ہے۔

۲۔ ہر چیز کا پیدا ہو کر آہستہ آہستہ ترقی کرتے جانا اس کے پیدا کرنے والے کے رب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

۳۔ اس عالم کا رب (خالق) تمام اشیاء کو اس کے حسبِ حال جسم دینے کا اختیار بھی رکھتا ہے یا وہ مالک الکل ہے۔

۴۔ تخلیقِ عالم دفعتہً واحدہ جسے اصطلاح میں (Fiat Creation) کہا جاتا ہے نہیں ہوئی بلکہ ارتقائی عمل کے ماتحت آہستہ آہستہ (Evolutionary) تخلیق ہوئی ہے۔

۵۔ کائنات میں بقاءِ اصلح (کیونکہ صفت ربّ کے معنی ہیں اصلح وجود کو بقا عطا کرنے والا) کا اصول۔ اس کے بنانے والے اور نشو و نما دینے والے کے نیک ارادہ اور خُوبی کو ظاہر کرتا ہے۔

۶۔ موجوداتِ عالم کی ہر شے اپنے رب کے احکامات اور قوانین کی فرمانبرداری پر مجبور ہے کیونکہ وہ مطاعِ کُل ہے۔

۷۔ ہر شے کی ترقی معقول اور منظم طریق پر ہو رہی ہے جسے Rational Improvement کہا جاتا ہے کوئی شے نامعقول طریق پر چل کر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

۸۔ انسان کی بناوٹ کل انواعِ مخلوق میں افضل اور احسن ہے اس کے دماغی اور روحانی قویٰ سب سے اعلےٰ ہیں اور اس کی ترقی لامحدود ہے۔

۹۔ اس کی جسمانی اور روحانی نشوونما کے سامان خارج میں رب العالمین نے پیدا کر رکھے ہیں۔

۱۰۔ انسان کے سامنے رَبّ العالمین کا تصوّر انسان کو کبھی مایوس اور نااُمید ہونے نہیں دیتا اور اس کی اس صفت پر یقینِ کامل ہر گناہ سے اسے روکتا ہے اور انسان کے اندر ترقی کا شوق پیدا کرتا ہے۔ گو ظاہری حالات کیسے ہی مایوس کن کیوں نہ ہوں۔

۱۱۔ رَبّ العالمین کی صفت یہ بھی بتائی ہے کہ مذہب صرف جزوی چیز نہیں یا کسی ایک قوم کی ملکیت نہیں بلکہ وہ ایک عالمگیر حقیقت ہے۔

مذکورہ بالا مضامین میں سے صرف دو تین کے متعلق کچھ لکھا جاتا ہے اور باقی کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

ربّ العالمین اور ارتقائے تخلیق

ابتدا میں یعنی ہمارا علم جہاں تک پہنچتا ہے اس وقت تخلیقِ کائنات کیوں کر ہوئی۔ اس کے متعلق علماء، سائنس کا خیال ہے کہ پہلے پہل الیکٹرون (Electrons) برق پارے تھے جن میں نہ جانے کیوں گرہیں پڑنے لگیں۔ انہیں مثبت اور منفی کی اکائیاں کہا جاتا ہے ان میں باہمی کشش و دفع کی جنگ سے ایک سو کے قریب ذرّات

عناصر پیدا ہو گئے جو مادہ کے سالمے (ایٹمز) کہلائے ان کی ترکیب سے دنیا کا رنگ و روغن تیار ہوا کسی وقت قریباً تمام اہل مذاہب کا خیال تھا کہ خدا نے کہا "دیے ہی" (ہو) ویسی کین "اور وہ ہو ہی گیا" چنانچہ علماء یہود کی تفسیر میں اس پر لکھا ہے۔ "Fulfilment follows immediately upon the divine fiat." خُدا کے کہنے پر ہر ایک چیز ہو گئی (پیدائش ۱:۳) چنانچہ زبورِ داؤد میں ہے "اس نے کہا اور وہ فوراً ہو گیا اس نے حکم دیا اور دنیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔" (زبور ۳۳: ۹)۔ یوں خداوند عالم چھ دن تک ہو، ہو کہتا رہا اور کل کائنات بن کر کھڑی ہو گئی اور ساتویں دن خدا نے آرام کیا اور تازہ دَم ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ چھ دن میں ایک ایک مرتبہ صرف ہو کہہ دینے سے اسے تکان ہو جاتی رہی اور چھ دن کے بعد نڈھال ہو گیا اور ساتویں دِن مکمل آرام کیا۔ ہندوؤں کی مستند کتب میں بھی لکھا ہے کہ پرماتما نے 'بھُو' کہا اور زمین بن گئی اس نے بھُوہ کہا اور فضا فوراً آموجود ہوئی اس نے سُوہ کہا اور آسمان وجود میں آگئے۔

مسلمان عوام کا بھی یہی خیال رہا کہ اللہ تعالےٰ نے کُن کہا اور دنیا دفعۃً واحدہ بن گئی۔ مگر قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ کی سب سے پہلی صفت رَبُّ العالمین آئی ہے یعنی وہ آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ نشوونما دیتا اور تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں قرآن مجید میں بھی یہ ارشاد ہے کہ :۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۶: ۸۲)

وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۲: ۱۱۷)

اس کا حکم جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے صرف یہی ہوتا ہے کہ

اسے کہتا ہے 'ہو' سو وہ ہو جاتی ہے اور جب کوئی حکم جاری کرتا ہے تو صرف اسے کہہ دیتا ہے کہ 'ہو' سو وہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ قرآن مجید میں چھ مختلف اَدوار میں زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہے چھ مختلف اَدوار یا ستہ ایام کون سے ہیں اور کتنے طویل ہیں؟ ان کا کوئی اندازہ قرآن مجید میں نہیں البتہ اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تھک کر نہ تو کبھی سبت (چھٹی) منائی ہے اور نہ اسے اس کی ضرورت ہے۔ فرمایا:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (۵۰ : ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اُن دونوں کے درمیان ہے چھ وقتوں میں پیدا کیا اور تکان نے ہمیں بالکل نہیں چھوا (جسے تکان ہو جائے وہ کام چھوڑ بیٹھتا چھٹی مناتا اور تازہ دم ہوتا ہے) اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ سے تخلیق میں لگا ہوا ہے اور کبھی اس سے فارغ نہیں ہوا۔ قرآن مجید کی رو سے یہ دُنیا کوئی ختم شدہ چیز نہیں بلکہ اس کے اندر بے شمار نئے عالموں کی تعمیر کا مواد موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۲۹ : ۱۹)

کیا وہ دیکھتے نہیں کس طرح اللہ تعالےٰ نے تخلیق کی ابتداء کی اور پھر بار بار کرتا رہتا ہے یہ اللہ پر بہت ہی آسان ہے۔ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۳۵ : ۱) اپنی خلق میں جو کچھ چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے یقیناً اللہ ہر بات پر قادر ہے۔ (وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۵ : ۱۷)

اور آسمان اور زمین کی بادشاہت اور جو اُن کے درمیان ہے اللہ کے لئے ہی ہے وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ ارتقائی تخلیق جو لفظ رَبُّ العالمین کے مفہوم میں مضمر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا بہت بڑا نشان ہے۔ ڈارون جو موجودہ زمانہ میں اصولِ ارتقاء کا وسعت نظر سے مطالعہ کرنے والا ہے کہتا ہے :-

"This grand sequence of events, the mind refuses to accept as the result of blind chance, the understanding revolts from such a conclusion."

"موجودات کے اندر واقعات کا یہ عظیم تسلسل کسی اندھے اتفاق کا نتیجہ ہو دل اسے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے عقل اِس نتیجہ کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔" اس دلیل کو آپ ایک مثال کے ذریعہ سمجھیئے کہ ایک شخص نے چند کاریگروں کو ایک ہی قسم اور جسامت کے پتھر سپرد کر کے کہا تم اپنی اپنی پسند کا نہایت خوبصورت مجسمہ اپنے اپنے پتھر سے تراش کر لے آؤ اور چند ماہ بعد وہ مجسمے تیار کر کے لائے تو وہ ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف تھے حالانکہ سب کے پتھر ایک ہی قسم اور حجم کے تھے مگر جو مجسمے ان سے تیار کئے گئے وہ قطعاً ایک جیسے نہ تھے کوئی خوبصورت تھا تو دوسرا بہت ہی خوبصورت ایک بدنما تھا تو دوسرا نہایت ہی بھیانک اور بدصورت جب اصل پتھر میں اختلاف نہ تھا تو جو چیز ان سے بنائی گئی اس میں اختلاف کہاں سے پیدا ہوا؟ گویا یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس پتھر کے ساتھ اور کون سی چیز مل گئی جس نے ہر ایک بُت کو الگ الگ اچھا اور بُرا بنا دیا ظاہر ہے کہ وہ ہر ایک کاریگر کی اپنی عقل

ہے جو اس کے مجسمہ میں داخل ہوگئی ہے اور اس نے اسے خوبصورت یا بدصورت بنا دیا ہے اس مثال کو سامنے رکھ کر اس امر پر غور کیجئے کہ جب اصل مادہ یا الیکٹرون کے اندر اختلاف نہ تھا کہ جس سے یہ دنیا بنی تو کائنات کے اندر وسیع اختلافات اشکال و وجود تاثیرات اور رنگ کہاں سے پیدا ہوگئے اور پھر ان اختلافات کے اندر ایک معقولیت اور عقلی ارتقاء موجود ہے جو علماء سائنس کو مسلّم ہے۔

"There is order, there is beauty, there is rational growth, development and rational evolution."

قرآن مجید اس دلیل کو سورۃ فاتحہ میں رب العالمین کے مختصر سے جملہ میں ادا کرکے کئی مقامات پر مختلف رنگوں میں اس کی تفسیر اور تشریح فرماتا ہے کہ کائناتِ عالم میں یہ نظم یہ خوبصورتی معقول ترقی اور ارتقاء فی الحقیقت صفتِ ربّ کا اظہار ہے جس کے معنی ہیں کوئی شئے پیدا کرتے اور پھر آہستہ آہستہ دلکش انداز میں اسے پروان چڑھاتے ہوئے ارتقاءِ اعلیٰ یا کمال حسن تک پہنچانے والی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رَبّ العالمین یہ بھی بتاتی ہے کہ دنیا کی کوئی چیز ساکن نہیں بلکہ ہر شے ہر آن دلنواز رقص میں محو ہے اور اس کا ہر قدم ایک معقول انداز میں آگے آگے بڑھتا اور اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ پس صفت رب میں بھی پیدائشی خوبصورتی ایک معقول ارتقاء اور کمال اتقا تین قسم کے دلائل قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں۔

خوبصورتی۔ معقولیت اور نیکی کا معیار

گذشتہ صفحات میں خوبصورتی۔ صداقت اور نیکی کے معیار پر بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ بتایا تھا کہ ان تینوں کی تعریف اور تعین مشکل ہے حُسن کے معیار میں اضطراب ہے صداقت کی تعین میں مباحثات ہیں

اور نیکی کی تعبیر میں تضاد ہے لیکن ان اختلافات کو مٹانے یا وحدت کی طرف لانے کا ذریعہ ارتقاء ذہن، تربیت دماغ اور قلب ہے تعلیم اور تربیت اختلافات کو دن بدن مٹاتی چلی جاتی ہے اور ان امور میں بالآخر وحشی مہذب کے معیار کو قبول کر لیتا ہے معمولی اور فروعی اختلافات باقی رہ جاتے ہیں مگر اصول میں سب متفق ہو جاتے ہیں حسن اور خوبصورتی پر مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کائناتِ عالم میں جو چیز قدرت کے ہاتھ سے نکلی اُسے خوبصورتی یا بدصورتی یا حق اور باطل میں تقسیم کرنا غلط ہے ہر چیز جس کی معرفت سے ہم دور ہیں وہ ہمیں بدصورت اور باطل نظر آتی ہے۔ مگر فی الحقیقت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۳: ۱۹۰، ۱۹۱)

"آسمان اور زمین کی پیدائش میں رات اور دن کے اختلاف میں عقل والوں کے لئے اس کی ہستی کے نشانات ہیں جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اے ہمارے رب تو نے ان سبکو باطل نہیں بنایا تو پاک ہے ہمیں آگ سے بچا۔"

حقائق الاشیاء میں غور اور فکر کرنے سے انسان کے علمی ذخیرہ میں اضافہ ہوتا ہے اور جہالت کا نقشہ مٹتا رہتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ہمارا خوبصورتی کا احساس ترقی کرتا جاتا ہے۔ کسی چیز کے متعلق جتنا ہمارا علم کم ہوگا اتنا ہی ہم اس سے متنفر رہیں گے لیکن علم کے ساتھ ساتھ اس کی خوبی کا احساس بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح صداقت یقیناً ہر چیز میں موجود

ہے اس لئے ہر قدرتی چیز ہمارے علم کا ذریعہ ہے قدرت کے ہر فعل میں خوبصورتی ہے۔ ہمارے احساس کی غلطی اور قلتِ تدبر بعض اشیاء کو بدصورت دکھاتا ہے علمی ترقی کے ساتھ ساتھ خوبصورتی کی حدود وسیع ہوتی اور بدصورتی کا خیال مٹتا جاتا ہے مثلاً ایک عام آدمی کے نزدیک رنگوں کے ایک خاص تناسب میں خوبصورتی محدود ہے مگر ایک عقلمند اچھی سیرت کو اس سے زیادہ خوبصورت سمجھتا ہے ظاہر ہے کہ دوسرے شخص کی خوبصورتی کی حدود پہلے شخص سے زیادہ وسیع ہیں رنگ کی خوبصورتی چہرہ کے بہت ہی باریک پردہ تک ہے اور عارضی ہے مگر سیرت کی خوبصورتی نہایت گہری اور پائیدار خوبصورتی ہے۔

صداقت اور نیکی کا معیار

صداقت اور نیکی کیا ہے؟ اور اس کے معلوم کرنے کا معیار کیا ہے؟ اس پر کسی قدر زیادہ تفصیلی بحث کی ضرورت ہے حق اور صداقت جانچنے کے معیار گذشتہ زمانہ میں بالعموم بتفصیل ذیل سمجھے جاتے تھے۔

۱۔ آبا و اجداد کے رسم و رواج پر چلنا سدا چار کہلاتا اور نیکی سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ اپنے مذہب کے اُصول اور قوانین خواہ وہ باہم کتنے ہی متضاد ہوں نیکی کہلاتے تھے۔

۳۔ آگ کے گرد طواف کرکے یا ہاتھ میں آگ اٹھا کر اپنی سچائی کا ثبوت دینا دلیلِ صداقت تھا جیسے راجہ رام چندر جی کی بیوی سیتا نے اپنے ہاتھ میں آگ اٹھا کر اپنی عفت کا اظہار کیا۔

۴۔ سراب یعنی بدھا کے اثر سے حق معلوم کرنا اور کرانا مروّج تھا ہندو کے رشی بالعموم اسی طرح حق کا اظہار کرتے تھے۔

۵۔ معجزات اور مافوق الفہم کرامات دکھانا حق کا ثبوت تھا جیسے بنی اسرائیل وغیرہ مذاہب میں۔

۶۔ ڈوئل Duel یعنی دو آدمیوں کا مہلک ہتھیاروں کے ساتھ باہم لڑکر دوسرے کو مار دینا سچے ہونے کی دلیل تھا۔ جو اٹھارہویں صدی عیسوی تک۔ یورپ میں رائج رہا موجودہ زمانہ میں حق و باطل پرکھنے اور معلوم کرنے کے مذکورہ بالا معیاروں کی قیمت صفر رہ گئی ہے۔ تمام مذاہب کے اندر روشن خیال تعلیم یافتہ ذی شعور لوگ ان کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ وہ مذاہب۔ جو اپنی قدامت کو ہی دلیل صداقت گردانتے ہیں مثلاً جینی۔ آریہ۔ پارسی اور بدھ وغیرہ انہیں یاد رکھنا چاہیئے ——————

"Old is not the best because of its age, but neither is the new the best because of its novelty."

یعنی نہ تو قدیم محض پرانا ہونے کی وجہ سے بہتر ہے اور نہ جدید محض نیا ہونے کی وجہ سے اچھا ہے لوگ دن بدن عقلی معیار کی طرف آتے جاتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں تعلیم اور ذہنی تربیت ترقی پر ہے۔ دنیا، مذاہب میں ایک انقلابِ عظیم رُونما ہو رہا ہے اور تمام مذاہب کے اندر کوئی نہ کوئی روشن خیال گروہ پیدا ہو کر اپنے اپنے فرقوں کی اصلاح میں مصروف ہے تاکہ اپنے اصلاح پروگرام کو معقول ثابت کیا جاسکے اس لئے اب مذکورہ بالا معیاروں کی بجائے حق اور صداقت معلوم کرنے کے مندرجہ ذیل معیار سمجھے جانے لگے ہیں۔

الف :۔ متنازعہ فیہ مسائل میں ضمیر کا فتویٰ کسے حق قرار دیتا ہے۔

ب :۔ عقل کا فتویٰ کیا ہے؟

ج :۔ اصولِ ارتقاء کس امر کا موید ہے؟

د :۔ نتیجہ کا اچھا اور بُرا ہونا بھی معیارِ صداقت ہے۔

گویا امرِ متنازعہ فیہ میں تمہاری اپنی ضمیر کیا کہتی ہے؟ عقل کا فتویٰ کیا ہے؟ اصولِ ارتقاء کی رُو سے بقاء اصلح کا فیصلہ کس کے حق میں ہے؟ یعنی جو چیز مٹ جائے وہ باطل ہے جو باقی رہے وہ حق ہے کسی اصول پر عمل کے نتیجہ کو دیکھو کہ وہ نسلِ انسانی کے لئے مفید ہے یا مضر؟

حق اور صداقت معلوم کرنے کے یہ معیار گو پہلے معیاروں کی نسبت معقول معلوم ہوتے ہیں مگر نقائص سے یہ بھی خالی نہیں کیونکہ حق معلوم کرنے کے لئے اگر ضمیر کا فتویٰ آخری فتویٰ ہے تو ضمائر کے اختلافات اور شکوک دُور کرنے کا معیار کیا ہوگا؟ اسی طرح عقل انسانی بھی مختلف ہے۔ ہر مذہب میں عقلمند موجود ہیں یا ہر عقیدہ میں اختلاف رکھنے والے ذی شعور پائے جاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اصولِ ارتقاء کی رُو سے انسان باوجود اپنے بلند درجہ کے بالآخر حیوانات کی فہرست میں شامل ہے اور وہ ان جبلی عادات سے خالی نہیں ہوسکتا جو اس کی بہیمیت کا جز بن گئی ہیں اس لئے عقل انسانی بھی جذبات اور جبلی اثرات سے متاثر ہوجاتی ہے۔

رہا مسئلہ ارتقاء میں بقاء اصلح کا اصول یعنی اصلح جو بہتر اور فائدہ مند ہوتا ہے باقی رہتا ہے اور فضول اور بے سود مٹ جاتا ہے۔ یہ اصول حق اور باطل میں بہت دیر کے بعد اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے یعنی باطل مٹ جاتا ہے اور حق باقی رہتا ہے اسی اصول کو غلط سمجھ کر نیٹشے (Nietizsche)

گمراہ ہوا اور اس نے جرمن قوم کو جنگ پر اُبھارا۔ نیٹشے اسی بقاءِ اصلح کی آڑ لے کر کہتا ہے۔

مَردوں کو صرف جنگ کے لئے تیّار کرنا چاہیئے اور عورتوں کو فوجیوں کی تفریح کے لئے اس کے علاوہ اور سب حماقت ہے۔

"Men shall be trained for war and women for the recreation of the warrior. All else is folly."

جب اس خیال پر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس سے دنیا کا امن برباد ہو جائے گا تو اس کا جواب۔یورپ کا ملٹری ازم یہ دیتا ہے:۔

"Welfare is not to be found in material-comforts and in the pleasure of mind or spirit. It is to be found only in the 'will to power', in strength and in victory."

یعنی قوم کی فلاح نہ تو مادی آرام و راحت میں ہے اور نہ قلب و رُوح کی شادمانیوں میں۔ وہ صرف قوت اور فتح میں غالب آنے کے زبردست ارادہ میں ہے۔

یہ خیالات جو۔یورپ کے ملٹری ازم میں پیدا ہوئے وہ مسئلہ ارتقاء کے اصول بقاءِ اصلح کے نظریہ سے پیدا ہوئے کہ جنگ اور خونریزی کے ذریعہ کمزوروں کو مٹا کر اپنے آپ کو اصلح ثابت کیا جائے مگر اس علمی اصول کے متعلق ہکسلے Huxley کے الفاظ یاد رکھنے چاہئیں:۔

"Survival of the fittest does not mean survival of the best. It means no more than the survival of those best fitted to cope with their circumstances."

بقاءِ اصلح سے مراد بقاءِ افضل نہیں اس سے مراد صرف ان اشیاء کی بقاء ہے جو اپنے ماحول کے بالمقابل اصلح ہوں۔

خود قرآن مجید جس نے سب سے پہلے اس اصول کو بیان فرمایا ہے:۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ط وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ط كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ط فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ج وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ط ۔(۱۳:۱۷)

"اس نے بادل سے پانی اتارا پھر ندیاں اپنے اپنے اندازہ کے مطابق بہ نکلیں پس سیلاب اوپر اُٹھے ہوئے جھاگ کو بہالے جاتا ہے اور اس میں جسے آگ میں تپاتے ہیں زیور یا اور سامان بنانے کے لئے اسی طرح جھاگ ہوتا ہے۔ یونہی اللہ حق اور باطل کی مثال دیتا ہے سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے اور وہ۔ جو لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے زمین میں ٹھہرا رہتا ہے"۔

پانی کا خاصہ ہے کہ وہ پہاڑوں اور ٹیلوں پر سے زور کے ساتھ ندی نالوں میں بہ نکلتا ہے جب ندی تنگ ہوتی اور پانی میں زور ہوتا ہے تو اس کے اوپر جھاگ پھیل جاتی ہے اسی طرح جب سونا چاندی وغیرہ دھاتوں کو آگ پر پگھلایا جاتا ہے تو اس پر بھی جھاگ اُوپر اُٹھ آتی ہے۔ یہ جھاگ ضائع جاتی ہے پانی اور سونا چاندی باقی رہ جاتے ہیں جو انسان کے لئے مفید اور نفع مند ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کے آسمانِ کبریائی اور جلالت و احسان سے وحی الٰہی کا پانی نازل ہوتا ہے اور ندیاں جن سے مراد اس کے بندوں کے دل ہیں اپنی اپنی وسعت اور قدر کے مطابق اس آسمانی بارش سے فیضیاب ہوتی اور بہ نکلتی ہیں۔ کچھ شکوک و شبہات کی جھاگ بھی ان کے اُوپر پیدا ہو جاتی ہے

جو تھوڑی دیر کے بعد خود بخود گم ہو جاتی ہے اسی طرح انوارِ علومِ قرآن تنگ اور وسیع دِلوں میں کم و بیش جگہ پاتے ہیں جس طرح پانی کے اُوپر جھاگ پھیل جاتی ہے اور معدنیات کو آگ پر پگھلانے سے ان پر میل اٹھ آتی ہے اور یہ لوگوں کی طہارت اور خبث اور قوت و قلت فہم کے مطابق ہوتا ہے کسی پر میل زیادہ اور کسی پر بالکل کم ہوتی ہے اسی طرح علوم کے ساتھ شکوک و شبہات کی جھاگ مل جاتی ہے۔ جو بالآخر زائل اور ضائع جاتی ہے صرف علم، دین اور دانائی باقی رہ جاتی ہے لیکن یہ سب کچھ ایک محدود جگہ اور ایک خاص ماحول میں ہوتا ہے چنانچہ قرآن مجید خود ہی فرماتا ہے :۔

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (۵ : ۱۴)

"سو اِن (یہود و نصاریٰ) کے مابین ہم نے عداوت اور بغض قیامت کے دن تک ڈال دیا۔"

یعنی یہود و نصاریٰ کا وجود اور ان میں بغض و عداوت قیامت تک رہے گی یا مذہبی دنیا میں حق اور باطل، دونوں قیامت تک رہیں گے۔ پس مسئلہ ارتقاء کا اصولِ بقاءِ اصلح بھی کلیتہً حق و صداقت کو باقی رکھنے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

چوتھا معیار یعنی کسی اصول پر عمل کرنا اور چلنا پھر اس کے نتیجہ کو دیکھ کر حق اور باطل کا تصفیہ ایک دُور کی راہ ہے اور اس میں بھی شکوک اور ابہام موجود ہیں کیونکہ اعمال کی جڑ اور بنیاد تخیلات اور تصوّرات ہیں۔ نیّت کی خرابی ہی درحقیقت اخلاقی خرابی ہے خواہ نتیجہ اچھا ہو اس لئے نتائج کے اچھے بُرے ہونے کا معیار ناقص اور ناقابلِ اطمینان ہے کیونکہ بعض اوقات ایک کام کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے گو کام اچھا ہوتا ہے اس کی بہت سی مثالیں

ہر شخص کی اپنی زندگی میں مل سکتی ہیں حق اور باطل معلوم کرنے کے ان تمام مقبول عام معیاروں کو توڑ دینے کے بعد اگر ہم اقرار کریں کہ راستی اور نیکی معلوم کرنے کا کوئی معیار ہمارے پاس موجود نہیں تو کیا حق اور باطل دونوں برابر برابر اور یکساں ہ نسلِ انسانی کا تجربہ اور حتمی فیصلہ یہی ہے کہ حق اچھا اور باطل بُرا ہے دنیا کے امن کی بنیاد حق پر ہے باطل پر نہیں اگر باطل کو حق پر ترجیح دے دی جائے تو ہمارا تمدن، ہماری معاشرت، تہذیب اور کلچر سب خطرہ میں پڑ جائیں گے حق اور صداقت کا معیار جسے معلوم کرنے کو علماء اور حکماء سرگردان اور حیران ہیں وہ سورۃ فاتحہ میں بتا دیا گیا ہے۔

سورۃ فاتحہ کی رُو سے حق و صداقت کا معیار

الحمدللہ کی تفسیر کرتے ہوئے

بتایا تھا کہ حمد میں تین قسم کے دلائل کا ذکر ہے (۱) وہ دلائل جو اشیاء کے حُسن و خوبصورتی سے متعلق ہیں (۲) وہ جن کا تعلق علم و حکمت کے ساتھ ہے (۳) جو اخلاقِ حسنہ اور نیکی کی بنا پر ہیں اس لئے ہمارے ایمان کی بنیاد الحمدللہ پر رکھی گئی ہے یعنی نہ صرف ایک خدا ماننا ہی فرض ہے بلکہ اسے ہر قسم کی خوبی۔ صداقت اور نیکی کا مجمع ماننا ضروری ہے اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوتی اس کے بعد یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ دُکھ اور مصائب کے اندر، عیش اور آرام میں، فتنہ و فساد کے وقت، یہ ایمان آزمایا یا مضبوط کیا جاتا ہے کہ واقعی ایک شخص الحمدللہ کا دِل سے قائل ہے یا اس کا ایمان صرف قولی اور منہ کا اقرار ہے (Faith in God) یا ایمان باللہ تمہاری اپنی نگاہ میں کتنی قدر اور قیمت کی چیز ہے کیونکہ دُنیا کی زندگی کا مقصد صرف حصولِ عیش اور آرام نہیں بلکہ اعلیٰ کریکٹر اور سیرت پیدا کرنا ہے۔ حیاتِ انسانی صرف عیش کا نام

نہیں بلکہ اس کی اصل غرض روحانی نشو ونما ہے۔ عیش ونشاط اُن قوموں کا نصب العین ہوسکتا ہے۔ جو خدا کے بیٹے کہلاتے ہیں کیونکہ باپ کا فرض ہے کہ وہ اپنی طبعی محبت سے بیٹے کو آرام پہنچا کر اپنے جذبۂ محبت کو سکون دے خدا کا یہ تخیل اور تصوّر آریہ ایشور کے بیٹے ہیں یا بنی اسرائیل خدا کا پہلوٹھا بلکہ اکلوتا بیٹا ہے پکارنے والی ہنود و۔ یہود اور نصاریٰ اقوام کا ہوسکتا ہے مسیحی جو مسیح ابن اللہ ہیں ہو کر سب خدا کے بیٹے بن بیٹھے اور خدا کو صرف باپ باپ کہہ کر پکارتے ہیں اس کے خلاف مسلمانوں کو تو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خدا جو حُسن و صداقت اور نیکی کا خدا ہے وہ رَبُّ العالمین بھی ہے اس کی طرف سے حق اور صداقت بذریعہ وحی القا کیا جاتا ہے کہ جس کے ذریعہ کل اقوام کی تربیت ہوتی ہے۔ پس صداقت اور نیکی کا پہلا معیار

صداقت اور نیکی کے معیار

اس نیکی اور صداقت کا خدا کی طرف سے ہونا ہے اور اس کا دوسرا معیار جُملہ رَبُّ الْعَالَمِیْن میں مذکور ہے جو الحمدللہ کے جُملہ کی تکمیل کرتا ہے یعنی حقیقی نیکی وہ ہے جس میں ایک فرد کا ہی مفاد نہ ہو بلکہ کل لوگوں کی بحیثیت مجموعی تربیت اور نشوونما ہوتی ہو۔ کیونکہ کسی ایک فرد کی زندگی میں بعض اوقات ایک نیکی کا نتیجہ غلطی سے بُرا سمجھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص نے کسی واعظ کی تلقین سے متاثر ہو کر نماز پڑھنی شروع کر دی اسی دن اتفاق سے اس کا بیٹا فوت ہوگیا اس بے وقوف اور اس کے احمق دوستوں نے نتیجہ یہ نکالا کہ اس کی نماز نے ہی بیٹے کی جان لی۔ بعض اوقات ایسے چند اتفاقی حادثے ملا کر ایک قاعدہ کُلّیہ بنا لیا جاتا ہے یہ نہیں سوچا کہ کروڑہا انسان جو نماز پڑھتے رہے ہیں کیا سب پر یا ایک متعدد بہ تعداد پر ایسی ہی مصیبت وارد ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہ قاعدہ کُلّیہ تو کیا لاکھوں اور کروڑوں میں ایک کی نسبت بھی نہیں رکھتا۔

کروڑہا انسانوں کی روزانہ نماز کے بالمقابل ایک فرد کا حادثہ کوئی نسبت نہیں رکھتا پس جس طرح یہ ضروری ہے کہ نیکی اور صداقت کا سرچشمہ وحی الٰہی ہو اس کا دوسرا معیار یہ ہے کہ وہ حکم مفید ہو اس سے قوموں کی زیادہ سے زیادہ تربیت ہو نہ یہ کہ ایک فرد یا چند اشخاص کے لئے مفید یا مضر ہو اس لئے یہاں عالمین جمع کے صیغہ میں لایا گیا ہے نیکی وہ ہے جو بحیثیت مجموعی مفید ہونے کی اور حق کا صرف خوشی یا فرحت پہنچانے والا ہونا بھی ضروری نہیں کیونکہ اکثر اوقات انسان کی تربیت دُکھ کے ذریعہ بھی ہوتی ہے ایک طالب علم جو علم حاصل کرنے کے لئے دکھ اٹھاتا ہے بڑی مدت کے بعد اس کا دکھ سکھ میں تبدیل ہوتا ہے رَبّ العالمین کی ترکیب میں تدریج یا وقت اور ماحول کی مناسبت کے لحاظ سے ترقی دینا بھی مضمر ہے اس لئے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک وقت کسی امر کو نیکی سمجھا جاتا ہو دوسرے وقت اسی کام کو نیکی نہ سمجھا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک نبی کو کسی قدر سختی کی تعلیم دی جاتی ہے مگر دوسرے وقت ایک اور نبی کو نہایت نرمی کی تعلیم دی جاتی ہے اور بعض نیکیاں مختص بالزمان اور مکان ہوتی ہیں ویدوں کی تعلیم اپنے زمانہ اور ملک و قوم کے لحاظ سے نہایت مناسب ہوگی اور ذریعۂ نجات ہوگی اور دوسرے وقت ایک اور قوم میں توراۃ کی تعلیم ہدایت اور نُور ہوگی۔ جناب مسیحؑ کی تعلیم بھی مختص بالقوم اور مختص بالزمان تھی البتہ وہ تعلیم جو ربوبیتِ عامہ یا کل نسلوں قوموں اور عالموں کی تعلیم اور تربیت کے لئے نازل ہوئی۔ وہ عالم گیر تعلیم کہلاتی ہے مگر اس دعویٰ کی صداقت کا ثبوت اس کے اپنے دعویٰ اور اس کے بعد تجربہ سے اس کے مفید عام ثابت ہونے پر ہے مثلاً کسی زمانہ میں مچھر اور مکھی کو مارنا ظلم اور گناہ سمجھا جاتا تھا مگر اب مکھی اور مچھر مارے بغیر

چھوڑ دینا چڑیا گھر سے بھوکا شیر چھوڑ دینے سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا ہے جسے کوئی عقلمند عقل کا کام نہ سمجھے گا کیونکہ شیر اگر ایک دو جانوں کا نقصان کر دے گا تو مکھی اور مچھر بیماریوں کے جراثیم پھیلا کر سینکڑوں اور ہزاروں بلکہ کبھی کبھی لاکھوں کی جان لیتے ہیں پس مکھی اور مچھر کے ساتھ ہی ان لوگوں کا مذہب بھی ختم ہو جاتا ہے جو "اہسنا پرمو دھرمہ اہسنا پرمو دھرمہ" کی رٹ لگاتے ہیں (یعنی کسی جاندار کو نہ ستانا ہی اعلیٰ درجہ کا دھرم ہے)۔

اسلام ساری دنیا کے لئے ایک دعوت عمومی ہے

رَبُّ الْعَالَمِیْن کا جملہ اصولِ ارتقاء کا موید ہے مگر اصولِ ارتقاء صرف مقابلہ۔ انفرادی جدوجہد اور تعمیری اصولوں پر ہی کام نہیں کرتا یہ صرف ابتدائی تخلیق یا ایک خلیہ (Cell) والے جانوروں میں کام کرتا ہے ترقی یافتہ حیوانات میں تعاونِ باہمی کا اصول کارفرما ہے مثلاً اکٹھے مل کر شکار کرنا۔ اجتماعی طور پر دشمنوں کی مدافعت کرنا چنانچہ شہد کی مکھی چیونٹی وغیرہ اسی اصول پر کاربند ہیں اسی طرح انسان کی ترقی بھی انفرادی نہیں بلکہ کنبہ، قوم اور جماعت کے ساتھ ترقی ہوتی ہے۔ وہ مذاہب جن میں رہبانیت برہمچریہ یا تجرّد کی زندگی ذریعہ نجات ہے وہ صرف ایک خلیہ One cell والے جانوروں سے مماثلت رکھتے ہیں اسلام نسلِ انسانی کے لئے رَبُّ الْعَالَمِیْن کی بشارت لے کر آیا ہے یعنی اس کی تعلیم اور تربیت بحیثیت مجموعی ساری نسلِ انسانی کے لئے ہے نہ اس میں تجرّد، سنیاس برہمچریہ یا رہبانیت ہے نہ برہمن چھتری ویش اور شودر کے لئے الگ الگ اور مختلف طریقہ ہائے نجات ہیں بلکہ وہ بشارت عمومی ایک اجتماعی تحریک اور کل نسلِ انسانی کے لئے ایک ہی مکمل کورس اور قانون ہے اس کا مقصد کسی ایک خاص قوم اور

ملک کی اصلاح نہیں بلکہ نسلِ انسانی کے سارے کنبہ کی ہدایت اور اصلاح ہے۔

ربّ العالمین کی دلیل سے دہریہ علماءِ نفسیات کی تردید

نسلِ انسانی کے لئے دکھ ہیں اور اتنے دکھ ہیں کہ نفسیاتِ انسانی کے ماہر جو نفسِ انسانی کے جذبات کا بہت قریب سے مطالعہ کرتے ہیں دُکھوں کی کثرت دیکھ کر اکثر اور بیشتر دہریہ ہو جاتے ہیں امریکہ کے ایک رسالہ میں ایک شخص نے خدا اور ما بعد الموت زندگی کے متعلق چند ایک سوالات تجویز کر کے سائنس کے مختلف شعبوں کے ۱۲۳۰۰۰ علماء کے پاس اظہار خیال کے لئے بھیجے۔ سائنس کے اور تمام شعبوں کے علماء میں خدا کی ہستی اور ما بعد الموت زندگی کے منکر نسبتاً بہت کم نکلے مگر علماءِ نفسیات فی صدی زیادہ دہریہ پائے گئے ان میں سے صرف دس فیصدی خدا کی ہستی کے قائل تھے چنانچہ علماءِ نفسیات کا خیال ہے کہ نسلِ انسانی میں بے انتہا دکھ ہونا کسی رحیم کریم خدا کے نہ ہونے کی دلیل ہے ان کا کہنا ہے :-

"Of living creatures inhabiting this earth, the human species is the greatest sufferer."

"روئے زمین پر آباد زندہ مخلوق میں نسلِ انسانی سب سے زیادہ دُکھی ہے۔"

کسی نوع مخلوق کو اس قدر دُکھ اور اتنے طویل دُکھ نہیں دیئے گئے جس قدر انسان کو دیئے گئے ہیں۔ حیوانی زندگی میں اندوہناک مصائب قریباً قریباً ناپید ہیں مگر انسانی زندگی غم کے بغیر ملنا محال ہے۔ انسان جس قدر زیادہ ترقی یافتہ اور تکمیل پذیر ہوتا ہے اسی قدر اس میں دکھوں کی مزاحمت

زیادہ ہوتی ہے غم واندوہ کے سوتے سود و زیاں کے تخیلات ہیں ناکامیوں اور مایوسیوں میں جذبات اور احساسات کا تصادم ہوتا ہے نیز انسان کی ساری مصیبتیں ایک جیسی نہیں سینکڑوں انفرادی مصائب معمولی تدبیروں اور پیش بندیوں سے دُور ہو جاتے ہیں زیادہ اہم اور مشکل مصائب جماعت اور سوسائٹی کے مشکل مصائب ہیں ان پر بھی غلبہ اصلاحی کوششوں اور قانونی حد بندیوں سے پالیا جاتا ہے مگر سب سے زیادہ ناقابلِ اصلاح وہ دکھ ہیں جو انسان کی روح میں جڑ پکڑے ہوئے ہیں دوسروں سے تعصّب ۔ حسد ۔ بغض ۔ کینہ ۔ غیض و غضب جن کی بنا مذہب فرقہ یا قومی عصبیت پر ہوتی ہے ان دکھوں سے تنگ آکر ہمارے شعرا کو کہنا پڑا کہ ساری خدائی میں صرف انسان خدا کا سوتیلا بیٹا ہے۔ پیدائش سے لے کر مرنے تک اولاد کا دکھ، روٹی کمانے کی مشکلات، کما کر بھی آزادی سے کھا نہ سکنے کا دُکھ، احباب کی جدائی، بے اعتنائی اور بے وفائی کا دَرد، اپنے ہی جیسے کسی انسان کی مظلومانہ موت کا صدمہ ایک قوم اور فرد کے دوسری قوم اور فرد پر ظلم و ستم ناموافقتِ آب و ہوا سے بے شمار بیماریوں کے حملے ۔ اچانک حادثوں اور ناگہانی آفات کے دُکھ ان تمام اقسام کے دُکھوں اور ان کی شدت کے مدارج اور بالمقابل انسانی دل کی ناتوانی اور نزاکت کی وجہ سے بے شمار تمناؤں اور آرزوؤں کا خون ہوتے ہوئے دیکھ کر کسی نے کہا ہے

آرزُو اور آرزُو کے بعد خُونِ آرزُو
ایک مصرعہ میں ہے ساری داستانِ زندگی

شعرا، پر ہی کیا منحصر ہے مہاتما بدھ نے انسان کی اِس دُکھ بھری کہانی کا عمر بھر رونا رویا ہے اور کہا:۔

"I teach only one thing: suffering and emancipation from suffering"

"میں تمہیں صرف ایک ہی بات سکھاتا ہوں دکھ اور دکھ سے نجات کیوں کر ملتی ہے۔"

عیسائیت کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان فطرتاً گنہگار اور دکھ میں پیدا کیا گیا ہے۔ سکھ مذہب کے بانی بابا نانک کا قطعی فیصلہ یہ ہے:

"نانک دُکھیا سب سنسار"

ویدوں کے رشی اسی دکھ کو دیکھ کر پرمیشور سے یوں شکوہ سنج ہوئے:

यद् इन्द्रः यवतस्त्वम् इत्यवद अहम्
ईशिस्तोत्रम् इद् दोहिष्ये न पपत्वरासि।

"Yad inder yavatas twam etavad aham eshi stotaram iddohishye na papatvar rasi."

یداندر یاوتستوم ایتاوداہم ایشی ستوتارم اوددھیشے ناپاپتوار راسی۔

"اے خدا تُو تو انسان سے بھی بڑھ کر ظالم ہے۔ اگر مجھے اس قدر حکومت ملی ہوتی جس کا تُو مالک ہے تو میں اپنی تعریف کرنے والے کو خوب پالتا۔ اس قدر دکھ اور مصیبت میں اسے نہ چھوڑتا۔"

اگر بڑے بڑے مہاتما رشیوں اور منیوں کو خدا سے شکوہ تھا اور خدا کا اکلوتا بیٹا (بقول عیسائی مذہب) صلیب پر انتہائی دکھ اور مصیبت کے وقت یہ گلہ نہ کرتا "ایلی ایلی لما سبقانی" اے میرے خدا اے میرے خدا تُو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا، تو شعراء کی زبان سے خدا کا شکوہ گستاخانہ سمجھا جاتا ڈاکٹر اقبال شکوہ سنج ہے "نا دیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل۔ بیدست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیئے۔ بڑا کرم کیا دیدۂ بینا دیئے مگر دیکھنے کو ایسے بھیانک

نظارے بھی پیدا کر دیئے۔" شاعر کا خیال ہے کہ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ دیدۂ بینا نہ دیا جاتا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (۹۰ : ۴)

ہم نے انسان کو دُکھ اور مصیبت میں پیدا کیا ہے پس شاعر کو حق ہے کہ وہ یہ کہے ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

اس قدر دکھوں کی موجودگی میں انسان کے منہ سے الحمدللہ نکلنا اور اس کے معانی کو جان کر الحمدللہ کہنا جبر اور اکراہ سے خدا کا شکر کرنا ہے اور یہ امر مسلم ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ (۲ : ۲۵۶) دین میں جبر نہیں۔ اس لئے الحمدللہ پر جو اعتراض ہے اس کا جواب قرآن مجید کو ہی دینا چاہیئے کیونکہ وہ ایک کامل کتاب ہے اور سورۃ فاتحہ بھی ایک کامل کتاب ہے تو اس اعتراض کا جواب اسے خود ہی دینا چاہیئے چنانچہ الحمدللہ کے بعد جملہ رَبّ العالمین آتا ہے کہ دنیا میں نسلِ انسانی کے لئے اس قدر دکھ کیوں ہے اور اس کے باوجود انتہائی دکھ کی حالت میں بھی الحمدللہ پڑھنے کی تلقین کیوں ؟ فرمایا وہ رب العالمین ہے۔ اللہ تعالےٰ کا نام رَبّ اصولِ ارتقاء کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے۔ اصولِ ارتقاء یہ ہے کہ حیوانی زندگی بالخصوص انسانی زندگی میں دُکھ آئیں کیونکہ ترقی اور دکھ دونوں لازم و ملزوم ہیں چونکہ انسان کی ترقی لامحدود ہے اس لئے اس کے دکھ بھی بہت زیادہ ہیں اللہ تعالےٰ اس دلیل کو قرآن مجید میں خود بیان فرماتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (۹۵ : ۴، ۵)

فلسفہ دُکھ

انسان اپنے تمام قواءِ دماغی اور روحانی کے لحاظ سے اعلےٰ پیمانہ پر پیدا کیا گیا ہے۔ مگر اس کے بلند پلڑے کو جھکا کر سب سے نیچے رکھ دیا ہے۔ جہاں اس کے لئے مزاحمتیں اور دکھ ہیں مگر انہی دکھوں دشوار یوں اور تاریکیوں کے اندر اس کی جڑ اپنی خوراک تلاش کرتی ہوئی اپنی نرم و نازک مگر مضبوط سوئی سے پہاڑوں کا جگر شق کرتی اور اپنی شاخوں کو فضائے آسمانی میں بلند کرتی ہے بلاشبہ اس کی قسمت سخت ہے پر اس کی رفعت اور عظمت جس پر وہ اپنی جدوجہد سے چڑھتا چلا جاتا ہے وہ اسے کل کائنات پر فوقیت اور فضیلت دیتی ہے۔

انسان کے لئے سب سے بڑا دُکھ موت ہے خصوصاً وہ موت جو قبل از وقت آجائے اور وہ اکثر خوفناک اور دردانگیز ہوتی ہے مگر دکھ کی فلاسفی سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ موجودہ نظامِ قدرت الحمدللہ کی تفسیر ہے۔ جو اپنے اندر کمالِ حُسن صداقتِ کامل اور حقیقی نیکی کا جوہر رکھتا ہے اس سے بہتر نظام کوئی عقلمند اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا بے شک اس میں زندگی اور موت دونوں کا عمل موجود ہے اِس نظامِ قدرت کے ماتحت اس دنیا سے انسان کا جانا اس لئے ضروری ہے کہ دوسرا اس کی جگہ آئے اور ایک نسل کی جگہ دوسری نسل پیدا ہو اس کے برعکس اگر یہ فرض کیا جائے کہ ایسی دنیا کیوں نہ ہوئی جس میں لوگ کبھی نہ مرتے تو ایسی دُنیا لازماً ساکن ہوتی اور لوگوں کو اس غیر متبدل حالت کی زیادہ شکایت ہوتی۔ انسان کا دل پتھر کی طرح سخت یا بے حس ہوتا کہ اس کی ترقی مسدود ہوتی۔ موت اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کی آمد

جاری رہے اگر آمد بند کر دی جائے تو موت بھی رک جائے اور مخلوق محدود رہے گی اور ہمیشہ موجود رہے گی مگر سنو قرآن مجید کیا کہتا ہے۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (۶ : ۴۵)

رَبُّ العالمین کی حمد اسی میں ہے کہ ظالموں کی بیخ کنی کی جائے۔

ظالموں کا دنیا سے رخصت ہونا نہایت ضروری ہے اگر یہ اصول دنیا میں نہ ہوتا تو اچھے بھلے آدمی بھی ظالم ہو جاتے۔ دنیا کے اندر انسان کا اپنا نظام بھی ظالموں کی بیخ کنی کے لئے موجود ہے اور الٰہی نظام کا موید ہے۔ حکومت، فوج۔ پولیس۔ عدالتیں۔ قانون۔ قید خانے قتل اور پھانسی کی سزا سب اسی غرض کے لئے ہے کہ ظالموں کی بیخ کنی کی جائے۔ اگر ان سب کو کچھ عرصہ کے لئے اٹھا لیا جائے اور لوگوں کو جی کھول کر سب کچھ کرنے کی آزادی دے دی جائے اور مذہب کی حکومت سے بھی لوگوں کو آزاد کر دیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ ظلم اور شرارت کی بے حد ترقی ہوگی۔ پس موت ایک تو اس لئے رحمت ہے کہ وہ ظلم اور تعدّی پر ایک زبردست احتساب یا چیک ہے۔

دوسرے اس زمین کی قوتِ پیداوار محدود ہے اگر اس دنیا سے لوگ رخصت نہ ہوتے تو یہ زمین کبھی کی لوگوں کے لئے عذاب کا باعث ہو جاتی اور اگر دنیا کی صورت یہ فرض کر لی جائے کہ یہاں نئے افراد کی آمد بھی نہ ہوتی اور نہ یہاں سے کوئی روانگی ہوتی تو یہ اصول شروع دُنیا سے تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اُس وقت روئے زمین پر صرف ایک ہی جوڑا تھا۔ بہرحال کچھ مدت کے بعد ہی سلسلہ توالد کو بند کر کے موت کو روک دیا جاتا مگر اس صورت میں دنیا کی بہت سی دِلچسپیوں کا خاتمہ ہو جاتا اور وہ مادری محبت اور معصوم بچوں کی جنّت جو دنیا میں ایک عجیب چیز ہے سرے سے مٹ جاتی

اس کے علاوہ ایسی دنیا بھی ساکن اور بے لطف ہوتی۔

تیسرے حیوانی زندگی کے اندر دو ترغیبیں سب جگہ جاری و ساری ہیں ذاتی مفاد کے لئے جدو جہد۔ اولاد اور دوسرے بنی نوع انسان کے لئے ہمدردی اور ان کی خاطر قربانی۔ مختلف حیوانات میں ان دونوں تحریکات کا وجود موجود ہے فرق صرف تناسب کا ہے۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں یہ دونوں تحریکیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ نسلِ انسانی میں یہ تناسب مجرمین سے لے کر شہداء تک بالکل مختلف ہے۔ ایک طرف اگر ذاتی مفاد ہی مدنظر ہوتا ہے تو دوسری طرف دوسروں کی خاطر کامل قربانی نظر آتی ہے صراطِ مستقیم ان دونوں قسم کے یعنی ذاتی مفاد اور دوسروں کے لئے قربانی کے جذبات کے اندر درست توازن قائم رکھنے میں ہے پس اس لحاظ سے موت اگر فرد کے لئے ناگوار ہے تو بنی نوع انسان کے لئے بحیثیتِ مجموعی بہت بڑی بھلائی ہے، ذاتی زندگی کا احساس ہمیں موت سے خائف اور اس کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر بقاءِ نوع کا احساس موت کو خوشی سے قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ پس خداوندِ عالم کی صفت رَبُّ الْعَالَمِیْن جو درجہ بدرجہ نشو و نما اور موت کے بعد بھی ترقی دینے کی ضمانت دیتی ہے وہ نہ صرف ایک نسل کے بعد دوسری نسل کے لائے جانے کی مقتضی ہے بلکہ لوگوں کی صحیح تربیت اس میں ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دن موت کا بھی ہو، اس لئے قرآن مجید نے اثباتِ باری تعالیٰ کے دلائل میں موت کو بھی بطور دلیل کئی ایک آیات میں پیش کیا ہے۔ بلکہ گذشتہ زمانہ کے سب سے بڑے دہریہ (فرعون) کا موت کی دلیل سے ہی خدا کی ہستی کا قائل ہو جانا بیان کیا ہے۔ نفسِ انسانی کا ایک بہت بڑا خسران اگر نخوت و تکبّر سے خدا کی ہستی کا انکار ہے

تو اس کی شکست صرف موت ہی سے ہو سکتی ہے چنانچہ فرمایا

حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (۱۰ : ۹۰) سب سے بڑے منکر خدا اور متکبر کی جو اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (۷۹ : ۲۴) یعنی بنی اسرائیل کی انتہائی ذلت اور غربت کے بالمقابل اپنے آپ کو ان کا رب اعلیٰ سمجھتا تھا اس کی یہ انتہائی شکست ہے کہ وہ بالآخر اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ پکارنے پر مجبور ہوا کہ میں ایمان لایا اس پر کہ نہیں کوئی معبود مگر وہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ بعینہٖ اس زمانہ کے ایک مشہور دہریہ کا قصہ ہے کہ اس نے اپنے کمرہ میں یہ لکھ کر چسپاں کر رکھا تھا کہ خدا کہیں بھی موجود نہیں "God is nowhere" مگر جب موت اس پر آموجود ہوئی تو وہی دہریہ اپنی آنکھیں مل مل کر بار بار اسے پڑھتا تھا "God is now here"

"خدا اب یہاں ہے"

پس زندگی کی نسبت موت خدا کی ہستی پر زیادہ قطعی دلیل ہے اور اسی موت پر نسلِ انسانی کا فائدہ بہتری اور آیندہ نشو و نما کا انحصار ہے۔

دُکھ اور خطرات کا فلسفہ

اس کے بعد دُکھ اور خطرات کی فلاسفی بھی سمجھ لینی چاہیئے۔ بلاشبہ انسان ایک ایسی دنیا میں رہتا ہے جس میں چاروں طرف خطرات ہیں۔ زمین کی بناوٹ کے لحاظ، اختلاف آب و ہوا کے اعتبار سے، درندے اور زہریلے جانوروں کی وجہ سے۔ بے شمار مہلک جراثیم نے بھی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ لوگوں کے باہمی بگڑے ہوئے حالات کے سبب سے

بھی دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے مگر اس ساری دُکھ بھری دنیا کے بالمقابل ایک ایسی دنیا فرض کر لیجئے جہاں کوئی خطرہ نہیں۔ جس کی آب و ہوا کسی لحاظ سے غیر موافق نہیں جس میں بیماریاں نہیں اور نہ زخم درد کرتے ہیں اور نہ انسان کی اپنی غلطیاں ہی اس پر دکھ لاتی ہیں ظاہر ہے کہ وہ دنیا انسان کے اپنے اختیار کی دنیا نہ ہوگی کیونکہ اختیار غلط اور صحیح میں امتیاز کا نام ہے۔ کوئی تمیز اور اختیار غلطی کے احتمال سے خالی نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی غلطی سزا کے بغیر متمیز ہو سکتی ہے اور نہ سزا کا تصوّر دکھ کے بغیر ہو سکتا ہے اگر سزا کسی کو بھی نہ ملے تو صواب اور غلطی میں قطعاً کوئی فرق نہ ہوگا۔ سیدھی اور کج راہ دونوں یکساں ہوں گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں کسی قسم کی ترقی بھی نہ ہوگی نہ کوئی اخلاقی بھلائیاں ہوں گی اور نہ روحانی نیکیاں مگر نیکی اور بدی میں تمیز دے کر انسان کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما کرنا اللہ تعالےٰ کی صفتِ رَبّ کا تقاضا ہے اس کے خلاف آپ فرض کیجئے انسان خواہ کچھ بھی کرتا مگر کبھی نہ مرتا۔ وہ جو کچھ بھی کھاتا مگر اس کا کچھ بھی نہ بگڑتا نہ بیمار ہوتا تو انسانی جسم کی ساخت اور اس کی پُر حکمت مشینری کے متعلق ہمیں کوئی علم نہ ہوتا اور دُنیا کے اکثر اور بیشتر عجائبات اور خواص الاشیاء سے ہم کبھی واقف نہ ہوتے زندگی اور موت کے بین درمیان ہیں ہونے کی وجہ سے دکھ اور درد کی حکمت دو گونہ ہے۔ ایک تو علم طب تشریح الاجسام یا علم الانسان اور خواص الاشیاء سے واقفیت اور دوسرے خدا کی ہستی کا اقرار اور اس پر ایمان کا ثبوت اس سے حاصل ہوتا ہے۔ دَردِ فی الحقیقت زندگی کا سیفٹی والو (Safety valve) یا خطرہ کا الارم ہے جو انسان کو غفلت سے جگا کر علاج و درماں کے لئے ہوشیار کرتا ہے۔ اس لئے

جس قدر درد زیادہ ہوگا اس کا احساس شدید ہوگا اسی قدر زیادہ سعی اور کوشش سے ہماری ذہنی قوتیں بچاؤ کی تدبیر کرتی ہیں۔ ہمارے اعصاب کا شدید طور پر ذی حس ہونا اور ان کی خبر رسانی پر دماغی مشینری کا دوا و علاج کے لئے فوراً حرکت میں آنا عجائباتِ قدرت و حکمت سے ہے یہ کہنا کہ دنیا میں دکھ زیادہ ہے ایک شاعرانہ مبالغہ اور واقعات کا غلط اندازہ ہے بلاشبہ دنیا میں دکھ ہے لیکن جس قدر اس کا احساس اور قیاس ہے اتنا نہیں ہے۔ پھر دکھ کے اندر اصل مقصود صیانتِ حیات اور حفاظتِ زیست ہے دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت ہمیشہ دکھ سے ہی ہوئی ہے اور آئندہ ہوگی۔ جس سے یہ نتیجہ بآسانی نکل سکتا ہے کہ نسلِ انسانی میں دکھ کی غرض ظلم و ستم نہیں بلکہ وہ گوشمالی کرنے والا اُستاد ہے جو اپنے شاگردوں کی بھلائی اور بہتری کا خواہاں ہے۔ چنانچہ فرمایا: وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۵۰ : ۲۹) اور ہم اپنے بندوں پر کچھ بھی ظلم کرنے والے نہیں۔ انسانی زندگی میں بیشتر دکھ ایسے ہیں جو جہالت کا ثمرہ ہیں وہ ہماری زندگی کا مستقل جز نہیں اور نہ زندگی کی غایت ہیں جیسا کہ مسرت اور خوشی ہے چنانچہ فرمایا وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ (۱۰: ۱۰) سفرِ زندگی الحمدللہ رب العالمین سے شروع ہوا زندگی میں ہمارا ہر قدم منزلِ محبوب کے قریب ہوتا گیا راہ کی دشواریاں اور کٹھنائیاں ہماری تیز روی کا موجب ہوئیں اور الحمدللہ کے ذکر سے سب آسان ہوگئیں بڑی سے بڑی مصیبت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (۲: ۱۵۶) پڑھنے سے دُور ہوگئی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمنائیں اور آرزوئیں جن کا خون ہوا جھوٹی تمنائیں اور آرزوئیں تھیں ہماری زندگی کا نصب العین

اور مقصد نہ تھیں۔ بھوک کا خوف، جان و مال کا زیاں، عزیزوں اور اقربا کی جدائی ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ جو سفر زندگی میں تعطل پیدا کر دیتی کیونکہ ہمارا سفر ان سب سے بلند مقصد کے لئے تھا دکھ آتے رہے اور ایک مُعلّمِ خیر کی طرح تعلیم و تربیت اور صبر و رضا کی تلقین کر کے رخصت ہوئے یہاں تک کہ منزل مقصود سامنے آگئی اب نہ دکھ ہے نہ دکھ کا احساس۔ دلی جوش کے ساتھ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی کہتے ہوئے اس سے جا ملے جو اصل مطلوب اور مقصود زندگی تھا یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات۔ سفر زندگی الحمد للہ سے شروع ہوا تھا تو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ پر ختم ہو گیا۔ وَاٰخِرُ دَعْوَاھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

اجتماعی زندگی کے دُکھ ابدھ مذہب کے بنیادی تخیل کا الحمد للہ ربّ العالمین سے علاج،

انفرادی مصائب اور تکالیف کچھ دل کو سمجھانے اور کسی قدر معمولی پیش بندیوں اور تدابیر سے رفع ہو جاتے ہیں مگر زیادہ اٹل اور ہمت آزما مصائب سوسائٹی اور جماعتوں کے مصائب ہیں ان کا تعلق انسان کی رُوح الاجتماع کے ساتھ ہے۔

ربّ العالمین کا جملہ بتاتا ہے ——— کہ دنیا میں مفرد شئے کا تصور محال ہے خواہ وہ برقی اکائی (الیکٹرون) ہو یا بڑے سے بڑا انسان سب دوسروں کے ساتھ متعلق ہیں انسان بذات خود ایک سوشل ہستی ہے۔ جو جماعت کے نقص اور خوبی سے متاثر ہو کر دکھ اٹھاتا یا راحت پاتا ہے۔ ایک فرد کو جو دکھ اور سکھ پہنچتا ہے یا تو وہ اس کے اپنے کسی فعل کا نتیجہ ہوتا ہے یا اس کے والدین۔ آباء و اجداد یا دیگر اقربا کا یا اس کی اس قوم کا جس کا وہ فرد

ہے آج کی غلطی کا خمیازہ یا زمانہ کی صدسالہ ماضی کا۔ پھر وہ ایک ایسا دکھ ہے جس کا اٹھانا ہماری اپنی اور آیندہ نسل کی بہتری کا موجب ہے۔ ماضی کے نقائص کا علاج تعلیم و تربیت عامہ کے ذریعہ ہو بھی جائے تاہم نئے دکھ اور مصائب ضرور آئیں گے اور آتے کبھی بند نہ ہوں گے۔ وہ نئے حالات کی وجہ سے ہوں گے چونکہ یہ دنیا رب العالمین کی صفت کے اظہار سے ترقی کرتی ہوئی آگے کو جا رہی ہے اس لئے نئی نئی ضروریات اور مشکلات انسان کی مزاحمت کرتی ہیں۔ جب ریل نہ تھی موٹریں نہ تھیں ہوائی جہاز وغیرہ وغیرہ ترقی کے زینے نہ تھے۔ لوگ ان کے حوادث سے بھی بے خبر تھے۔ ابتدائی زمانہ میں انسان کے لئے دکھ کی بات یہ تھی کہ اسے پناہ کے لئے کوئی غار نہ ملے۔ اس کے بعد کے دور میں یہ مشکل پیش آئی کہ غار تو ہے مگر پانی اور ہوا کے ریلے سے بچنے کے لئے گھر نہیں تیسرے دور میں گھر ملے تو روشنی کے لئے شیشے کے روشن دان میسر نہ تھے۔ مگر اب شیشے کے روشندان اور کھڑکیاں مل چکی ہیں تو کثرتِ آبادی کی وجہ سے صاف ہوا نہیں ملتی غلّہ اور اناج کی قلّت سے لوگ نالاں ہیں آج وہ بال بچہ دار عورت اپنے آپ کو شہر میں مصیبت زدہ خیال کرتی ہے جسے کھلا باورچی خانہ اور خانساماں نہیں ملتا اور وہ مرد اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتا ہے جسے صبح کے وقت چائے کی پیالی نہیں ملتی لیکن ایک زمانہ تھا جب باورچی خانہ۔ باورچی اور چائے ہمارے خیال میں بھی نہ تھی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ :-

"The luxuries of one age are the comforts of the next, and the necessities of the one after."

ایک زمانہ کے تعیشات آئندہ زمانہ کے آرام اور آسودگی اور

اس سے آئندہ زمانہ کی ضروریاتِ زندگی قرار پا جاتی ہیں۔

زمانہ کی موجودہ رفتار کے ساتھ ساتھ چلنے کے لئے ہم مجبور ہیں اور صفت رب العالمین کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ایک جگہ ساکن نہ رہیں اس لئے موجودہ زمانہ میں تہذیب کا معیار گاندھی کی لنگوٹی ہونا مشکل ہے البتہ چادر شرع نبی پھر بھی اس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ رہا اس سے زیادہ کے لئے مطالبہ اس کے لئے یہ حکم ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۔

"اور اپنی نگاہیں ان کے پیچھے لمبی نہ کر جو ہم نے ان میں سے قسم قسم کے لوگوں کو دنیا کی زندگی اور آرائش کے لئے سامان دیا ہے تاکہ ہم ان کو اس کے ذریعہ سے آزمائیں اور تیرے رب کا دیا رزق بہتر اور زیادہ دیرپا ہے۔" (۲۰: ۱۳۱)

اپنے زمانہ کی تعیشات کے پیچھے پڑنا اپنے آپ کو دکھ میں ڈالنا ہے۔ اس زمانہ میں چونکہ بڑے بڑے دکھ دنیا کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے ہیں اس لئے معمولی دکھوں نے ان کی جگہ لے لی ہے ایک نسل کے دکھ دور ہو جانے پر جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو نئی ضروریات نئے دکھ ان کی جگہ پیش کر دیتی ہیں۔

چوتھا مذہب یاسیت یا قنوطیت کی بنیادی غلطی

مذہب یاس اور قنوطیت (Pessimism) کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ایک تو دکھ کے فلسفہ سے ناواقف ہے جو کسی قدر اختصار کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ دکھ کو ایک مستقل وجود سمجھتے ہیں اور اسے زندگی کی غایت قرار دیتے ہیں حالانکہ دکھ

کا نہ مستقل اور باقی رہنے والا کوئی وجود ہے اور نہ یہ زندگی کی غایت ہے مثلاً سائنس کی تاریخ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ غلطیوں اور شکوک سے بھری پڑی ہے مگر کوئی شخص سائنس کی یہ تعریف نہیں کرے گا کہ وہ اوہام اور اباطیل کے مجموعہ کا نام ہے غلطیاں اس لئے ہیں کہ صحت اور صداقت کو معلوم کیا جائے سائنس کا مقصد شکوک اور غلطیاں پیدا کرنا نہیں۔ یا سادہ الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ایک لڑکا سائیکل پر سوار ہونے کی مشق کرتا ہے وہ بار بار گرتا ہے اس کے متعلق یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ وہ گرنے کی مشق کر رہا ہے اس کا مقصد اور غایت گرنے کی قابلیت بہم پہنچانا نہیں بلکہ سوار ہونا ہے اسی طرح دکھ کا مقصد محض رنج پہنچانا نہیں بلکہ زندگی کی حفاظت اور اپنے آپ کو دکھ سے بچانا ہے۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ وہ آرام وراحت کی نسبت دکھ کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں اس لئے انہیں اس کی کثرت نظر آتی ہے۔ بیماری کے دو ہفتے تندرستی کے پچاس ہفتوں سے زیادہ گراں گزرتے ہیں۔ ہسپتال اور قید خانہ کو دیکھ کر ہم دکھ اور بدی کی کثرت سمجھ لیتے ہیں مگر یہ ظاہر ہے کہ شہر کی پوری آبادی کے ساتھ اسے کوئی نسبت نہیں۔ اسی طرح گذشتہ زمانہ کے تاریخی واقعات میں جنگیں۔ فسادات وغیرہ کی کثرت نظر آتی ہے مگر ان کے بیچ میں جو باغات اور امن وصلح کے نظارے موجود ہیں وہ ہر شخص کی نگاہ سے پوشیدہ رہتے ہیں اس لئے قرآن مجید نے فرمایا:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۱۴ : ۳۴)

اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں آسائشوں اور راحتوں کو گننا چاہو تو نہ گن سکو گے پس دکھوں کے لحاظ سے حال ماضی سے بہتر ہے اور استقبال حال

سے یقیناً بہتر ہوگا مگر ایسا ہونے کے لئے نسلِ انسانی کی مجموعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالےٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا طٰہٰ اے مرد کامل مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى ۔ ہم نے تجھ پر قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ تو دکھ میں پڑے اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۔ اسے اتارنے کی غرض تو یہ ہے کہ جو (اپنے محبوب سے جُدا ہونے سے) ڈرتا ہے اس کے لئے یہ عزت کا اور عظمت کا باعث ہو (۲۰: ۲، ۳) قرآن آیا تو اس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر دکھ بھی آئے اور انتہائی مصائب پیش آئے لیکن تسلّی اس میں ہے کہ یہ دکھ ہمیشہ نہیں رہیں گے ایک نہ ایک دن یہ تاریک اور سختی کے دن کالے بادلوں کی طرح چھٹ جائیں گے۔

صفت ربّ العالمین کی رُو سے ہستی باری پر دلائل کا سلسلہ

جس طرح الحمدللہ کے ماتحت حُسن صداقت اور نیکی تین قسم کے دلائل قرآن مجید نے بیان کئے ہیں اسی طرح صفت رب اور رب العالمین کے ماتحت دلائل کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے اس کا رب ہونا برقی اکائی (الیکٹرون) سے لے کر تمام بڑے بڑے اجرام تک سے ثابت اور ظاہر ہے دنیا کی کوئی چیز ساکن نہیں خواہ وہ مادی ہو یا قلبی اور روحانی۔ مسئلہ ارتقاء کی تفصیلات میں علماء کا اختلاف ہوا کرے لیکن اس سے کس کو انکار ہے کہ ہر چیز کا ایک رب Evolver ہے دنیا کی ہر شئے ترقی کرتی اور ارتقاء کی سیڑھیوں پر چڑھتی جا رہی ہے دنیا کی کسی مذہبی کتاب میں اتنا مختصر اور جامع لفظ جو مسئلہ ارتقاء کی وسیع تفصیل کے ساتھ اس کی جزئیات پر حاوی ہو موجود نہیں کہ جس قدر لفظ رب حاوی ہے۔ دنیا میں ہر چیز دفعۃً واحدۃً

پیدا نہیں ہوئی اور ہر چیز کا پیدا ہو کر درجہ بدرجہ ترقی کرتے چلے جانا کسی چیز کا کائنات میں ساکن نہ ہونا۔ ہر چیز کو اس کے مناسب حال وجود ملنا۔ بقاءِ اصلح کا عالمگیر اور وسیع اصول۔ ہر شے میں دو طرح کی صفات کا پایا جانا یعنی گذشتہ دور کی خصوصیات اور آئندہ ترقی کی استعدادیں۔ نیز ہر شئے میں تدریجی ترقی اور اس کی ترقی اور ربوبیت یا نشو و نما کے سامان کا اس سے باہر خارج میں موجود ہونا۔ جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی ترقی کا ہونا نیز یہ کہ انسان سب سے افضل اور اشرف ہے اور اس کی روحانی استعدادیں لامحدود ہیں۔ قرآن مجید کے فلسفہ کی رو سے۔ بخلاف بائبل اور دیگر کتب مقدسہ یہ دنیا ایک ختم شدہ چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اب بھی تخلیق کرتا ہے اور آئندہ کے لئے بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اسی صفت رب کے ماتحت روحانی اور ربانی لوگوں کی بظاہر ناممکن اور محال حالات میں دعاؤں کا قبول ہونا اصول ارتقاء کے ان تمام جزئیات اور تفصیلات سے قرآن مجید نے جگہ جگہ ہستی باری تعالیٰ پر استدلال کیا ہے اور ایسے ایسے علمی نکات بیان کئے ہیں کہ انہیں معلوم کر کے عقل حیران ہوتی ہے کہ وہ علوم جو اب سائنسدانوں نے برسوں کی موشگافیوں سے اور سالہا سال کے مسلسل غور اور فکر کے بعد بیان کئے ہیں وہ کس طرح قرآن مجید میں (جو دنیا کی اکثر اور بیشتر الہامی کتب سے مختصر ہے) پہلے ہی مذکور ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفت ربّ العالمین کا عملی پہلو

رب العالمین کا مفہوم پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس کائنات کے بنانے والے کا منشا ہر چیز کو درجہ بدرجہ ترقی دے کر کمال تک پہنچانا ہے اس کے ضمن میں بقاءِ اصلح کا اصول بھی کارفرما ہے۔ ہر شے کی ترقی معقول

(Rational) طور پر ہو رہی ہے انسانی تعمیر چونکہ کُل انواعِ عالم میں اعلیٰ اور افضل ہے اس کے دماغی اور روحانی قوا، سب سے اعلیٰ اور ان کی ترقی لامحدود ہے۔ اس کی جسمانی اور روحانی تربیت کے تمام سامان ربّ العالمین نے خارج میں مہیا کر رکھے ہیں اس لئے رب العالمین کا تصوّر انسان کو کبھی مایوس نہیں ہونے دیتا بظاہر حالات خواہ کیسے ہی مایوس کن کیوں نہ ہوں مگر رب العالمین کا تصوّر اسے ترقی کرنے اور بڑھنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ قرآن مجید نے فرمایا:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱ : ۶)

کوئی کیڑا تک بھی زمین میں ایسا نہیں مگر اس کا رزق اللہ تعالےٰ کے ذمہ ہے البتہ ہر جاندار کو اپنے رزق کے حصول کے لئے کوشش کرنا پڑتی ہے۔

"God giveth the fowls meat, but they must fly for it."

(خدا پرندوں کو گوشت دیتا ہے مگر انہیں خود اس کے لئے پرواز کرنی پڑتی ہے)

اپنے رزق اور نشو و نما کے سامان حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا حیوانات کی فطرت میں داخل ہے مگر انسان کی ذمہ داری تمام حیوانات سے بڑھ کر ہے اور وہ اس لئے کہ باقی حیوانات میں ارادی فعل کا فقدان ہے ان میں احساسِ خودی یا نفسِ اختیاری موجود نہیں بلکہ ان میں ایک آنی یا وقتی احساس ہوتا ہے مگر انسان اپنی ساری زندگی خودی اور اختیار میں بسر کرتا ہے اس لئے جانور آزاد نہیں بلکہ مقیّد ہیں یہ آزادی اور خود مختاری صرف انسان کو دی گئی ہے۔ اگر حیوان کو زبان دے دی جائے تو وہ اپنے کاموں کی کیفیت بتانے میں قاصر ہوگا جیسے ہم اپنے اندر کی مشینری کا حال بیان کرنے میں قاصر ہیں (مگر حصولِ علم کے بعد) انسان جو کچھ جانتا ہے وہی

کرسکتا ہے اپنے آپ کو جاننا اور اپنے آپ پر اعتماد اور بھروسہ Faith in self انسان کی ساری کامیابیوں کی کلید ہے یہ دل کی ایک قوت ہے۔ جو ہر شخص کو میسّر ہے خدا کی دی ہوئی ان قوتوں اور استعدادوں پر ایمان اللہ تعالےٰ کی صفت رب العالمین پر ایمان ہے اور اسی صفت کے ماتحت انسان کو بحیثیت انسان سب کچھ عطا کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی بہترین مخلوق ہونے کے لحاظ سے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵:۴) انسان اپنے تمام قواءِ زندگی۔ جسمانی، دماغی اور روحانی میں سب سے اعلےٰ ہے انسان کا اپنے آپ پر یہ ترقی یافتہ ایمان ترقی یافتہ علم (قرآن مجید) سے پیدا ہوا ہے۔ یہ اعتقاد اور ایمان اس کے خالق کی عظمت اور انسان کی عزّت کو ظاہر کرتا ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷:۷۰) ہم نے بنی آدم کو سب سے اشرف اور معزز بنایا ہے۔ اس کے خلاف اپنے متعلق مایوس کن اعتقاد قنوطیت (Pessimism) کا اسلام دشمن ہے اور اسے شیطانی وسوسہ کا نتیجہ قرار دیتا ہے اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ (۲ : ۳۴) شیطان نے انکار کیا دون کی لی اور وہ کافر تھا۔ انسان کا ابٰی یہ ہے کہ وہ ابلیس کا مرید ہو کر۔ جو اَبْلَسَ یعنی ناامیدی کا مظہر ہے یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ دنیا ہیچ ہے انسان کی ہستی کچھ نہیں وہ بدترین خلائق اور خدا کا سوتیلا بیٹا ہے وہ فطرتاً بد اور گنہگار پیدا کیا گیا ہے۔ انسان خطا اور نسیاں کا پتلا ہے اور مجبور محض ہے اپنے متعلق انسان کے یہ سب اعتقاداتِ قنوطیت اس کی اپنی عزت اور شرف کے ہی خلاف نہیں بلکہ اپنے خالق کی عزت اور عظمت کے خلاف اعتقادات ہیں جو انسان کو اپنی زندگی کامیاب بنانے سے روکتے ہیں اس کے خلاف کامیاب زندگی کے اصول یہ ہیں:۔

ا : اپنی قابلیتوں کا علم

ب : اپنی قوتوں کو بڑھانے کا ارادہ

ج : ترقی کے مواقع کے لئے اپنی آنکھ کھلی رکھنا اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا۔

د : جہاں ترقی کے مواقع نہ ہوں وہاں اپنی جدوجہد سے انہیں پیدا کرنا۔

ہ : یہ اعتقاد رکھنا کہ دنیا کو تمہاری ضرورت ہے اور تمہیں دُنیا کی۔

و : اپنے کام میں بے انتہا دلچسپی لینا۔

ز : رخصتوں کا متمنی نہ ہونا۔

یہ سات اُصول صفت رب العالمین کے ماتحت انسانی ارتقاء کی جان ہیں قرآن مجید نے ناکامی کے دو بنیادی اصول بنائے ہیں ایک اپنی اپنی خوبیوں اور قابلیتوں کا انکار علمی اور عملی رنگ میں دوسرا استکبار احساسِ خودی میں غلو اور دوسروں کی خوبیوں کا اِنکار

(Under-estimating and over-estimating)

نمبر (۱) اسے اگر احساس کمتری اور Pessimism پیدا ہوتا ہے تو دوسرے کا نتیجہ Optimism ہوا و ہوس اور تکبّر ہے۔

مُسلمان اور بُدھ ممالک میں جہاں آجکل قنوطیت اور مایوسی کا دَور دَورہ ہے وہاں امریکہ روس اور یورپ کو عیاشی Optimism نے عیش اور شراب خوری میں مبتلا کر دیا ہے اسلام کی تعلیم ان دونوں کے درمیان ہے وہ نہ انسان کو قنوطی نا اُمید بناتا ہے اور نہ عیاش و متکبّر وہ اسے Meliorist رہنے کی تلقین کرتا ہے یعنی جہاں تمہیں اپنی خوبیوں کا پورا پورا احساس اور ان پر اعتماد ہونا چاہیئے وہاں دوسروں کی خوبیوں

ان کی قابلیت کا بھی احساس ہونا چاہیئے۔ بحیثیت انسان رب العالمین نے سب میں خوبیاں رکھی ہیں اور بشر ہونے کے اعتبار سے سب کو مساوی حقوق عطا کئے ہیں اس لئے اپنی اَنا اور خودی کے تکبّر میں دوسروں کے حقوق اور اختیارات پر ڈاکہ ڈالنا خواہ وہ انفرادی رنگ میں ہو یا سٹیٹ اور قوم و نسل اور رنگ کے اعتبار سے یہ اللہ تعالیٰ کی صفت رب العالمین کا انکار ہے اور صرف اپنا ہی خدا ہونے کا تکبّر ہے۔ اَربوں کا صرف اپنے آپ کو ایشور (خُدا) کا بیٹا سمجھنا اور بنی اسرائیل کا اپنے آپ کو خدا کا پہلوٹھا اور اکلوتا بیٹا کہنا اور نصاریٰ کا مسیح میں ہو کر خدا کے بیٹے بن بیٹھنا یا ایک قوم کا دوسری قوم پر پیدائشی تفوق یہ وہ تاریک خیال ہے جو قوموں کے دلوں سے اٹھ کر کالے بادل کی شکل اختیار کر کے بالآخر انہی پر برستا رہا ہے۔ ہمارا ہر ایک خیال اور فعل آخر کار ہمارے ہی گلے کا ہار یا پھندا ثابت ہوا ہے۔

جبر یا اختیار

سطور بالا میں مَیں نے جن مذاہب یا خیالات کی تردید کی ہے ان میں سے ایک مسئلہ جبر ہے جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے وہ اپنے اعمال اور افعال میں صاحبِ اختیار نہیں جو افعال اس سے سرزد ہوتے ہیں ان کا فاعلِ حقیقی خُود خداوندِ عالم ہے۔ جبریوں کے دلائل بہت سے لوگوں کے دلوں میں کھٹکتے ہوں گے مثلاً

۱: اِنسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے یا نہیں، وہ مجبور ہے یا مختار؟

۲: وہ سب کام جو انسان کرتا ہے وہ گذشتہ اسباب، قسمت، فطرتی گناہ یا اندرونی کمزوری اور نقص کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔

۳: سائنس کا مسئلہ Law of Causality کہ پہلا فعل دوسرے فعل کا سبب اور نتیجہ ہوتا ہے کیا یہ بھی مسئلہ جبر کی تائید مزید کرتا ہے۔

انسان مجبور محض ہے یہ خیال محض قیاس نہیں بلکہ یہ عقیدہ لوگوں کے دل کے اندر گھسا ہوا ہے اس کی تائید میں لوگ قرآن مجید کی قریباً بیس آیات پیش کرتے ہیں متعدد احادیث سے اس کی سند لاتے ہیں اور اہلِ سنت کی تمام مسلّمہ کُتبِ عقائد میں لکھا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے افعال کے ارتکاب میں اسے کوئی اختیار نہیں یہ عقیدہ مسلمانوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہر وہ مذہبی شخص جس کا چلن ناہموار ہے وہ کسی نہ کسی رنگ میں اپنی خواہشات کے لئے جواز نکالتا ہے۔ بدی جو وہ کرتا ہے اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو نہیں ٹھہراتا بلکہ سینٹ پال کی سند لاکر کہتا ہے بدی جو میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں بلکہ وہ گناہ جو مجھ میں بستا ہے (رومیون ۷: ۱۷، ۲۰) قوتِ ارادی کے کمزور لوگ شیطان کو بدی کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ علماء کا گروہ جو زیادہ دلیر ہے وہ خدا کو بدی کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے یعنی خدا نے میری تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا ہر فعل کا فاعل دراصل خدا ہے انسان برائے نام گنہگار ہے۔ اصلاحِ اخلاق فضول اور محال ہے۔ میں نے اپنے آپ کو خود نہیں بنایا۔ میں اپنی مرضی سے دنیا میں نہیں لایا گیا ہوں۔ انسان کی انسانیت ہی کیا ہے؟ اَلْاِنْسَانُ مُرَکَّبٌ مِنَ الْخَطَاءِ وَالنِّسْیَانِ۔ اچھے بھلے انسان ان عذراتِ رکیک کو پیش کرتے اور اسے معقول سمجھتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے جواب میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم واقعات کی دنیا میں رہتے ہیں اگر یہ سچ ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ انبیاء بھیجتا ہے اور وہ بدی کی بیخ کنی اور نیکی کی آبیاری کے لئے عمر بھر دُکھ اٹھاتے۔ مار کھاتے اور پیٹے جاتے ہیں۔ اگر انسان مجبورِ محض ہے تو وحی والہام کا کیا فائدہ؟ ارسالِ شریعت

کا کیا مقصد ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ تعلیم و تربیت یافتہ جماعتوں اور سوسائٹیوں میں گناہ اور جرائم کم ہو جاتے ہیں؟ عرب کے جاہل اور بدکار لوگ بدیوں سے کیسے پاک ہو گئے کیا ان کی پاکیزگی میں ان کی اپنی کوشش کو بھی دخل تھا یا نہیں؟ اگر سب لوگ مجبور ہیں تو پھر جمعیۃ العلماء کا کیا فائدہ؟ مدرسہ دیوبند کی کیا ضرورت؟ کیونکہ جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَائِنٌ۔ جو ہونا ہے وہ لکھا جا چکا اور قلم خشک ہو گیا، بچوں کی تعلیم پر زور کیوں دیا جائے۔ بحث مباحثے اور مناظروں کی کیا ضرورت؟ انسان مجبورِ محض ہے۔ جو ہونا ہے وہ روزِ اوّل سے لکھا جا چکا ہے اور جو تقدیر میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اگر انسان مجبورِ محض ہے اور انسان کا کچھ اختیار نہیں تو مسلمانوں کی آپس میں تکفیر بازی کیوں؟ یہ جبر کا لٹھ کیا صرف اپنی خطا و نسیاں میں بریت کے لئے ہے یا واقعی آپ ساری نسلِ انسانی کو گناہ و خطا پر مجبور سمجھتے ہیں اور تمہیں تمہاری جیب تراشنے والے پر غصہ نہیں آتا اور اسے مجبورِ محض قرار دے کر معذور سمجھتے ہیں؟

علّت و معلول کا تسلسل یا دور

ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ کسی فعل کے ارتکاب سے پہلے ایک وقت ضرور ایسا آتا ہے جب ہم اس فعل کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں وہی وقت ہمارے مجبور نہ ہونے بلکہ صاحبِ اختیار ہونے کو ثابت کرتا ہے Law of Causality یا علّت و معلول کا مسئلہ ہماری اس دلیل پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ یہ ہم جس نے کام کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا کیا چیز ہے؟ یہ خود کئی علّتوں کا معلول ہے۔ یہ کہنا کہ نیکی اور بدی کرنے میں ہم مختار ہیں یہ ہم کہاں سے آیا؟ طبقاتُ الارض کے بے شمار تغیرات نے اس زمین کو تیار کیا جس پر یہ ہم پیدا ہوا۔ اس کے بعد لاکھوں درجاتِ حیات نے

بالآخر نسلِ انسانی کا خمیر گوندھا اور یہ ہم ان بے شمار درجات کا معلول ہے انسان کے درجہ تک پہنچنے پر ہم انسان کی طرح کام کرنے پر مجبور ہیں کیڑوں کی طرح آزاد نہیں اور نہ پرندوں اور جنگلی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے میں مختار ہیں۔ تاریخی اسباب نے اس قوم کو پیدا کیا جس کا ہم ایک فرد ہیں۔ اور اس قوم کی خصوصیات کے ہم حامل ہیں۔ نسلی امتیازات نے ہماری خاندانی عادات ہمیں دیں اور ہمارا ارادۂ فعل ان تمام موثرات کے ماتحت سوچتا اور کام کرتا ہے۔ ہمارا ماحول، ہماری تعلیم ہمارا امیر یا غریب ہونا ایک خاص میزان میں ہمیں ڈھالتا ہے پس جب ہر انسانی شخصیت اسباب کے ماتحت پیدا ہوتی ہے ہزاروں اور لاکھوں اسباب کے زیر اثر جو زمانہ کے لاتعداد برسوں میں رونما ہوئے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اس کا انحصار اس کے ارادہ پر اور ارادہ کا انحصار اس کے اپنے آپ پر اور اس کا اپنا آپ ان بے شمار موجبات سابقہ کا نتیجہ ہے۔ جو لاتعداد اور بے شمار ہیں مگر کیا شخصیت محض اثرات کے مجموعہ کا نام ہے یا اس سے بالکل مختلف ہے۔ اثرات بے شک موجود ہیں مگر وہ ایک نئی ہستی میں پھونک دیئے گئے ہیں۔ لاریب وہ سابقہ علتوں کا مجموعہ ہے مگر وہ اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے۔ وہ ایک نیا اور مکمل نظام ہے اس لئے وہ آئندہ کئی ایک معلولات کی علت ہو سکتا ہے۔ کسی فعل کے ارادہ سے لے کر آئندہ کی طرف دیکھا جائے تو ہمیں اس میں انسان کا اختیار نظر آتا ہے مگر اس سے پیچھے ماضی کی طرف اس کا سراغ لگایا جائے تو وہ معلول نظر آتا ہے۔ پس زمانۂ حال علت بھی ہے اور معلول بھی۔ وہ معلول ہے کل کی ماضی کا اور علت ہے تمام آئندہ آنے والے کی۔ یا یوں کہو کہ ہم مختار بالفعل ہیں مگر "ہم"۔ جو مختار ہے وہ ماضی کے اثرات

کا پیدا کردہ ہے بے شک انسان گذشتہ علتوں کا معلول ہے مگر وہ اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو ایک شخصیت سمجھتا ہے نیز اپنے کو اور دوسروں کو اعمال کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ مشہور فلاسفر اسپلینوزا کہتا ہے:۔

"Man thinks himself free because he is conscious of his wishes and appetites, while at the same time he is ignorant of the causes by which he is led to wish and desire, not dreaming what they are."

"انسان اپنے آپ کو مختار خیال کرتا ہے اس لئے کہ اسے اپنی خواہشات اور حاجات کا شعور حاصل ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت ان وجوہات سے لاعلم ہوتا ہے جن کی بناء پر وہ آرزو اور تمنّا کرنے پر مجبور ہوا ہے اور وہ وجوہات اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہوتیں۔"

انسان چونکہ عالم الغیب نہیں اور نہ ان اثرات سے واقف ہے جن کی وجہ سے اس نے وہ فعل کیا البتہ اس کا ارادہ اور اختیار اسے اس فعل کے سرزد ہونے سے پہلے اسے مجرم بناتا ہے مجرمین کا یہ خیال کہ ہم سلسلہ علّت و معلول (cause and effect) کی وجہ سے مجبور ہیں غلط ہے۔

۱۔ بے شک ایک شخص کو سابقہ علل نے ایک خاص کیرکٹر دیا ہے مگر اسے ضمیر بھی تو ملا ہے جس کے مانحت وہ ارادہ کرتا اور لالچ کا مقابلہ کر سکتا ہے جیسا کہ اس کا بھائی جسے یہی ورثہ ملا ہے مگر وہ جُرم سے باز رہتا ہے۔

۲۔ سزا کا خوف اکثر لوگوں کو اور پولیس کی موجودگی بالعموم سب کو ارتکابِ جرم سے روکتی ہے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ آ اور ب نے اپنی قسمت کی بناء پر ضرور چوری کرنا ہے تو ج اور د کو پولیس کی موجودگی جرم سے کیوں روک دیتی ہے؟ جس سے یہ ظاہر ہے کہ آ اور ب پر بھی اگر پولیس کا ڈنڈا ہوتا تو وہ بھی چوری سے رُک جاتے۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ پولیس کی موجودگی جرائم کو کم کرتی ہے۔ اگر پولیس کا محکمہ اُڑا دیا جائے یا سزا کا خطرہ اُڑا دیا جائے تو جرائم کی کثرت یقینی ہو جائے گی۔

قرآن مجید نے اس دلیل کو کیسے اچھے الفاظ میں ادا کیا ہے۔

لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۵ : ۲۸)

دو حقیقی بھائی تھے جن کی پرورش اور ماحول ایک تھا والدین ایک تھے ان میں سے ایک نے اپنے حقیقی بھائی کو قتل کرنے کے لئے دست درازی کی تو دوسرے نے کہا اگر تو میرے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو بھی میں اپنا ہاتھ تجھے قتل کرنے کو نہیں اٹھاؤں گا۔ میں تو ربّ العالمین سے ڈرتا ہوں۔

پس ایک بھائی کا قتل پر دلیر ہونا اور دوسرے کا اپنے اتقاء اور خدا کے خوف کی وجہ سے ہاتھ نہ اٹھانا باوجود اس کے کہ دونوں کا ماحول اور پرورش کے سامان ایک جیسے تھے اس امر کی دلیل ہے کہ انسانی ضمیر کی آواز اور خوفِ خدا گناہ سے بچاتا ہے۔

تیسری دلیل: ارتکاب گناہ کے بعد انسان کا نادم ہونا۔ اگر وہ گناہ گاری پر مجبور تھا تو اسے اظہارِ گناہ پر ندامت کی کیا ضرورت تھی۔ اور یہ اظہارِ ندامت سلیم القلب انسان کو آئندہ بدی سے روکنے کا ایک زبردست ذریعہ ہے چنانچہ آیت بالا کے آخری حصہ میں فرمایا:۔

فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ (۵ : ۳۱)

سو وہ قاتل بھی بالآخر اپنے کئے پر پچھتایا۔

شیطان کی ہستی

جبر کے بعد دوسری چیز شیطان کی ہستی ہے کہ جس کے سر پر لوگ اپنے گناہ تھوپتے اور اپنے آپ کو بری الذمہ ٹھہراتے ہیں۔ یہ اعتراض کہ شیطان کیوں بنایا گیا؟ دراصل یہ اعتراض یوں ہے کہ دنیا میں بدی کیوں ہے؟ یا یہ کہ دنیا میں نیکی اور بدی کیوں ہے؟ دوسرے لفظوں میں اس سوال کی نوعیت یوں ہوگی کہ انسان فاعل مختار کیوں ہے؟ جانوروں اور دوسری اشیاء کی طرح مجبور کیوں نہیں؟ اسے عقل اور تمیز کیوں دی گئی۔؟

ان تمام سوالات کا جواب یہ ہے کہ وہ کام جسے کرنے یا نہ کرنے کا فاعل کو اختیار نہ ہو وہ نہ نیکی ہے نہ بدی "Whatever is not willed has no moral quality."

ارادہ اور اختیار کے بغیر کسی کام کی اخلاقی قیمت صفر ہوتی ہے۔ ایک لڑھکا ہوا پتھر گاؤں تباہ کر سکتا ہے اور بارش کی ایک بوچھاڑ ایک قوم کو قحط سے نجات دے سکتی ہے مگر نہ پتھر کا لڑھکنا بدی ہے اور نہ بارش برسنا نیکی انسان کے سارے اعمال کی قیمت اس کے صاحبِ ارادہ اور اختیار ہونے کی وجہ سے ہے اور اسی چیز نے انسان کو کائنات پر حکمران بنایا ہے نیکی اور صداقت کی تلاش میں انسان کی دوڑ دھوپ اور بدی سے اپنا بچاؤ انسان کے لئے یہ سب سے زیادہ مسرّت کی چیز ہے کسی نے خوب کہا:۔

"If I had the truth in my hand, I would let it go again for the pleasure of pursuing it."

"اگر صداقت میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں اس کے تعاقب کا لطف اٹھانے کے لئے اسے پھر اپنے ہاتھ سے چھوڑ دیتا۔"

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کر ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذّتِ طلب

پُرانے سامی ذخیرۂ کلام میں یعنی سامی زبانوں میں لفظ شیطان کا مادہ شَطن ہے جس کے معنی ہیں دوسرے کی مزاحمت کرنا یا راستہ روک لینا۔ یہ مزاحمت اور روک اصولِ ارتقاء کی جان ہے۔ دُنیا میں ہر چیز آگے بڑھنا اور ترقی کرنا چاہتی ہے دوسری اس کی راہ روک کر مزاحمت کرتی ہے جس کی وجہ سے پہلی کو جدو جہد اور مخالف قوّتوں سے پیکار کرنا پڑتی ہے جسے سائنس کی اصطلاح میں Struggle for existance کہتے ہیں

اسی طرح شیطان کا وجود نیکی کرنے کے لئے قوت اور طاقت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے کیونکہ وہ نیکی سے روکتا ہے اس لئے اس کے بالمقابل ایک نیک آدمی جدو جہد کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرتا زور لگاتا اور غالب آتا ہے۔

بے شک آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسان کمزور ہے جیسا کہ قرآن مجید میں بھی آیا ہے خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (۴ : ۲۸) مگر کمزوری اس کا منتہاء نہیں اس کا منتہا اور مقصد قوت اور طاقت کا حصول اور اظہار ہے۔ جو اس کے اندر بالقوۃ موجود ہے جیسے پانی کے اندر قوّت کا خزانہ موجود ہے مگر اس کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب اس کی روانی میں مزاحمت کی جائے اور اسے کناروں کے اندر محدود کر دیا جائے۔ اسی طرح انسان کو ریشنل دل اور ریشنل مائنڈ یعنی روشن ضمیری اور عقل اس لئے دی گئی ہے کہ وہ پیش آمدہ امور میں مزاحمت سے طاقت اور قوت پکڑ کر اپنی رفتار کو تیز کرے اور ریشنل سیلف

یا نفسِ مطمئنہ تک جلد پہنچ کر شیطان اور بدی کی مزاحمت سے آزاد ہو جائے۔ حدیث میں آتا ہے اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَالْبُغْضُ شَیْطَانٌ ۔ اپنے شیطان اور اپنے آپ کو آگ سے نکالنا بھی انسان کے اپنے اختیار میں ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہر انسان کے لئے ایک شیطان ہے۔ سوال کیا گیا کہ آپ کے لئے بھی فرمایا ہاں مگر میرا شیطان مسلمان ہو گیا ہے۔

مَامِنْ اِنْسَانٍ اِلَّا وَمَعَهٗ شَیْطَانٌ قَالُوا وَاَنْتَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ۔ قَالَ وَاَنَا لٰکِنَّهٗ مُسْلِمٌ بِعَوْنِ اللّٰهِ فَلَقَدْ اَتَانِیْ فَاَخَذْتُ بِحلقه ۔

اور دوسری جگہ ہے :

اَعَانَنِیْ عَلَیْهِ فَاَسْلَمَ فَلَا یَاْمُرُنِیْ اِلَّا بِخَیْرٍ (مسلم)

انسان کو شیطان سے اس وقت آزادی ملتی ہے جب اس کے اندر نفسِ مطمئنہ پیدا ہو جائے لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ شیطان سے ان لوگوں کو کوئی خطرہ اور حزن نہیں گویا ان کا شیطان مر جاتا ہے اسلام کے نزدیک شیطان تخریبی قوت نہیں بلکہ وہ ایک تعمیری قوت ہے جو ارتقاء اور بقاءِ اصلح کے لئے ضروری ہے۔

تقدیر یا قسمت

اپنی استعدادوں اور قابلیتوں کے نشو و نما یا دماغی اور روحانی قوتوں کے ارتقاء کے لئے جدو جہد میں روک تقدیر اور قسمت کا عقیدہ بھی ہے۔ ہندو لوگ اسے اپنی مذہبی اصطلاح میں پرالبدھ کہتے ہیں۔ روزمرہ کا محاورہ ہے جو بات مقدر میں ہے وہ بہر حال ہو کر رہے گی۔ ہماری کوششیں بیکار ہیں قسمت کا لکھا سامنے آتا ہے انسان اسے کتنا ہی ٹالنے کی کوشش کرے یہ خیال نامردی، بیکاری اور کاہلی پیدا کرنے والا خیال ہے۔ قرآن مجید

نے جس تقدیر کا ذکر کیا ہے وہ صرف انسان کے ساتھ خاص نہیں چنانچہ فرمایا: خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا (۲۵:۲) اس نے ہر چیز پیدا کی ہے اور اس کی ایک تقدیر یا اندازہ مقرر کر دیا ہے تاہم ہر چیز ترقی کی دوڑ میں دوڑ رہی ہے کسی جگہ سکون اور قرار نہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے کیا خوب فرمایا:

"اے کاہل شخص چیونٹی کے پاس جا اس کی روشیں دیکھ اور دانش حاصل کر وہ باوجود اس کے کہ کوئی اس کا سردار نہیں کوئی حاکم نہیں گرمی کے موسم میں اپنے لئے ذخیرہ کرتی ہے اور کٹائی کے وقت اپنے لئے خوراک جمع کرتی ہے۔" (امثال ۶:۶)

کیا چیونٹی کے لئے پہلے سے تقدیر اور قسمت نہیں مگر کس طرح اسے خداوند عالم نے اپنے کام میں لگا رکھا ہے اور کس محنت سے وہ اپنے غیر موافق موسم کے لئے محنت کرتی اور ذخیرہ جمع کرتی ہے۔

انسان کی تقدیر ان قوتوں اور طاقتوں کا اندازہ ہے جو اس کی پیدائش کے ساتھ مقرر ہوتا ہے یہ ایک بیج ہے جو انفرادی طور پر یا نسل انسانی کے گذشتہ اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے یا وہ ایک ترقی کی حد ہے جہاں تک انسان پہنچ سکتا ہے اور اس کے اندر اندر اپنی کوششوں کو پھیلا سکتا ہے۔ حضرت علی رضؓ سے کسی شخص نے تقدیر کے متعلق سوال کیا آپ نے فرمایا اپنی ایک ٹانگ اٹھاؤ۔ اس نے اٹھائی۔ اس کے بعد فرمایا دوسری بھی اٹھالو اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا یہی تقدیر ہے تقدیر وہ ہے جو انسان کر سکتا ہے یا جہاں تک ترقی کرتا ہوا جا سکتا ہے۔

انسانی شکل خود بتاتی ہے کہ وہ کام کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور رب العالمین کا تصوّر بتاتا ہے کہ اس کی ربوبیت اور ترقی کے سامان خارج میں موجود ہیں نظامِ عالم بتاتا ہے کہ کام کرنے والا اپنی محنت کا اجر پاتا ہے کارندہ مکھیاں انعام پاتی ہیں مگر نکھٹو مار دیئے جاتے ہیں البتہ بعض باتیں انسان کو ناکام کرتی ہیں بلاشبہ بڑے آدمی بھی ناکام ہوتے ہیں مگر کسی کسی اندرونی رشتۂ کیرکٹر کی کمزوری سے پس ہر کام جو تمہارے سامنے آئے اور تم غور و فکر کے بعد اس کام کو کرنا انتخاب کر لو تو تمہارا یقین اور عزم یہی ہونا چاہیئے کہ میں اسے ضرور کروں گا مجھ میں اس کی اہلیت ہے۔ ناکامی ہمیشہ انہی لوگوں کے پاس آتی ہے جو اس کے متمنّی رہتے ہیں ناکامی اور نسیان کی وجوہات اور ان کا علاج آپ کو الرحمٰن اور الرحیم کی تفسیر کے ماتحت ملے گا۔ سردست اس قدر یاد رکھنا ضروری ہے کہ رب العالمین کے تصوّر کے ماتحت انسان کو مایوس کبھی نہیں ہونا چاہیئے۔ ناکامیاں اور مصائب انسان پر آتے ہیں مگر اس میں قیمتی شئے کیرکٹر اور اعلیٰ سیرت کا پیدا کرنا ہے، تاریک گھڑیوں کے اندر اعلیٰ کیرکٹر ایک ہیرا ہے۔ جو تاریکی میں زیادہ چمکتا ہے ناکامیوں کے لئے غمگین ہونا غلطی ہے اور ضیاعِ وقت و قوت۔ ماضی کو یاد کر کے ماتم نہ کرو بلکہ حال سے فائدہ اٹھاؤ۔ اپنی خطاؤں کو یاد کر کے رونا ضیاعِ وقت اور ذہنی قوتوں کا خسران ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ حال کو بہتر طور پر خرچ کیا جائے۔ ناکامی اور خطا کو آپ زیادہ سے زیادہ حرکت کا موجب بنائیں نہ کہ حوصلہ شکنی کا باعث۔

رب العالمین کے تصوّر میں دو ضروری شقیں

(۱) تمام انواع مخلوقات کا وہ ربّ ہے۔ صرف میرا ہی نہیں۔

ب : میرا بھی وہی رَبّ ہے۔ جو سب کا رَبّ ہے۔

جو تمام انواع مخلوقات کا ربّ ہے وہ تمہارا بھی رَبّ ہے۔

تمام مخلوقات کا وہ رَبّ ہے یعنی ہر شئے کو اس نے پیدا کیا ہے اس کی پرورش کا سامان اس کی ترقی کے ذرائع اور اسباب کا وہ خالق ہے اور اس کا مہیّا کرنے والا کن کن حالات میں اور کیسے کیسے رنگ میں ہر مخلوق کو اس کا رزق پہنچتا ہے۔ یہ نظامِ قدرت کا ایک وسیع باب ہے اپنی خوراک حاصل کرنے کے طریق اُڑ کر، دَوڑ کر، دیکھ کر، سونگھ کر۔ ہاتھ سے منہ سے۔ اور جن کے نہ ہاتھ ہیں اور نہ منہ ان کے اندر کیسے رزق پہنچ جاتا ہے پرندے اڑ کر روزی تلاش کرتے ہیں اور درندے دوڑ کر اور کود کر اپنا خورش پاتے ہیں۔ اکثر حیوانات دیکھ کر اور سُونگھ کر اپنی خوراک تک پہنچتے ہیں بعض اپنا شکار ہاتھ سے پکڑتے ہیں، جن کے ہاتھ نہیں وہ صرف منہ سے۔ جن کا نہ ہاتھ نہ منہ نہ اڑنے کا سامان نہ دوڑنے کی قوت (امیبوا) ان کا شکار خود ان تک پہنچتا ہے اور ان کے جسم میں جذب ہو جاتا ہے۔ گوشت خور درخت اپنا شکار اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ خوراک کے پاس نہیں جاتے بلکہ خوراک خود بخود ان کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ کوئی زندہ جانور ان کے اوپر آ بیٹھا اور ان کے اندر ہضم ہو گیا۔ بعض جانوروں کے بچے ابتداء میں محض مضغہ گوشت ہوتے ہیں ان کے ماں باپ انھیں چھوڑ جاتے ہیں مگر رَبُّ العالمین انہیں نہیں چھوڑتا مکھیاں اور مچھر ان کے اوپر آ بیٹھتے ہیں اور ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مینڈکی اور تیتری صرف انڈے دینا جانتی ہیں نہ انڈوں سے بچے نکالتی ہیں نہ ان کی پرورش کا بوجھ اٹھاتی ہیں مگر کیا اس رب العالمین نے ان کی پیدائش اور پرورش کا ذمہ

خود نہیں اٹھایا ہوا ہے۔ اپنی خوراک پہچاننے کے لئے روشنی کی ضرورت ہے مگر گہرے سمندر کی تہہ میں سورج کی روشنی نہیں پہنچتی وہاں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں رہتی ہیں۔ اُن کے رَبّ نے ان کی دُم میں بجلی کے قمقمے لگا دیئے ہیں کہ اپنا شکار کر سکیں۔ اس سارے نظامِ قدرت کو دیکھ کر انسان کو کیا سبق ملتا ہے؟ اسے ہاتھ، پاؤں آنکھیں کان اور دماغ ہر چیز دی گئی ہے۔ یہ بیکار نہیں دی گئیں ان سے ضرور اسے کام لینا چاہیئے اور اپنی روزی تلاش کرنی چاہیئے۔ جن کے ہاتھ نہیں وہ پاؤں سے روزی کما سکتے ہیں۔ جن کی آنکھیں نہیں وہ اپنے دماغ اور قوتِ حافظہ سے معاش پیدا کر سکتے ہیں کتنے اندھے تھے۔ جو بادشاہ ہوئے ڈاکٹر اور طبیب ہوئے وکیل اور بیرسٹر بن گئے سپاہی بنے۔ ریاضی کے پروفیسر، مجسٹریٹ اور موجد بنے۔ پروفیسر آف اکانومی اور جنرل پوسٹ ماسٹر مشنری پادری۔ منجم اسٹرانومر بنے اُن کی خاطر اُبھرے ہوئے حروف کی کتابیں بنیں جن پر وہ ہاتھ پھیرتے اور پڑھتے جاتے تھے۔ عوام کی بھیڑ کے اندر موٹر چلانا یہ ایک نئی دریافت ہے۔ کہ آنکھ نہ ہونے کی وجہ سے انسان کے باقی حواس محیر العقول طور پر ترقی کر جاتے ہیں۔ یوہیمیا کا بادشاہ جان اندھا تھا جو جنگ میں نہایت بہادری کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ ونیکا ایک بہادر سپاہی نابینا تھا۔ سکاٹی نلی مشہور فلالوجسٹ لسانیات کا ماہر تھا۔ کانٹ ڈی بیگن آنکھوں سے محروم تھا مگر علم مساحت کا عالم تھا۔ ڈاکٹر نکولس سانڈرس پروفیسر ریاضی اندھا تھا۔ جان ملٹن نابینا فصیح اللسان شاعر تھا۔ ولیم مون ٹائپ کا موجد اندھا تھا۔ اسی طرح جن کے ہاتھ نہیں تھے انہوں نے پاؤں سے اعلےٰ درجہ کی مصوری کی اور اپنی روزی کمائی پس جس طرح بے شمار جانور ہاتھ پاؤں اور آنکھ نہ رکھتے

کے باوجود رَبُّ العالمین کے دستر خوان پر اپنی روزی تلاش کرتے اور کھاتے ہیں اسی طرح مجبوریوں کے اندر گھرا ہوا انسان اپنی محنت اور کوشش سے ترقی کر سکتا ہے سوا، اس کے جو بالکل معذور ہو۔ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ہمہ صفت موصوف اور ربّ العالمین ہے وہ ایسے اندھے اپاہج۔ لولے۔ لنگڑے اور معذور لوگ پیدا ہی کیوں کرتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ نظامِ کائنات میں حقیقی انفرادیت کہیں نہیں ہر چیز دوسری چیزوں سے اپنا وجود لیتی اور متاثر ہوتی ہے کسی ایک فرد کی معذوری دوسروں کی جہالت اور خطا سے پیدا ہوتی ہے مثلاً معتدل طبقات میں فی ہزار ایک شخص نابینا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ۶۵۰ اشخاص میں ایک مگر مصر میں فیصد ایک اندھا ہوتا ہے چنانچہ مصر میں نپولین کی فوج کا اکثر حصہ اندھا ہو گیا تھا مگر اب وہاں اس پر قابو پا لیا گیا ہے۔ اس طرح اہلِ ملک کی جہالت، ماں باپ اور خاندانوں کی کمیٔ علم سے معذوروں کی تعداد بڑھتی ہے مگر جہاں علم اور تہذیب کی ترقی ہے وہاں ان میں بے حد کمی ہو جاتی ہے۔ پس معذوروں کی قسمت اور تقدیر ایک بیج ہے جو انفرادی طور پر یا مجموعی حیثیت سے بویا اور کاشت کیا جاتا ہے۔

"It is the seed we sow individually or collectively."

ربّ العالمین اور سوشلزم

رَبُّ العالمین کا عملی پہلو یہ ہے کہ ہر انسان خود اپنی خداداد طاقتوں اور قابلیتوں کے ترقی دینے کی فکر کرے بلکہ قومی ارتقاء کی دوڑ میں دوسروں کی بھی مدد کرے کیونکہ انسان ایک سوشل اور متمدن مخلوق ہے زندگی کا شہد جماعتوں اور قوموں کی مجموعی جدوجہد سے پیدا ہوتا ہے۔ رَبّ العالمین کا تصوّر جمع کے

صیغہ میں اسی لئے رکھا گیا ہے کہ ذاتی اور انفرادی جدوجہد اور فلاح عام میں کوشش اور سعی دونوں باتیں ہر انسان کے فرائض میں داخل ہیں۔ بعض لوگ ذاتی نفع کے کام کو حقیقی نیکی نہیں قرار دیتے۔ کسی کا بھوک کے وقت کھانا کھا لینا اور بیمار ہو کر آرام کرنا نیکی نہیں، مگر اُس رسول امیؐ کی حکمت اور دانائی کے قربان جائیے جس نے فرمایا:

وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔ فَإِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَبِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا۔

تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے۔ یقیناً تیرے جسم کا تجھ پر حق ہے اور تیری دو آنکھوں کے لئے تجھ پر فرض ہے کیونکہ انفرادی بہتری اور بھلائی بھی ایک رنگ میں جماعت کی اور قوم کی خدمت ہے۔ ہمسایہ سے بڑھ کر ہمیں خود اپنے آپ کو بہتر بنانا چاہیئے۔ اپنے ساتھ نیکی اور دوسروں کے ساتھ نیکی میں صحیح توازن قائم کرنا ہی اچھے مذہب کا فرض ہے پس نیکی دو قسم کی ہے۔

Self regarding virtues

Other regarding virtues

جہاں اپنے ساتھ نیکی میں دوسروں کا نقصان ہو وہاں دوسروں کے ساتھ نیکی کو ترجیح دینی چاہیئے۔ ورنہ انفرادی جسمانی صحت اقتصادی بہتری اور رُوحانی ترقی کی کوشش درحقیقت جماعتی خدمت کی ایک ہی شکل ہے بشرطیکہ جماعت کا ہر فرد اس کے لئے کوشش کرے اس لئے قرآن مجید کی دعائیں بالعموم رَبَّنَا (اے ہمارے ربّ) سے شروع ہوتی ہیں کہ اصل ترقی جماعتی ترقی ہے قرآن مجید نے اس حقیقت کو دو حقیقی بھائیوں کی تمثیل میں بیان کیا ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اس میں نیک بھائی کے الفاظ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ قابل غور ہیں۔ میں ہرگز اپنے

بھائی پر دست درازی نہیں کروں گا میں رَبّ العالمین سے ڈرتا ہوں۔ گویا رَبّ العالمین کا تصوّر اور اس پر ایمان ایک بھائی کا حق دوسرے پر یا ایک انسان کا حق دوسرے انسان پر واجب کرتا ہے کوئی انسان ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دوسری کی پرواہ نہیں کرتا یا میں کوئی دوسرے کا رکھوالا ہوں؟ اِسلام ہر شخص کو اپنے بھائی کا رکھوالا قرار دے کر اس کے ذمہ دوسروں کے حقوق قائم کرتا ہے ان تمام حقوق کی فہرست بیان کرنا مشکل ہے۔ قرآن مجید نے اخلاقِ عمومیہ اخلاقِ خصوصیہ اور اخلاقِ تمدّنیہ ان تینوں کے ذریعہ نسلِ انسانی کی سوشل یا جماعتی زندگی نہ صرف محفوظ کی ہے بلکہ ان حقوق کو مقرر کر کے انسان کو اخلاقی اور روحانی ارتقاء کی منزلوں پر چلا دیا ہے۔

اخلاقِ عمومیہ

قرآن مجید نے اخلاقِ عمومیہ کی بنیاد اس امر پر رکھی ہے کہ ہر شخص خواہ کتنی بڑی ممتاز حیثیت رکھتا ہو مگر وہ دوسروں کا محتاج ہے۔ اس لئے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ دوسروں سے مخاطب ہو تو خوش اخلاقی سے بات کرے اور ان سے برتاؤ کرے تو نیک برتاؤ کرے ان کی خطا اور قصور پر اپنے غصّہ کو دبالے بلکہ ان پر احسان کرے۔ خُفیہ اور ظاہر دونوں طرح لوگوں سے بھلائی کرے جاہل سے واسطہ پڑے تو اس کے پیچھے بھی لٹھ لے کر نہ چلے بلکہ اس کے لئے سلامتی کی راہ سوچے۔ بُرائی کو خُوبصورتی سے دُور کرے۔ زمین پر اکڑ کر نہ چلے کسی پر بدظنی نہ کرے، تکبّر اور غرور سے بچتا رہے کسی کی نیکی کا بدلہ نیک دے۔ غیبت نہ کرے۔ دوسرے کی چیز اور حق پر دست درازی نہ کرے کسی گھر میں داخل ہو تو گھر والوں پر سلام کہے، اپنے بھائی کو اپنے جیسا سمجھے۔ ہمسایوں سے رشتہ داروں جیسا سلوک کرے۔ دوستوں سے اجنبی سے نوکروں سے نیک برتاؤ کرے۔

مہمان نوازی، یتیموں کی پرورش، بیواؤں کی خبر گیری، مسکینوں، اندھوں اپاہجوں کی امداد۔ قرضداروں پر احسان۔ کسی پر بہتان نہ باندھے اور تہمت تراشی نہ کرے۔ لوگوں کے عیب نہ تلاش کرتا پھرے۔ کسی سے وعدہ خلافی نہ کرے۔ لڑتے ہوؤں میں صلح کرادے۔ گالی نہ بکے۔ بُرے نام نہ رکھے۔ رشک وحسد سے بچتا رہے۔ کسی کی امانت میں خیانت نہ کرے۔ دوسروں کے غم میں ہمدردی اور غمگساری کرے وغیرہ وغیرہ اخلاقِ عمومیہ کی ایک طولانی فہرست ہے۔ جو قوم اور جماعت کو مضبوط کرنے کے لئے نہایت مفید ہے ان تمام احکامات میں مشرقی مغربی۔ کالے گورے امیر و غریب مُسلم اور غیر مسلم کسی کی تمیز نہ کرے۔

اخلاقِ خصوصیہ ان اخلاق میں والدین کے حقوق، بیوی بچوں کے اولاد کے اقربا اور رشتہ داروں کے حقوق، پردہ، وصیت میراث، خود داری۔ عصبیت۔ حقوق اللہ اور امرِ رسالت کے حقوق اسلامی نظامِ حکومت کے حقوق وغیرہ آتے ہیں۔

اخلاقِ تمدنیہ لین دین کے معاملات میں، خرید و فروخت، عہد و پیمان دیانت و امانت، قصاص و دیت ممانعت سود، عدل و انصاف۔ دشمنوں سے نیک سلوک، لوگوں پر احسان، بخل کی مذمت اور صدقہ و خیرات اور قیاضی کی تلقین، اصول و قوانین جنگ میں اصلاح۔

اشتراکیت اور سوشلزم میں معاشی مسئلہ اور صفت رب العالمین کا اس پر محاکمہ: انسان کے معاشی اور اقتصادی مسئلہ کا حل ربّ العالمین کے تصوّر میں موجود ہے۔ قرآن نے

خود ہی اس کی تمہید یوں بیان فرمائی ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۱۱ : ۶)

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (۱۷ : ۳۱) اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۴۳ : ۳۲) وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (۷ : ۱۰)

"کوئی جاندار زمین میں ایسا نہیں جس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہیں وہ جانتا ہے جہاں ایک مخلوق ٹھہری ہوئی ہے اور جہاں وہ آگے سونپی جائے گی قدرت کی کتاب میں سب کی تفصیل موجود ہے۔"

"اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انہیں اور تمہیں رزق دینے والے ہیں۔"

"کیا وہ (لوگ) تقسیم کرتے ہیں تیرے رب کی رحمت؟ نہیں ہم نے دنیا میں ان کی روزی تقسیم کی ہے۔" "ہم نے ہی زمین میں تمہیں رہنے کو جگہ دی ہے اور اس میں تمہارے لئے روزی رکھی ہے مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔"

اللہ تعالےٰ نے اپنے اس عہد کو اپنی مخلوق کے ساتھ یوں پورا کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں بار بار فرمایا گیا زمین کا ذرّہ ذرّہ ہوا کا ہر ایک جھونکا۔ سورج چاند اور سیارے ستارے بادل زمین کی ننھی ننھی نظر نہ آنے والی مخلوق (بیکٹریا) اپنی بے شمار طاقتوں اور قوتوں کے ساتھ براہ راست اور بالواسطہ بغیر کسی غفلت اور کاہلی جانداروں کے لئے روزی

تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا:

ابر و باد و مہ و خورشید ہمہ در کار اند
تا تو نانے بخوری و بغفلت نہ بری

غرض زمین میں ہوا میں پانی میں سب جگہ انسان کے لئے کھانا تیار ہو رہا ہے ایک عقلمند ماں کی طرح قدرت نے زمین کا دستر خوان اپنے سارے بچوں کے لئے بچھا رکھا ہے اور کھانوں کی یہ فراخی کہ ہر چیز مخلوق کی بہ نسبت بہت زیادہ Overstocked ہے۔ مگر بعض پیٹو ضدّی ظالم اور مسرف بچوں کی ہٹ قابلِ افسوس ہے۔ وہ اپنی بھوک سے بہت زیادہ بردست درازی کرتے اور اپنے بھائیوں کو بھوکوں مارنے کا موجب بنتے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ (۱۴ : ۳۴)

"اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کو گنو تو گن نہ سکو مگر انسان کا ظلم اور ناشکرا پن بھی بے حساب ہے" کہ خدا نعمتیں بے حد و حساب دیتا ہے اور سب کے لئے دیتا ہے یا دینے کا حکم دیتا ہے مگر انسان خدا کے دیئے میں انتہائی بخل کرتا اور اپنے بھائیوں کو بھوکوں مارتا ہے۔

اسلام سے پیشتر دنیا کا قانونِ حکمرانی Laissez Fair یا لوگوں کے بیع و شریٰ کے معاملات میں دخل نہ دینا تھا جو ساہوکاروں، بنیوں اور ظالم سرمایہ داروں کے حق میں تھا اسلام نے دنیا کے اندر اقتصادی انقلاب یہ پیدا کیا کہ مسکین اور غریب کو روٹی پہنچانا حکومت کا فرض قرار دیا، اسلام سے پیشتر مسکین کو مسکین تر بنانے کے قوانین حکومت کا ایک حصّہ تھے۔ کوئی شودر آزادانہ طور پر روٹی نہ کما سکتا تھا۔ غیر آریوں سے گائیں۔

رزق اور خدا کی نعمتیں بزور قانون چھین لی جاتی تھیں، ان جابرانہ قوانین کے ماتحت جو لوگ محتاج تھے انہیں روٹی دینے پر آر۔یوں کا اعتراض یہ تھا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ۔ (۳۶ : ۴۷)

"جب انھیں کہا گیا کہ خرچ کرو جو اللہ نے تمہیں دیا تو ان ناشکروں نے ایمان والوں کو جواب دیا کیا ہم اسے کھلائیں جسے اللہ نہیں کھلانا چاہتا" یعنی جسے اللہ نے محتاج بنایا اسے ہم کھانا کھلائیں۔

جس طرح مسکین کا حق مارنے کے لئے حکومت موجود تھی اسی طرح محتاج کو حق دلانے کے لئے حکومت کی ضرورت تھی Laissez Fair افراد کے معاملات میں دخل نہ دینے کا اصول توڑ کر اسلامی حکومت کا یہ فرض قرار دیا گیا کہ وہ محتاجوں اور مساکین کی دست گیری کرے یہ اصول اشتراکیت کی جان ہے مگر یہ اسلام سے مستعار لیا گیا ہے البتہ اس سنہری اور رحیمانہ اصول میں اشتراکیت نے ایک زائد پچر یہ لگائی کہ عام ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کا وجود مٹا کر حکومت کو سرمایہ دار بنا لیا ہے پہلے اگر کچھ لوگوں کو محتاج اور مسکین ہونے کا روگ تھا تو اب ملک کی کل آبادی کی اَن داتا حکومت کی اپنی اگزکٹو باڈی ہوگی جو سب لوگوں کی روٹی اپنی مٹھی میں لے لے گی پہلے مزدور سرمایہ دار کے خلاف حکومت کے پاس فریادی ہو سکتا تھا یا سٹرائیک کے ذریعہ اپنے مطالبات منوا سکتا تھا مگر اب مزدور کے لئے ملک بھر میں کوئی دوسرا کارخانہ نہیں کہ اس میں چلا جائے۔ اور نہ ہی وہ حکومت کے خلاف کوئی حرکت کر سکتا ہے۔ ان حالات میں حکمراں باڈی کا ظالم اور جابر بن جانا آسان ہے خصوصاً ایسی صورت میں کہ خدا پر ایمان اور خدا کا خوف اور عاقبت کا ڈر ان کے دل سے اڑا دیا جائے اس نظام اشتراکیت

کا ایک اور نقص یہ ہے کہ ربّ العالمین نے جو قواء اور استعداد میں ترقی دینے کے لئے انسان کو عطا کی ہیں انہیں ترقی دینے کا کوئی موقعہ اس کے اندر نہیں بلکہ اس حکومت کے ماتحت ملک کے کل باشندے ایک خام جنس ہیں جسے حکومت جس طرح چاہتی ہے استعمال میں لاتی ہے۔

تیسرا نقص یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف روٹی کے لئے نہیں اس کے اندر اخلاق اور روحانی قواء بھی ہیں جن کی آزادی اور ترقی جبر اور ظلم کے ساتھ دبادی گئی ہے اور انسانوں کو اپنے اپنے بلند معیار سے گرا کر حیوانِ محض بنا دیا گیا ہے اشتراکیت کے موضوع پر باقی بحث اللہ تعالیٰ کی صفت الرحمٰن کے ماتحت آئے گی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس زمانہ کی اشتراکیت۔ فسطائیت، جمہوریت، حکومت نیشنل ازم نازی ازم اور امپیریلزم ان سب کو جوع الکلب کا مرض لاحق ہے۔ ان مذاہب کی تعداد میں اختلاف یا کمی بیشی ہو تو ہو سَيَقُولُونَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸: ۲۲)۔ ان سیاسی مذاہب کی تعداد تین ہو چار ہو پانچ ہو یا چھ سات ہو دُنیا کی حرص کا کتا سب کے ساتھ موجود ہے۔

ربّ العالمین کی صفت کا مسلمانوں سے آخری خطاب

ان تمام مسائل اور حقائق کے علاوہ جن کا ذکر اوراق بالا میں صفت ربّ العالمین کے ماتحت کیا گیا ربّ العالمین کا جملہ مسلمانوں کو دو نہایت ضروری سبق دیتا ہے تم ربّ العالمین کی بہترین مخلوق ہو تمہارے اندر لامحدود ترقی کرنے والے جوہر موجود ہیں ایک انسان ڈاکٹر، انجینئر، لسانیات کا ماہر، سائنسدان، آرٹسٹ، منجم،

قانون دان اچھے سے اچھا صانع ہو سکتا ہے۔ اور ہر ایک وہ فن اور پیشہ سیکھ سکتا ہے۔ جو اس وقت تہذیب و تمدن کی جان ہے۔ اور جن کا شمار مشکل ہے ہر فن اور علم میں ماہر ہونے کی اہلیت اس میں موجود ہے جیسا کہ قرآن مجید نے ہماری ہمت بڑھانے کے لئے فرمایا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (۲: ۳۱)

انسان ہر چیز کے اسماء اور خواص سیکھنے کی اہلیت رکھتا ہے اور ان سے کام لے سکتا ہے۔ قوتِ ارادی کم و بیش ہر شخص میں موجود ہے مگر اپنے ارادہ کے لئے سمت اور جہت کا تعین کرنا ہر شخص کے اپنے اختیار میں ہے۔ فاسق، مکار، چالاک، چور، ڈاکو، عیاش، ظالم اور جابر شخص اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ اس میں اس قدر قوتِ ارادی موجود ہے جتنی اس میں جو پاک ارادہ سے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ نیکی راستی۔ محنت۔ دیانتداری کی زندگی بسر کرے گا۔ ان دونوں کے اقدام کی سمت میں فرق ہے ورنہ چور اور ڈاکو کیا اپنی جان پر نہیں کھیلتا۔ اگر راستی، نیکی اور محنت کی طرف قدم اٹھانے میں ناکامی کا خوف ہو تو عقلمندی اسی کا نام ہے کہ اللہ تعالےٰ کی صفت ربّ العالمین جو ہر جاندار کی امید گاہ ہے جس کے صدقہ میں خوانِ نعمت کل مخلوق کے سامنے پھیلا ہوا ہے کو اپنے تصوّر میں رکھ کر خوف کو دل سے دور کرو استقلال کے ساتھ آگے بڑھو، کامیابی کے ذرائع سوچو اور انہیں قابو کرو۔ اپنے کام کا پورا پورا جائزہ لو خاموشی کے ساتھ کمرِ ہمت باندھو زبان سے کچھ نہ کہو آگے بڑھو اور ہر روز آگے بڑھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ صرف خوف کا خوف تھا جس کا کوئی وجود نہیں۔ ربّ العالمین کی ربوبیت سے کبھی نراس مت ہو نہ

اس دنیا کے متعلق نہ آخرت کے متعلق اپنے سامنے خوشخط اور موٹا لکھ کر رکھو:
لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹ : ۵۳)۔ لَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ (۱۵ : ۵۵)

ربّ العالمین کا جملہ دو سبق دیتا ہے۔ ربّ العالمین پر کامل امید رکھو اور اپنے آپ پر پورا اعتماد کہ میں اپنے کام میں ضرور کامیاب ہو کر رہوں گا جب سے دنیا بنی ہے صفتِ ربّ دنیا کو آگے آگے لے جا رہی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ انسان کا قدم آگے آگے بڑھتا رہے گا اسلام سے پیشتر مختلف اوقات میں مختلف قوموں پر ترقّی کے دَور آتے رہے لیکن اب ربّ العالمین نے رَحمۃ للعالمین میں جلوہ گر ہو کر یہ ارادہ کر لیا ہے کہ کل نسلِ انسانی ایک سلک میں منسلک ہو کوئی شخص مرد ہو یا عورت محض مرد اور عورت ہونے کی وجہ سے ذلیل نہ سمجھی جائے کسی خاص نسل۔ کسی خاص ملک کسی ایک رنگ کی کوئی بزرگی اور بَرتری نہ رہے ہم میں صرف وہ لوگ معزّز ہوں جو تقوےٰ اور دیانت، دوسروں کے حقوق ادا کرنے اور فرائض کی ادائیگی میں سب سے بڑھ کر ہوں۔ زمانہ اپنے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی خوفناک تباہ کاریوں کے ڈر کے باوجود ارتقاء کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے سوال صرف یہ ہے کہ آیا اپنے منہ سے الحمدللہ ربّ العالمین پڑھنے والی قوم کیا اپنے اعمال سے اس کا ساتھ دے رہی ہے۔

باب چہارم

الرّحمٰن کی صفت

لفظ اَلرَّحمٰن کے دو جز ہیں (اَلْ + رَحمٰن) اَلْ وہ حرف ہے جو کسی نام سے پہلے آکر اُسے مخصوص کر دیتا ہے۔ رَحمٰن کا مادہ رحم ہے مگر رحمٰن عربی قواعد کی رُو سے وہ رحم کرنے والا ہے جو کثرت سے رحم اور مہربانی کرتا ہے اس کثرت سے کہ کوئی اسے شمار نہ کر سکے ظاہر ہے کہ اس قدر رحم اور مہربانی بلا بدل اور بلا معاوضہ ہوگی ورنہ اعمال کی نسبت سے محدود ہوتی۔ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل نکتہ ہے کہ اس قدر رحم اور کرم اپنی مخلوق کے ساتھ بے پایاں محبت کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے یا یوں کہو کہ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی اپنی مخلوق کے ساتھ بے انداز محبت کا ثبوت ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت سے پہلے (بسم اللہ) میں اور بعد دونوں طرف صفت رحمانیت مذکور ہوئی ہے بلکہ اسم ذات اللہ کے بعد اس کی سب سے بڑی صفت رحمانیت ہے جو ایجادِ عالم کا باعث ہوئی جس نے کائنات کی ہر شے کو وہ سب کچھ دیا جو اس کی ہستی کو متمیز کرتا یا اس کا ایک الگ نام رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ جمادات نباتات اور حیوانات کی لاتعداد اقسام ہیں مگر ہر ایک کی شکل و صورت رنگ و بُو اور خواص مختلف ہیں اگرچہ ہر ایک کی پیدائش اسی زمین اور پانی سے ہے مگر ان کے سب اختلافات ان کی شکل و صورت

کے نتائج ہیں۔ ہر درخت کے پتوں کی شکل اور پھول پھل وغیرہ سب کچھ اس خاص درخت کی فطرت کا آئینہ دار ہے کہ وہ مخصوص ذائقہ، بو باس اور رنگ کا حامل ہوتا ہے اسی خصوصیت کی بنا، پر اس کا ایک الگ نام ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت کے ماتحت جو کچھ عطا ہوا ہے اسی کی وجہ سے وہ انسان کہلاتا ہے۔ [1]

انسان کے دو ہاتھ اور اللہ تعالیٰ کی دو صفات

دست شناس (پامسٹ) کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو ہاتھ عطا کئے ہیں۔ دائیں ہاتھ کے خطوط یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا سے کیا لے کر آیا ہے اور بائیں ہاتھ کے خطوط کا اشارہ اس طرف ہے کہ اسے کیا ملے گا، انسان کے دو ہاتھ درحقیقت اس کی اپنی محبت کی تکمیل کا نشان ہیں وہ جس سے پیار کرتا ہے دونوں ہاتھوں کے ساتھ اس سے بغل گیر ہوتا ہے۔ انسان کے دو ہاتھ اللہ تعالےٰ کے دو ہاتھ یا دو صفات کا مظہر ہیں چنانچہ ایک جگہ فرمایا:۔

قَالَ يَا إِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (۳۸:۷۵)

"اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ تو اس کی فرمانبرداری کرتا جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے"

اور حدیث رسول اللہ صلعم میں ہے کلتا یدیہ یمینٌ اس کے دونوں ہاتھ یمین (دائیں یا بابرکت) ہیں۔ یعنی صفاتِ کاملہ کے حامل ہیں،

---

[1] ایک انگریز مفکر اسے۔ یوں ادا کرتا ہے "اس نے جب انسان کا نام انسان رکھا تو گویا وہ سب کچھ کہہ دیا جو انسان سے مطلوب تھا"

یہ دونوں ہاتھ رحمانیت اور رحیمیت کی صفات ہیں انسان کے دائیں ہاتھ میں وہ دیا گیا ہے جس میں اس کی کوشش اور عمل کو دخل نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اسے محض مہربانی اور رحمت سے دیا ہے اور اس کے بائیں ہاتھ میں وہ عطا ہوا ہے جس کا انحصار اس کی اپنی کوشش اور عمل پر ہے اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی رحیمیت کے ساتھ ہے۔ رحمانیت نے ہمارا وجود اس کے اندر اعضا اور جوارح قوئے اور استعدادیں ہمیں دی ہیں ان سے کام لے کر جب ہم جدوجہد اور سعی کرتے ہیں تو رحیمیت ہماری کوششوں کو پھل لگا دیتی ہے۔ ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالَ اللہ تعالیٰ حسین ہے اور حُسن سے محبت کرتا ہے، رحمٰن اور رحیم کی صفات اس کے حُسن و جمال کی صفات ہیں اور جس شخص میں دو صفات پائی جائیں کہ وہ دوسروں سے بلا معاوضہ اور بلا بدل رحم و محبت کرے اور دوسروں کے حقوق ادا کرے تو اللہ اس سے محبت کرتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمٰن نے ہمارے عمل سے پہلے ہمارا وجود، ہمارے قوئے، قابلیتیں اور استعدادیں جسمانی اور روحانی عطا کیں۔ ہماری پیدائش سے پہلے ماں باپ کا وجود، ماں کی چھاتیوں میں دُودھ اور ماں باپ دونوں کے دل میں محبتِ اولاد اور قربانی پیدا کر کے ہمارے قیام و پرورش کا انہیں ذریعہ بنا دیا۔ ہوا پانی زمین اور روشنی سب کچھ مفت دیا جب دانت نہ تھے تو دودھ دیا دانت دیئے تو کھانے کو بے شمار اناج اور پھل دیئے یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کا انعام و احسان ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے مزید کرشمے

الحمدللہ میں اللہ تعالیٰ کے بے پایاں حسن کا اظہار تھا۔ ربّ العالمین کے

جملہ میں اس کے احسان کے کمال کا بیان تھا مگر الرحمٰن میں اس کی محبت کا ذکر ہے۔ (۱) محبت دنیا کی تمام اشیاء سے قیمتی چیز ہے، کسی کے حسن سے مسحور ہو کر انسان کیا کچھ نہیں کرتا یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ محبت کی قوت اور طاقت کے سامنے کوئی مشکل سے مشکل کام انہونا نہیں رہ سکتا۔ کسی چیز کی قدر اور قیمت وہ قوت اور طاقت ہے۔ جو زندگی کی خدمت میں کام آتی ہے اس لئے وہی چیز قیمتی نہیں۔ جو نایاب اور کمیاب ہو بلکہ وہ چیز جو ارزاں ہو وہ بھی قیمتی ہو سکتی ہے جیسے ہوا اور روشنی گو نہایت ارزاں، مفت سہل الحصول ہیں مگر زندگی کا سہارا ہونے کی وجہ سے نہایت بیش قیمت ہیں۔ ماں باپ کی محبت اولاد کی زندگی اور بہتری کے لئے ایک بے مثال شے ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت اپنی مخلوق کے ساتھ بالخصوص انسان کے ساتھ بے انداز محبت ہے۔ صفتِ رحمانیت اسی محبت کا ایک فوارہ ہے۔

(۲) رَحمت کے اصل معنی تمام اقسام کی آفات سے نجات دینا اور مخلوق کی حاجات میں ہر قسم کی بھلائی اور بہتری کے سامان مہیا کرنا ہیں دنیا میں انسان کے لئے نہ آفات کا شمار ہے اور نہ حاجات وضروریات کی انتہاء مگر ہر آفت کا توڑ اللہ تعالےٰ نے پیدا کیا ہے اور اس کی ہر ضرورت کا علاج موجود ہے اس لئے اس کی رحمت بھی بے حساب ہے فرمایا: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا "اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتیں گننا چاہو تو گن نہ سکو گے۔" (۱۴: ۳۴)

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور غیر اللہ کے احسان میں فرق

(۱) اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بہت بڑی نعمت ماں باپ کا وجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے

اپنے احسان کے بعد ماں باپ کے احسان کا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے لیکن اگر یہ سوال ہو کہ آیا فی الحقیقت صفتِ رحمانیت غیر اللہ (ماں باپ) میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ رحمانیتِ حقیقی اور کامل صرف اللہ تعالےٰ کی ذات سے خاص ہے کیونکہ کوئی عطا اور بخشش سوائے اللہ تعالےٰ کی عطا اور بخشش کے بلا معاوضہ نہیں ہو سکتی۔

۲۔ معاوضہ یا تو خرید و فروخت کی صورت میں ہو سکتا ہے یا خدمت کی شکل میں یا تعریف اور ثناء کے ذریعہ ہو سکتا ہے یا مال کی محبت دل سے دور کرنے کے لئے یا رقّت قلب کی، بیقراری دور کرنے کے لئے، کسی پر رحمت کرنے کے بدلہ میں یہ سب معاوضہ کی صورتیں ہو سکتی ہیں جو احسان کرنے والا حاصل کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت ان سب اغراض سے پاک ہے اس لئے جوادِ مطلق اور رحمٰنِ حقیقی اور کامل صرف اللہ تعالےٰ کی ذات ہے۔

۳۔ ہر ایک وہ احسان اور سامانِ رحمت جو غیر اللہ میں پایا جاتا اور اس کا اظہار ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالےٰ کا پیدا کردہ ہے پس جس رحمت اور احسان کا صدور کسی غیر اللہ سے ہوتا ہے وہ سب اللہ تعالےٰ کی رحمت اور بخشش ہے۔

۴۔ کسی انسان کے دل میں جو تحریک دوسروں سے نیکی اور ہمدردی کی پیدا ہوتی ہے اس کا محرک بھی اللہ تعالےٰ ہے گو اس تحریک کا قبول کرنا یا رَدّ کرنا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔

۵۔ بچہ کے لئے والدین کی ہستی بے شک بڑی رحمت ہے لیکن ان کا ملنا بھی اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہے۔ دُنیا میں بے شمار حیوانات

ہیں جن میں ان کی پرورش کا ذریعہ صرف ماں ہے باپ کو اپنی اولاد کا علم تک نہیں ہوتا اور بے شمار ایسے بھی حیوانات ہیں جن میں نہ ماں بچوں کو پالتی ہے اور نہ باپ (جیسے مینڈک اور تیتریاں وغیرہ) بلکہ اللہ تعالےٰ کی رحمت براہ راست ان کی مربّی ہوتی ہے۔

۶۔ اللہ تعالےٰ کے سوا جس قدر بھی دوسروں پر احسان اور انعام کرنے والے ہیں ان کا احسان صرف اس صورت میں فائدہ اور نفع پہنچا سکتا ہے کہ اللہ تعالےٰ کا فضل اس میں شامل ہو گا کسی فیاض انسان نے کسی محتاج انسان کو اناج یا کپڑا اور روپیہ خیرات دیا لیکن یہ خیرات صرف اسی صورت میں محتاج کے کام آسکتی ہے جب اس کا معدہ، دل اور جسم اس سے فائدہ اٹھا سکے مگر ان کا تندرست ہونا اللہ تعالےٰ کے فضل پر منحصر ہے۔ بمبئی میں ایک بہت بڑے کروڑپتی تاجر کی بابت سنا کہ وہ معدہ کی خرابی کی وجہ سے معمولی کھانا بھی نہ کھا سکتا تھا اس کا بے انداز روپیہ اس کی اپنی ذات کے لئے حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔

۷۔ اکثر لوگوں کے لئے کثرتِ مال اور اولاد نہ صرف نفع کا موجب نہیں ہوتا بلکہ فائدہ کے بجائے وبالِ جان اور موجب فساد ہو جاتا ہے اور بعض لوگ اس نعمتِ مال کے بدلے سعادت اُخروی حاصل کر لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مال دار آدمی کو اس کے مال کی وجہ سے لوگ معبود بنا لیتے ہیں اور اس کے طور و طریق اور اوضاع خراب کر دیتے ہیں غرض یہ کہ جب تک اللہ تعالےٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو اس وقت تک کسی کا احسان اور انعام نفع رساں نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حقیقی رحم جو ہر قسم کے معاوضہ کی نیت سے پاک ہو اللہ تعالیٰ کا رحم ہے اور وہی رحم کامل اور مفید ثابت ہو سکتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالےٰ اپنی مخلوق کی حاجات

اور ضروریات اور فطری تقاضوں اور اخروی بہتری کو خوب جانتا ہے۔

قرآن میں صفت رحمٰن کا بیان

قرآن مجید میں جہاں کہیں صفتِ رحمانیت کا ذکر ہوا ہے اس کا استقضاء حسب ذیل ہے۔ رحمٰن اور رحیم خدا ہی معبود ہو سکتا ہے۔ کچھ مانگنا ہو تو خبر رکھنے والے رحمٰن سے مانگ۔ جو لوگ وحی الٰہی کے منکر ہیں دراصل خدا کے یا خدائے رحمان کے منکر ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کا ہاتھ بندے سے کھینچ لے تو کوئی دوسرا شخص بچا نہیں سکتا قیامت کا دن بھی درحقیقت خدائے رحمان کا ایفاء عہد ہے۔ کہہ دو وہ رحمان ہے جس پر ہم ایمان لائے جنت کا وعدہ بھی رحمانیت کا تقاضا ہے۔ عذاب بھیجنے میں ڈھیل دینا بھی رحمانیت ہے۔ خدا کے لئے بیٹا ہونا رحمانیت کے خلاف اور اس کا انکار ہے لوگوں میں باہم محبت اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کا فیض اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکومت اس کے بے حساب رحم کا اظہار ہے تمہارا رب بے پایاں رحم کرنے والا ہے۔ سفارش اسی کی قبول ہوگی جس کے لئے رحمان اجازت دے۔ ہمارا رب رحمان ہے جس سے مدد مانگی جاتی ہے وہ بے انتہا، رحم کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ عزت والا رزق اور مغفرت کی خوشخبری اس کے لئے ہے۔ جو رحمٰن سے (تعلق ٹوٹنے سے) ڈرتا ہے۔ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو اچھے نام سب اسی کے ہیں۔ جو رحمٰن کے ذکر یا وحی الٰہی سے منہ موڑتا ہے اس کا رفیق شیطان ہو جاتا ہے۔ تمام رسولوں کا متفقہ اعلان یہ ہے کہ رحمٰن کے سوا کوئی معبود نہیں ہو سکتا۔ رحمٰن کی مخلوق میں بے پایاں حکمت ہے کہ اس میں تو خلاف نہیں دیکھے گا رحمٰن کے سوا عذاب سے کون بچا سکتا ہے وہ لا انتہا، رحم کرنے والا ہے اس سے منکر

بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتے کیا منکرینِ نصاریٰ نے ہمیشہ مالدار کثیر الاولاد رہنے کا اقرار لے لیا ہے جس نے رحمٰن سے عہد استوار کیا وہی شفاعت کے حقدار ہوں گے۔ رحمٰن کے خاص بندے زمین پر انکسار سے چلتے ہیں۔ زمین کی ہر چیز رحمٰن کے پاس پابند ہو کر آئے گی۔ کافر رحمٰن کے بندوں (فرشتوں) کو دیویاں گردانتے ہیں ایک دن ایسا بھی آئے گا جس دن تمام متقی رحمٰن کے حضور اکٹھے ہوں گے۔ رحمٰن کے منکر ہو کر یا وحی الٰہی کا انکار کر کے دنیا کے مال و منال کی کچھ وقعت نہیں۔ محبتِ مولےٰ سب سے اولیٰ ہے۔ نیک مرد اور عورت کے لئے رحمٰن سے محبت گناہ سے بچانے والی ہے۔ رحمٰن کے منکر اشد ترین سرکش آگ میں پہلے داخل ہوں گے جس کے دل میں رحمٰن کی محبت ہو وہ اسی کے ذکر میں مست رہتا ہے۔ شیطان وحیِ الٰہی یا رحمٰن کا منکر ہے۔ نظامِ عالم سب کا سب پراگندہ ہو جائے اگر رحمٰن کی بجائے اس کا مزعومہ بیٹا خدا بنا لیا جائے۔ رحمٰن ہی ہے جو رات دن تمہاری حفاظت کرتا ہے۔ یہ قرآن مجید رحمان اور رحیم کی تنزیل ہے۔

علاوہ ازیں قرآن مجید نے ایک خاص سورت اللہ تعالےٰ کے نام رحمان پر نازل فرمائی جس میں ان تمام نعمتوں اور اس کی رحمتوں کا ذکر ہے جو رحمانیت کی صفت کے ماتحت اللہ تعالےٰ نے انسان کو عطا کی ہیں اور وہ دلائل بیان فرمائے ہیں جو اس کی رحمانیت سے تعلق رکھتے ہیں۔ وحی الٰہی کا نزول۔ انسان کی پُرحکمت خلقت اور اُسے علمِ بیان کا دیا جانا۔ کلام کرنے کی استعداد اسی صفتِ رحمانیت کا فیضان ہے۔ سورج۔ چاند۔ پودے اور درخت سب اسی رحمان کے فرمانبردار اور قانون کے پابند ہیں۔ آسمان اور زمین میں جو میزان قائم ہے کہ اتنی بڑی بھاری بھرکم

زمین سیارے اور ستارے سب آسمان یا سورج کی کشش سے ایک مقرر فاصلے پر کھڑے ہیں اور اس سے اِدھر اُدھر نہیں جا سکتے۔ اس میں صفتِ رحمان کی ہی جلوہ گری ہے اور حق و حکمت کے دریا سب جگہ بہ رہے ہیں جس میں کسی دوسرے کا دخل نہیں۔

صفت رحمانیت سے دلائل ہستی باری

کائنات کی ہر چیز کو اس کے مناسب حال وجود ملنا اس کے اندر ترقی کرنے کے قواء اور استعداد میں رکھنا اور خارج میں ترقی کے سامان اور اسباب مفت عطا کرنا یہ سب اس رحمان کے حُسن پر دلالت کرتا ہے، بڑے سے بڑا سائنسدان انجینیر کوئی ایسی مشین نہیں بنا سکتا جو ہر آن اپنے آپ ترقی کرتی ہو اور اس کی ترقی معقول ہو۔ کائنات کی ہر چیز میں یہ اصول موجود ہیں لہٰذا ہر چیز کا ایک ہی خالق ہونے کے ساتھ ہی وہ رحمٰن بھی ہے۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی ہر چیز کو وہ خالق پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیتا بلکہ ہر آن آفات سے اس کی حفاظت کرتا اور اسے ترقی دیتا ہے اصولِ ارتقاء میں اللہ تعالےٰ کی دو صفات کام کرتی ہیں۔

۱۔ ہر چیز اپنے اندر ترقی پذیر قوےٰ اور استعداد میں لے کر پیدا ہوتی ہے اور خارج میں اسباب ترقی موجود ہوتے ہیں یہ اس ذاتِ واحد کا حُسن ہے۔

۲۔ ہر چیز کا پر حکمت ہونا یہ اس کے وجود پر دلیلِ صداقت ہے۔

۳۔ فطری وحی اور الہام ضمیر میں روشنی۔ اخلاقی حِس اور وحی یہ اس کی نیکی کا پہلو ہے۔ قرآن مجید میں اس ذات باری تعالےٰ کے وجود پر تین قسم کے دلائل کا سلسلہ صفتِ رحمانیت کے ماتحت بھی موجود ہے۔

سورۃ الرحمٰن میں فرمایا:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ (۵۵ : ۵، ۶)

"سورج اور چاند حساب کے موافق ہیں۔ بوٹیاں اور درخت اس کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔"

پہلی بات جو اس آیت سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ سورج اور چاند باوجود اس کے کہ دونوں کے درمیان لاکھوں میل کا فاصلہ ہے مگر دونوں ہماری اس زمین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ دونوں نور اور روشنی کے مظہر ہیں پہلے سورج اور اس کے بعد چاند جو سورج کی روشنی سے ہی منوّر ہے زمین کو باری باری روشن کرتے ہیں۔ عربی لفظ حُسبان اور حساب دونوں استعمال اعداد کا نام ہے لیکن ان کا ابتدائی مفہوم دو چیزوں کا بلحاظ مقدار اور باعتبار کیفیت برابر رکھنا ہے سورج اور چاند دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ وہ زمین پر روشنی ڈالتے ہیں۔ دوسری موافقت دونوں کا مل کر زمین کے اُوپر حفاظت و صیانتِ حیات ہے، سورج اپنی شعاؤں سے درختوں کو زندگی اور اس زندگی سے جانداروں کے لئے ایک دوسری زندگی پیدا کرتا ہے اور چاند پھلوں کو موٹا تازہ اور سورج اسے شیریں بناتا ہے۔ ان دونوں میں تیسری موافقت پودوں اور درختوں کو زندگی کی نشوونما عطا کرنا ہے چوتھی موافقت مادہ اور جنس کی ہے کیونکہ چاند اور زمین دونوں سورج کے بیٹے ہیں اور زمین خود جگر گوشۂ آفتاب ہے۔ سورج اور چاند میں پانچویں موافقت دونوں میں کشش ہے کہ چاند اس فاصلہ کو جو سورج اور اس کے درمیان ہے باوجود متحرک ہونے کے کم و بیش نہیں کر سکتا دونوں اصولِ کشش اور دفاع کی وجہ سے ایک مقررہ فاصلہ پر

قائم ہیں۔ چھٹی موافقت ان دونوں میں گردش کی باقاعدگی اور حساب میں توازن ہے گو دونوں کی رفتار میں فرق ہے نہ چاند سورج کی رفتار کو پاسکتا ہے اور نہ سورج چاند کی رفتار پر گردش کرتا ہے۔ ہر سال قریباً دس دن کا فرق ہے مگر ۹۳، ۶ دن کے بعد سورج اور چاند کا حساب پھر ایک ہی نقطہ پر آجاتا یعنی چھ ماہ کا پورا فرق پڑ جاتا ہے۔ ساتویں موافقت یہ ہے کہ سورج کی گرم اور تیز شعاعوں کو زمین اور سورج کے درمیان میں کرۂ زمہریر کو رکھ کر ٹھنڈا اور آبادی کے موافق بنا دیا ہے۔ آٹھویں حکمت یہ ہے کہ سورج جس پر ہماری زندگی کا دارومدار ہے ہماری زمین سے قریباً ۹ کروڑ میل دُور ہے اس کی سطح پر درجہ حرارت ۲۰۰۰ ہزار فارن ہیٹ ہے۔ اتنے فاصلہ پر ہونے کے باوجود ہمیں وہ زمین پر اتنی حرارت پہنچاتا ہے جتنی آبادی کے لئے ضرورت ہے اگر باہمی فاصلہ زیادہ ہو جائے اور درجہ حرارت نصف ہو جائے تو حیوانات منجمد ہو کر رہ جائیں اور اگر وہ نزدیک آجائے اور گرمی ½ ۱ گنا زیادہ پہنچائے تو تمام حیوانات جل بھن کر رہ جائیں۔

چاند دو لاکھ میل زمین سے دُور ہے اگر یہ فاصلہ پچاس ہزار میل رہ جائے تو سمندر کی موجیں اتنی بلند ہو جاتیں کہ دِن میں دو مرتبہ ساری زمین بلکہ پہاڑ بھی پانی میں ڈوب جاتے کیونکہ مد و جزرِ سمندر کی وجہ چاند کی کشش ہے۔ حکمت نہم یہ کہ چاند ہماری زمین کے بالکل متوازی نہیں بلکہ ۵ ڈگری ایک طرف جھکا ہوا ہے جس کی وجہ سے سمندر کی لہریں زیادہ بلند نہیں اٹھتیں۔

پس اجرامِ فلکی میں سے سورج۔ چاند۔ سیّارے، ستارے زمین سے جس قدر فاصلہ پر موجود ہیں اسی پر دُنیا کی بقا اور کائنات کی حفاظت کا دارومدار ہے ان کے فاصلہ میں کمی بیشی ان کی گردش اور رفتار میں کسر و قصور سارے

جہان کی تباہی اور ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ قرآن مجید نے دلائل کے اس سلسلہ کی طرف توجہ دلانے کے لئے نہایت مختصر مگر معنی خیز الفاظ میں فرمایا:۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ (۵۵: ۵ — ۷)

"سورج اور چاند حساب کے نیچے ہیں اور بوٹیاں اور درخت اس کے قانون کے فرمانبردار ہیں اور آسمان کو بلند کیا اور میزان کو قائم کر دیا ہے۔"

صفت الرحمٰن کے ماتحت پرندوں کی جسمانی ساخت سے استدلال

چاند سورج وغیرہ اپنی جسامت، بناوٹ رفتار، گردش اور فاصلہ کے لحاظ سے جس حساب اور میزان پر قائم ہیں اور اسی پر ان کے حفظ و بقا کا انحصار ہے اس پر غور و فکر کر کے نتائج تلاش کرنا اور دلائل پیدا کرنا سائنسدانوں اور فلاسفروں کا کام ہے ذرا اپنے نزدیک کی مخلوق پرندوں پر غور کرو۔ جو تمہارے اردگرد پرواز کرتے پھرتے ہیں اس طرف توجہ دلانے کے لئے سورۃ الملک میں فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۭ بَصِيْرٌ ۝ (۶۷: ۱۹)

اَوَلَمْ يَرَوْا:۔ کیا وہ دیکھتے نہیں؟ وہ غور کیوں نہیں کرتے؟ یہ محاورہ کلام عرب اس وقت استعمال کرتا ہے جب دیکھنے والے میں دیکھنے کی قوت خوب ہو اور جس چیز کو دیکھنے یا اس پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہو وہ شے باریک اور مبہم نہ ہو ورنہ غور اور فکر کی طرف توجہ دلانا فضول ہوگا۔

اَلطَّيْر: پرندہ۔ طائر قرآن مجید میں حقیقت اور مجاز دونوں میں استعمال

ہوتا ہے بلحاظِ حقیقت فرمایا: طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْہِ (۶ : ۳۸)
طائر جو اپنے دو پَروں پر پرواز کرتا ہے مجازاً قاصد تیز رو سوار، بخلاف دابہ معرفتِ الٰہی اور نیکیوں میں پرواز کرنے والا نیک زندگی بسر کرنے والا۔

فَوْقَھُمْ: اپنے سروں کے اوپر یا بعض باتوں میں انسان کے اوپر فوقیت اور برتری رکھتے ہیں۔

صٰٓفّٰتٍ:۔ پَر کھول کر اڑتے ہوئے۔ خطِ مستقیم میں اڑتے ہوئے

وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ (۲۴ : ۴۱) قطار بنا کر اڑنا۔

یَقْبِضْنَ: پَر سکیڑ اور سمیٹ لیتے ہوئے۔ قَبَضَ سے ہے روک لینا اکٹھا کر لینا۔

یُمْسِکُھُنَّ: روکتا ہے۔ روکنے والا۔ ان کا حفاظت کرنے والا۔

رَحْمٰنُ: بے انتہا رحم کرنے والا۔ بالحکمت بنانے والا۔ ہر چیز کو موزوں اور موافق بنانا۔

ترجمہ: کیا وہ اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھتے۔ جو فضا میں پرواز کرتے پَر کھولتے اور انہیں سکیڑ لیتے ہیں انہیں اوپر فضا میں کس نے روک رکھا ہے (کس نے ان کی حفاظت کا سامان کیا ہے) سوائے رحمٰن کے وہی یقیناً ہر چیز کا نگران ہے۔

آیت کے مضامین کا خلاصہ یوں ہے:۔

۱۔ سوچو اور غور کرو پرندے تیزی سے لوگوں کے سروں پر اُوپر فضا میں کیسے اُڑتے ہیں۔؟

۲۔ اِن کا ہَوا میں پَر تول کر اُڑنا اور پَر سمیٹ کر اُتر پڑنا قابلِ غور ہے۔

۳۔ بارش۔ قطرے۔ اولے۔ برف کے گالے۔ سیّاروں کے ٹکڑے ہَوا سے نیچے زمین پر گر پڑتے ہیں مگر پرندے نیچے سے اوپر اور دور دراز بلندی پر اُڑتے ہیں اور نہیں گرتے۔

۴۔ زمین کی کششِ ثقل ہر زندہ اور مردہ کو اپنی طرف روکتی اور کھینچتی ہے۔ پرندوں کی مزاحمت کیونکر اس پر غالب آتی ہے؟ کرۂ ہَوا کی تیزی اور گردش زمین کی مخالف سمت میں کیونکر اڑتے اور پیغام پہنچاتے ہیں۔

۵۔ یہ سب اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت کی صنعت اور حِکمت ہے۔

۶۔ رَحمانیت کی صفت درحقیقت ہر چیز پُر حکمت بنانے اور اشیاء کے اندر درست توازن یا میزان قائم کر دینے کا نام ہے۔

پرندوں کا حُسنِ پرواز اور صفتِ رحمانیت

پرندوں کا حُسنِ پرواز، ان کے ہلکے پھُلکے جسم، ان کے دلآویز رنگ، ان کی نغمہ سرائی اور چہچہاہٹ یہ سب کچھ انسان کے دل کو نہایت خوبصورت اور بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کبھی کبھی انسان ان کے حُسن اور نغموں سے مسحور ہو کر حیرت میں کھو جاتا ہے یہ ظاہر ہے کہ ان پرندوں نے یہ خُوبیاں خود ہی پیدا نہیں کیں اور اپنے جسم کو یہ دلآویز حُسن خود ہی نہیں بخشا اور نہ اپنے خوبصورت بنانے میں ان کے اپنے کسی ارادہ کو دخل ہے۔ پھر نر اور مادہ دونوں کی الگ الگ خصوصیات ہیں، مور اور کبوتر جب رقص کرتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت اور دلآویزی نہ صِرف انسان کے لئے سرمایہ مسرّت ہے اس کی مادہ کے لئے بالخصوص وہ سحر انگیز ہوتا ہے مرغ کی کک کک انسانی موسیقی کے معیار پر گو پوری نہ اترتی ہو مگر مرغ کی بلند بانگ اس کی مُرغی کے لئے نہایت دِلفریب ہوتی ہے۔ آپ کے خیال میں بُلبل اچھا گاتی

ہے مگر مرغ کے متعلق مرغی کا فیصلہ ہی درست سمجھا جائے گا۔ ایک سرد اور خاموش رات میں درخت کی شاخ پر کوئی پرندہ گاتا ہے اس کی شیریں اور رسیلی لے پر مادہ کھنچی چلی آتی ہے۔ نر جانور کو یہ دلفریب ادائیں، پیارا پیارا حُسن اور مادہ پرندوں میں یہ جذبہ و جوشِ قبول محبت کس نے بخشا؟ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰن جس نے ہر جانور کو اپنی نوع کی بقاء کا عشق عطا کیا اسی رحمٰن کی حکمت اور صنعت نے نر و مادہ میں یہ سوز و ساز پیدا کیا تاکہ دنیا میں اس کی نوع کی حفاظت ہو۔

پرندوں کی ہوا میں پرواز بھی فیضانِ رحمٰن ہے

پرند دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو باوجود پَر رکھنے کے اڑنے سے قاصر ہیں دوسرے وہ جو اڑتے ہیں۔ وہ پرند جو پَر رکھنے پر بھی پرواز سے عاری ہیں ان کی ابتدائی نسلیں اڑ سکتی تھیں لیکن آہستہ آہستہ پرواز کی عادت ترک کر دینے اور مزید جدوجہد نہ کرنے کی وجہ سے ان کے جسم بھاری ہوتے چلے گئے اور پَروں کی قوت کمزور ہوتی چلی گئی۔ قرآن مجید میں جن پرندوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ اڑنے والے پرند ہیں۔

طَائِرٌ یَطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ طائر جو اپنے دو پَروں پر اُڑتا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں جس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ پرند ہوا میں کیونکر اُڑتے، پر سکیڑ کر ہوا میں قائم رہتے اور نیچے اُتر پڑتے ہیں اس رحمٰن حکیم مطلق کے سوا یہ کس کی اعلیٰ صنعت کا نمونہ ہے؟ پرندوں کے ہوا میں اُڑنے میں بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں۔

۱:۔ سب سے پہلے اس امر پر غور کرو کہ ہوا جس میں پرندے تیرتے ہیں رقیق اور لطیف بنائی گئی ہے جس کی وجہ سے اسے پھاڑنا اور اس پر

تیرنا آسان ہو گیا ہے ہوا کی نسبت زمین پر یا پانی میں دوڑنا زیادہ زور کو چاہتا ہے۔ ہوا اگر ایسی لطیف نہ ہوتی تو پرند کا اس سہولت سے اس پر اُڑنا محال ہوتا۔ اس کے لطیف ہونے کی وجہ سے ہی پرند اس میں آسانی سے پَر کھولتے اور سکیڑ لیتے ہیں ہوا کے سمندر کو پانی کے سمندر سے ہلکا بنا کر اس حکیم نے ہوا پر اُڑنا آسان کر دیا ہے۔

۲۔ دوسری طرف پرند کا جسم گو بھاری ہے اور اس کا بے سہارا ہوا میں ٹھہرنا محال ہے مگر جب وہ اپنے دونوں پَروں کو بیک وقت پھیلاتا اور ہوا میں پَر مارتا ہے تو ہوا کا بہت سا حصہ اس کے پَروں کے نیچے منتوّج اور پرند کا وزن ہوا کی نسبت ہلکا ہو جاتا ہے۔

۳۔ پرند کے جسم کے اندر ہڈیاں زیادہ ہلکی اور کھوکھلی بنا دی گئی ہیں جن میں ہوا بھر جانے کی وجہ سے پرند کا وزن ہوا کے مقابل اور بھی ہلکا ہو جاتا ہے جس سے زمین پر دوڑنے اور چلنے کی نسبت ہوا میں اُڑنا سہل ہو گیا ہے مگر پرندہ ہوا میں اڑتا ہی نہیں رہتا بلکہ اس کے لئے درخت یا زمین پر اترنا بھی ناگزیر ہے اس لئے پَروں کو پھیلنے والے ہی نہیں بنایا بلکہ نہایت آسانی سے سکڑنے والے بھی بنایا ہے تاکہ پرندہ بڑی آسانی سے پَر سکیڑ کر نیچے بھی اُتر آئے۔

۴۔ فضا میں تیرنے کا فعل اصولاً دو باتوں پر منحصر ہے کہ ہوا اور پرند کے وزن میں زیادہ فرق نہ ہو اور دونوں قریباً متوازن رہیں۔ اُڑتے وقت ہوا کی مزاحمت کم سے کم ہو پرند کو اوپر اُڑنے میں سہولت ہو اور نیچے اُترنے میں ایک دَم گر جانے کا خطرہ نہ ہو۔ جیسے پتھر وغیرہ گرتا ہے۔

۵ ۔ ہر حرکت بالخصوص پیہم اور تیز حرکت ایک طاقت کو چاہتی ہے اسی لئے جانوروں کا جسم کھانے پینے اور سانس لینے کا محتاج ہے کہ جس سے جسم میں طاقت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ریل موٹر وغیرہ بھاپ بجلی اور پٹرول کی طاقت سے چلتے ہیں مگر پرندے کے اعصاب میں شکر جلتی ہے جس کی طاقت سے وہ ہزار ہا میل سفر کرتا ہے، پھر رفتار کے تین درجے ہیں۔ چلنا دوڑنا اور اُڑنا۔ چلنے اور دوڑنے کے بعد لمبی چھلانگ لگانا بڑی طاقت کا کام ہے اور لمبی چھلانگ فی الحقیقت پرواز کی ابتداء ہے پرندہ پہلے ہی پہل جب اُڑنا سیکھتا ہے تو چھوٹی چھوٹی چھلانگیں بھرتا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ اپنے وزن کو دیر تک ہوا میں تھامنے (وَيَقْبِضْنَ) کے قابل ہو جاتا ہے اور اس کی انتہاء یہ ہے کہ لگاتار کئی کئی گھنٹے روزانہ اور بعض اوقات کئی دِنوں تک مسلسل سمندر کے اُوپر پرواز کرتا ہوا اسے پھلانگ جاتا ہے۔

۶ ۔ ننھی سی جان اور شدید ترین مزاحمت

ہمارا مشاہدہ ہے کہ جب مخالف ہوا تیز ہو تو آگے بڑھنے میں کتنی دِقّت پیش آتی ہے اور سائیکل پر کتنا زور لگانا پڑتا ہے۔ ایسے وقت ہوا کی شدّت کے علاوہ گردشِ زمین جو بذات خود نہایت تیز ہے اور کشش ثقل ان تینوں مزاحمتوں کا اس ننھی سی جان کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لئے اس مختصر سی مشین کی شکل وصورت اور اس کا ہر پُرزہ اڑنے کے لئے موزوں بنایا گیا ہے اور غور وفکر کرنے والے ہر سائنسدان کے لئے مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ (رحمٰن کے سوا کون ہے جو اسے ہوا میں روکے ہوئے ہے) کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ بحیثیت مجموعی پرندے کا جسم نہایت ہلکا بنایا گیا ہے۔

اس کی چونچ سر اور گردن یا اس کا اگلا حصہ چھوٹا اور نوکیلا بنایا گیا ہے تاکہ ہوا پھاڑنے اور آگے بڑھنے میں آسانی ہو اور جسم کے آخر پر دُم کا اڑنے اور مڑنے میں مدد دینے والا ہونا صانع کی کاریگری کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ جسم کے تناسب کے لحاظ سے پروں کا بڑا اور چھوٹا ہونا زیادہ مضبوط اور طاقتور ہونا۔ جھپٹ مارنے والے پرندوں کی طاقت کبھی کبھی اپنے وزن سے تین گنا زیادہ وزنی جانور اٹھالے جاتی ہے۔ چنانچہ عقاب اپنے چھ سیر ذاتی وزن کے ساتھ اپنے سے تین گنا زیادہ وزنی شکار اٹھا کر پانچ میل تک پرواز کر سکتا ہے۔ یہ ایک اور حسابی تناسب ہے۔ جو پرندے کو بنانے والے کے علم حساب کی باریکیوں سے پورا عالم ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ کوئی انجینیر بغیر ہارس پاور (گھوڑوں کی طاقت یعنی ایک گھوڑے یا انجن کا ۳۳ ہزار پونڈ وزن ایک منٹ میں ایک فٹ تک اونچا اٹھانا) کا تخمینہ جانے کے اتنی ہی طاقت کی مشین نہیں بنا سکتا کیونکہ اس کے ہر متعلقہ پُرزہ یا عضو وغیرہ کی مضبوطی اسی حساب سے رکھی جائے گی اسی لئے قرآن مجید نے فرمایا مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ ایسے دانا انجینیر کے سوا ہوا کے دوش پر ایسے بھاری اور طاقتور پرندوں کو کون اڑا سکتا ہے؟

۷۔ پرندہ کے اندر ہر عضو کا پُر حکمت ہونا

نہ صرف ظاہری شکل وصورت اڑنے کے لئے نہایت موزوں بنائی بلکہ اس کے ہر عضو کی ساخت اور بناوٹ میں اس امر کو ملحوظ رکھنا کہ وہ پرواز میں نہ صرف مزاحمت نہ کرے بلکہ زیادہ سے زیادہ ممد اور معاون ثابت ہو۔ انسان جب زمین پر دوڑتا ہے تو اس کے پھیپھڑے اپنے اندر زیادہ سے زیادہ ہوا کھینچ لیتے ہیں۔ جو اس کے اندر بطور ایندھن

جلتی اور طاقت پیدا کرتی ہے، پرند کو چونکہ ہوا میں زیادہ تیز اڑنا پڑتا ہے اس لئے اس کے پھیپھڑے بہت ہلکے اور زیادہ ہوا کھینچنے والے بنائے گئے ہیں اور اس کے جسم میں زیادہ ہوا بھرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے اس طرح ہڈیاں زیادہ مضبوط مگر زیادہ ہلکی اور لچکدار بنائی گئی ہیں۔

۸۔ پانی کے اثر سے محفوظ پَر

پرندوں کو ہوا کا زور۔ زمین کی کشش اور گردشِ زمین کی مزاحمت کے علاوہ بارش سے بھیگ کر پَروں کے بھاری اور خراب ہو جانے کا خطرہ بھی لاحق ہے اس کے لئے خدائے رحمٰن یا حکیم مطلق نے اس کے جسم میں ایسے غدود پیدا کئے ہیں جن میں سے روغن نکل کر پَروں کو چکنا کرتا رہتا ہے تا ان کے پَروں پر پانی کا اثر نہ ہو۔ پَر نہ خراب ہوں نہ بھیگ کر بھاری ہوں اور نہ خشک ہو کر ٹوٹ جائیں بلکہ لچکدار، پائیدار اور تر و تازہ رہیں۔

۹۔ جسم کے تناسب کے لحاظ سے پرندہ کے اعصاب زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔ جو زیادہ دیر تک ہَوا میں اڑنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔

۱۰۔ پرندہ کی ٹانگیں چونکہ عام طور پر اڑنے میں کوئی مدد نہیں کرتیں اس لئے وہ چھوٹی ہلکی اور پیٹ کے ساتھ لگ جانے والی بنائی گئی ہیں۔ جو صرف درخت یا زمین پر اترتے وقت کام آتی ہیں۔ بعض پرندوں میں جیسے چمگادڑ وغیرہ میں یہ ہلکی اور جھلی دار بنا دی گئی ہیں جو اڑنے میں بھی مدد دیتی ہیں۔ بخلاف اس کے انسان چونکہ طبعًا اڑنے والا نہیں بنایا گیا اس لئے اس کی ٹانگیں یا نیچے کا حصہ جسم کے تناسب کے لحاظ سے بھاری ہوتا ہے جو چلنے یا دوڑنے کے لئے نہایت موزوں ہے۔

۱۱۔ اکثر پرند گھونسلے اور سہارے سے بے نیاز ہو کر درخت کی

ٹہنی پر سو جاتے ہیں مگر اونگھ آنے سے گر نہیں پڑتے اس میں صانع قدرت نے یہ حکمت رکھی ہے کہ ان کے پنجوں کے پٹھے سوتے وقت خود بخود ٹہنی کے گرد اگرد اکڑ جاتے ہیں اور ان کی گرفت مضبوط ہو جاتی ہے یہ تمام امور جسم کی ساخت اور پُر حکمت مشینری ہونے کے اعتبار سے مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ کی تفسیر ہیں۔

۱۲۔ بیماریوں سے پرندوں کی حفاظت

قرآن مجید کے الفاظ میں مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ میں امساک صرف روک رکھنا ہی نہیں بلکہ اس کے ایک معنی حفاظت کرنے کے بھی ہیں۔ لغت میں ہے امساک الشئ التعلق بہ وحفظہ۔ انسان اپنی صحت جسمانی اور تندرست رہنے کے لئے علم اور تجربہ کا محتاج ہے اس کی حفاظت اولاد بھی بہت کچھ غور و پرداخت پر منحصر ہے مگر جانوروں میں انڈوں، بچوں کی حفاظت، دشمنوں اور آفات ارضی و سماوی سے بچانے کے لئے گھونسلوں کی تعمیر۔ غذا کی شناخت، بیماری سے بچاؤ اور علاج، گندے اور غلیظ روگوں سے بچاؤ، نر و مادہ کے تعلقات میں اعتدال اور وقت کی رعایت یہ سب کچھ خدائے رحمٰن کی وحی Instinct سے ہوتا ہے۔ پرندوں میں شرمناک بیماریوں اور جذام کا فقدان ہے (سوائے ان شاذ صورتوں کے کہ انسان کی صحبت میں رہ کر بعض متعدی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ پرندے چونکہ ایک خاص نظام حیات کے پابند ہیں جو ان کے اندر رحمٰن نے وحی کر دیا ہے۔ (وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ)[1] اس لئے قدرت ان کی خطرناک دکھوں اور روگوں سے حفاظت کرتی ہے۔ بلی اور کتا گوشت خور

[1] ۱۶: ۶۸

جانور ہیں مگر کبھی کبھی اپنے ہاضمہ کی درستی کے لئے گھاس بھی کھا لیتے ہیں اسی طرح پرند بھی حسب ضرورت اپنے علاج معالجہ سے خبردار کر دیئے گئے ہیں جانور نہ قبل از وقت بوڑھے ہوتے ہیں نہ کبھی مسواک کرتے اور منجن ملتے ہیں بایں ہمہ ان کے دانت نہ درد کرتے ہیں اور نہ بوسیدہ ہوتے اور گرتے ہیں۔

۱۳۔ پرندوں میں سمت کا احساس

ناموافق اور ناگوار حالات میں نقلِ مکان بھی کرتے ہیں اور ہزارہا میل کا سفر طے کر کے انتہائی گرمی اور سردی سے اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مختلف پرندوں اور جانوروں میں حفاظت اور دشمنوں سے بچاؤ کے سینکڑوں مختلف طریق پائے جاتے ہیں گو انسان نے زندگی بسر کرنے کی بے شمار راہیں اپنے تمدن و معاشرت، صحت و صفائی کے بارہ میں انہی جانوروں سے سیکھی ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ انسان کی کوئی نئی سے نئی دریافت اصول علاج کے متعلق ایسی نہیں جو پرندوں میں پیشتر سے نہ پائی جاتی ہو۔ اگر کسی وقت وہ متعفن لاش اور غلاظت وغیرہ کو مٹی میں چھپا دینے کے لئے بلّی اور کوّے سے سبق سیکھنے کا محتاج تھا۔ تو انجکشن دے کر مُردے کو بے ہوش کر دینے (اپنے آنے والے بچوں کے لئے محفوظ خوراک بنا دینے) کا سبق جنگلی بھڑ سے سیکھ سکتا ہے۔

پرندوں کے دماغ کے اندر ایک اور راز کی بات ان میں سمتِ احساس ہے۔ گرمی کا موسم شمالی یورپ میں گزارنے کے لئے بعض پرندے افریقہ سے پرواز کرتے ہیں یہ سوال ایک نہایت ہی دلچسپ سوال ہے جو عرصہ دراز سے سائنسدانوں کے لئے معمہ بنا ہوا ہے۔ کہ یہ پرند دُور دراز

مسافت سے کیوں کر اپنے گھر کا راستہ معلوم کر لیتے ہیں خواہ انہیں صندوق میں بند کر کے جس میں سے وہ مطلق دیکھ نہ سکتے ہوں دُور لے جا کر چھوڑ دیا جائے بعض کہتے ہیں کہ چونکہ ان کی نظر نہایت تیز ہوتی ہے۔ وہ بہت دُور تک دیکھ سکتے ہیں بعض کا خیال ہے کہ ان میں سمت پہچاننے کی ایک خاص حِس یا کپاس رکھ دی گئی ہے اور کئی یہ کہتے ہیں کہ جب یہ بلندی پر اڑتے ہیں تو اردگرد کی چیزوں کو یاد رکھتے ہیں اور ان کا حافظہ نہایت تیز ہے کہ وہ ان نشانات سے گھر کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ بہرحال قرآن مجید نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے تذکرہ میں پرندوں کی ان خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ کہ ان کے لشکر میں ایسے پرندوں کا ایک گروہ تھا جو دُور دراز ملکوں سے پیغام لاتے لے جاتے تھے۔ سمت پہچاننے کی یہ حِس بھی عطاءِ رحمٰن ہی سے انہیں ملی ہے۔

۱۴۔ پرندوں میں اعتدال حرارت

انسان اپنے اندر حرارت کو معتدل رکھنے کے لئے دواؤں کا محتاج ہے مگر پرندوں میں حرارت کو باقاعدہ رکھنے کے لئے ان کے دماغ میں تھرموسٹیٹک مرکز مقرر کر دیا گیا ہے جو ان کی جسمانی حرارت کو حد اعتدال سے بڑھنے نہیں دیتا۔ رینگنے والے جانوروں کی نسبت پرندوں کا انحصار دماغ پر زیادہ ہے اس لئے ان کی زندگی کی حفاظت کے لئے دیکھنے اور سننے کی قوت ان میں زیادہ تیز ہے۔

ہمارے ہوائی جہازوں کے حادثات ابھی تک بہت زیادہ ہیں لیکن پرندوں میں اس قسم کے حادثات ندارد ہیں۔ وہ اپنے پروں کی حرکت بند کر کے نہایت محفوظ پیراشوٹ کی طرح آسانی سے نیچے اتر آتے ہیں گویا اپنا انجن بند کر کے قدرتی ہوائی جہاز خود بخود کمال سہولت سے

زمین پر اتر پڑا یہ سہولت ابھی انسانی ہوائی جہاز کو حاصل نہیں۔

۱۵۔ پرندوں میں اخلاقی حس

اس مضمون کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمٰن کا اظہار اس کی محبت کا فیضانِ اثر بتایا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اس اخلاقی حس کا ذکر کوّے کی تمثیل میں بیان فرمایا ہے۔ فرمایا:

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ (۵:۳۱)

"سو اللہ تعالےٰ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کریدتا تھا تاکہ اس انسان کو سکھائے کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کے عیب کو چھپائے (یہ دیکھ کر) اس نے کہا ہائے مجھ پر افسوس مجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوّے کی مانند بھائی بھائی سے محبت اور ہمدردی دکھاتا اور اپنے بھائی کے عیب کو چھپاتا اس پر وہ سخت نادم ہوا۔" کوّا اگرچہ دوسرے پرندوں کے لئے حریص اور بے رحم شکاری پرندہ ہے مگر اپنی نسل اور بھائیوں کا بدرجہ غایت ہمدرد اور خیر خواہ ہے۔ جہاں کوئی چیز کھانے کی پاتا ہے کائیں کائیں کر کے سب بھائیوں کو بلا لیتا ہے اور شکاری کے آگے اڑتا شور مچاتا ہوا دوسرے بھائیوں کو خبردار کرتا جاتا ہے کوّے کی اپنے بھائیوں سے یہ محبت اور آدم کے فرزندوں کی اپنے بھائیوں سے دشمنی اور خونریزی انسان کے لئے ندامت اور شرم کی جا ہے۔

بائبل نے اس موقعہ پر کوّے کی مثال سے ایک اور سبق دیا ہے گناہ کو ایک حریص شکاری سے تشبیہ دیکر ایک بھائی دوسرے بھائی سے کہتا ہے اگر تو اچھا نہ کرے تو گناہ دروازے پر تیری تاک میں ہے۔

یعنی اگر تو گناہ کے ارادہ پر قابو نہ پاسکے تو پھر گناہ تیری تاک میں ہے جیسے کوّا اپنے شکار کی گھات میں رہتا ہے۔ عبرانی بائبل کے الفاظ ہیں لفتیح حطۃ رو بیص گناہ دروازہ پر گھات لگائے ہوئے ہے۔ انسان اگر بدارادہ پر قابو نہ پاسکے تو بدارادہ اور گناہ انسان کو دبوچ لیتا ہے جیسے کوّا چڑیا کے بچہ کو دبوچ لیتا ہے۔

ہابیل اور قابیل کے قصہ کے متعلق ایک نیا خیال

میرے خیال میں آدم کے دو بیٹوں (قابیل اور ہابیل) کے تذکرہ میں جہاں یہ آیت وارد ہوئی ہے کوّے نے زمین کھود کر اپنے بھائی کی لاش دفن کرنے کا طریقہ نہیں سکھایا کیونکہ یہ واقعہ شروع دُنیا کا نہیں بلکہ بنی اسرائیل کے ابتدائی زمانہ کا ہے۔ بائیبل نے دو الگ الگ بھائیوں کے تذکرہ کو یک جا گڈمڈ کر دیا ہے جیسا کہ موجودہ تحقیقات سے ثابت ہے (سائیکلوپیڈیا بیبکا مؤلفہ چینی زیر عنوان قائن)۔

کوّا انسان کو یہ سبق دیتا ہے کہ اسے اپنے بھائیوں کے ساتھ پوری پوری محبت کرنی چاہیئے تاکہ اپنے بھائی کے خلاف گناہ سے باز رہے ورنہ وہ خود گناہ کا شکار ہو کر بعد میں شرمندہ اور نادم ہوگا۔ چنانچہ حضرت مسیح کے ایک حواری یوحنا نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے:۔

"اور وہ جو اپنے بھائی سے محبت نہیں رکھتا وہ خدا کا نہیں کیونکہ وہ پیغام جو ہم نے شروع سے سُنا ہے یہی ہے کہ ایک دوسرے سے محبت رکھیں قائن کی مانند جو اس شریر (شیطان) کا تھا اور اپنے بھائی کو اس نے قتل کیا اس واسطے اس کے کام بُرے تھے پر اس کے بھائی

کے اچھے تھے اے میرے بھائیو! اگر دُنیا ہم سے دشمنی کرے
تو تعجب مت کرو ہم تو جانتے ہیں کہ ہم موت سے گذر کر
زندگی میں آئے کیونکہ ہم بھائیوں سے محبت رکھتے ہیں جو
اپنے بھائی سے محبت نہیں رکھتا سو موت میں رہتا ہے ہر ایک جو
اپنے بھائی سے دشمنی رکھتا ہے خونی ہے اور تم جانتے ہو کہ
کوئی خونی ہمیشہ کی زندگی نہیں پاتا کہ اس میں موجود رہے ہم
نے اس سے محبت کو جانا کہ اس نے ہمارے واسطے جان
دیدی لازم ہے کہ ہم بھی بھائیوں کے واسطے اپنی جان
دے دیویں۔"

(۱۔یوحنا حواری کا پہلا خط باب ۳۔ آیت ۱۰ تا ۱۶)

کوّے کی مثال سے دو اور سبق

جناب ایوبؑ نے کتاب ایوب میں اور داؤد علیہ السّلام نے زبور میں فرمایا:۔

"کون جنگلی کوّے کی غذا تیار کرتا ہے جس وقت اس
کے بچے خدا سے فریاد کرتے ہیں اور وہ خوراک کی کمی کی وجہ
سے مضطرب پھرتے ہیں۔"

(ایوب ۳۸: ۴۱)

"جو بہائم کو روزی دیتا ہے اور کوّوں کے بچوں کو بھی
جو بھوک سے چلاّتے ہیں۔"

(زبور: ۱۴۷: ۹)

اسی کی تائید میں جناب مسیح علیہ السّلام نے فرمایا:

"کوّوں کو دیکھو جو نہ بوتے نہ کاٹتے ہیں نہ ان کے کھتا اور کوٹھی ہے تو بھی خُدا انہیں کھلاتا ہے تم تو چڑیوں سے کہیں بہتر ہو تم میں سے کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر کو یا قد کو ہاتھ بھر بڑھا سکے۔"

(لوقا ۱۲: ۲۴ و ۲۵)

قرآن مجید کی زیرِ بحث آیت پر زیادہ غور کرنے سے اور سورۃ کے نام المائدہ کو مدنظر رکھ کر (کہ جس میں یہ دو بھائیوں کی تمثیل مذکور ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دو آدمی جب دنیا میں عروج حاصل کرنا چاہتے ہیں ان میں سے ایک تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اور دوسرا انسانی تہذیب اور تمدّن کے خلاف فساد کی راہ چُن لیتا ہے متّقی یا صحیح راستہ پر چلنے والا کامیاب ہو جاتا ہے مگر غلط رَو ناکام ہوتا ہے اس کے بعد نامراد کے دل میں نیک آدمی سے حسد پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس کے قتل کے دَرپے ہو جاتا ہے یہ ایک عام قاعدہ ہے۔ کوّا کسی شخص کے سامنے زمین کُریدتا ہے۔ بحث فی الارض کے معنی ہیں انکشاف کرنا۔ کوئی چیز طلب کرنا۔ انسان کو پرندے یہ سبق دیتے ہیں کہ زمین میں رزق کی کمی نہیں مگر اڑنا اور تلاش کرنا اور محنت کرنا شرط ہے۔ آیت میں یہ ذکر نہیں کہ ایک زندہ کوّا دوسرے مردہ کوّے کو دفن کرتا یا اس پر مٹی ڈالتا تھا۔ یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جانور اور پرندے بالخصوص کوّے زمین میں چھپی ہوئی چیز کو بھی کرید کر نکال لیتے ہیں اور دوسرے کوّوں کو بھی ہمدردی کے جذبہ یا اپنی نوع کے ساتھ محبت کی وجہ سے کائیں کائیں کر کے بلا لیتے ہیں۔ افسوس اس امر پر ہے کہ انسان اپنے ہی غریب بھائی پر ظلم سے دست درازی کرتا

ہے اسے قتل کرنا اور خود موٹا ہونا چاہتا ہے چنانچہ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ کوّا مردہ کوّے کی لاش پر مٹی نہیں ڈالتا تھا بلکہ مقتول شخص پر مٹی ڈالتا تھا۔ عقل کی رُو سے یہی امر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ کوّے کو زمین کھودتے دیکھ کر اس شخص نے یہ سبق لیا کہ محنت کرنے سے رزق کا بافراغت ملنا اپنے بھائی کو قتل کر کے اس کا وارث بننے سے بہتر ہے۔

انہی نوشتوں اور انبیاء کی زبان میں (جیسا کہ بائیبل کے حوالجات سے دکھایا گیا) کوّے کی تمثیل اسی غرض سے دی گئی ہے کہ اللہ تعالےٰ سب کا رازق ہے اور اس نے اپنی رحمانیت سے یہ وسیع زمین ہمیں جدوجہد اور آباد کرنے کے لئے دی ہے سوائے سانپ اور بھیڑیئے کے اپنے ہم جنس کا کوئی بھی خونخوار نہیں مگر افسوس انسان سانپ اور بھیڑیے سے بھی بڑھ کر اپنے بھائیوں کا خون چوستا ہے خواہ مہلک ہتھیار بنا کر یا تجارت میں بلیک کر کے تمدن اور تہذیبِ انسانی کی جڑ پر کلہاڑا مارتا ہے۔

آدم کے دو بیٹوں کا تذکرہ

قرآن مجید کی آیت
وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ
اٰدَمَ بِالْحَقِّ الخ (۵ : ۲۷) میں پہلے تو ان کو ایک ہی باپ کے دو بیٹے فرمایا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ان کا آپس میں نہایت ہی قریبی اور خونی تعلق تھا ویسے بھی شیخ سعدی رحمہ نے فرمایا :۔

بنی آدم اعضائے یک دیگراند — کہ در آفرینش زیک جوہراند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

اس قرابت اور خونی رشتہ کی وجہ سے ان کی آپس میں محبت اور ہمدردی ہونی چاہیئے تھی۔ اس کے بعد دوسرا امر جو داعیٔ محبت ہے

یہ فرمایا کہ دونوں میں سے ایک بھائی متقی اور خدا ترس انسان تھا اور اس نے اپنے بھائی کو کوئی نقصان نہ پہنچایا تھا اور نہ ہی آئندہ اسے نقصان پہنچانے والا تھا۔ ۳۔ کتنا نیک تھا وہ انسان کہ اپنے بھائی کے ارادۂ قتل کو بھانپ کر بھی وہ اپنے آپ سے باہر نہ ہوا نہ اسے غصہ آیا اور نہ ایسے سنگین فعل پر سخت کلامی کی بلکہ نہایت نرمی سے یہ کہا "تیرے خلاف کسی بُرے فعل کا اقدام تو کہاں میں تو اس کا خیال کرتا ہوا بھی اس خدا سے ڈرتا ہوں جو میرا اور تیرا دونوں کا ایک ہی رب ہے۔" اس انتہائی نرمی اور بُردباری کے باوجود نالائق بھائی کا دِل نرم نہ ہوا اور اس نے موقع پاکر اپنے بھائی کو قتل کر ڈالا۔

اپنی جنس اور بھائی کے ساتھ ہمدردی اور پیار کا جذبہ جانوروں میں موجود رہتا ہے اس کی بہترین مثال کوّا ہے ایک ظالم بھائی نے انسان ہوکر نہ انسانیت کا احترام کیا اور نہ اخوت کا پاس رکھا اور انتہائی سنگدلی سے اپنے بھائی کو سویا ہوا پاکر قتل کر ڈالا۔ کوّا اپنی جنس کا کس قدر ہمدرد ہوتا ہے جہاں کھانے کی کوئی چیز پاتا ہے کائیں کائیں کرکے سب کو بلا لیتا ہے۔ جب کوئی شخص گھر سے بندوق لے کر شکار کو نکلتا ہے تو وہ غُل مچاتا اور اپنے بھائیوں کو خطرہ کا الارم دیتا ہوا آگے آگے اڑ جاتا ہے [1] اپنی جنس سے ہمدردی کے بعد دوسرا درجہ

---

[1] **ایک لطیفہ** بائیبل میں کوّے کے ذکر کے سلسلہ میں ایک اور قصہ بھی قابلِ غور ہے جس سے اس کتاب کے اکثر مضامین محرّف۔ مبدّل ثابت ہوتے ہیں سلاطین اوّل باب ۱۷، آیت ۲ تا ۶ میں لکھا ہے۔ "ایلیاہ نبی پر خداوند

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اپنے ماں جائے بھائی کے ساتھ پیار اور محبت کا درجہ ہے اور ان دونوں کے بعد تیسرا درجہ اپنے بھائی کی نیکی اور نیک زندگی سے متاثر ہونے کا درجہ یا اس سے محبت

بقیہ حاشیہ : کا کلام نازل ہوا اور اس نے کہا کہ یہاں سے چل دے اور پُورب کی طرف اپنا منہ کر اور وادی کریت میں جو یرون کے سامنے ہے جا چھپ اور ایسا ہوگا کہ تو اس نالہ سے پیئے گا اور میں نے کوّوں کو حکم کیا ہے کہ وہاں تیری پرورش کریں سو وہ روانہ ہوا اور خداوند کے کلام پر عمل کیا کیونکہ وہ گیا اور وادی کریت میں جو یرون کے سامنے ہے بیٹھ رہا اور ہر صبح کوّے اس کے لئے روٹی اور گوشت لاتے تھے اور شام کو بھی روٹی اور گوشت لاتے تھے اور وہ نالہ کا پانی پیتا تھا۔" اس حوالہ میں دو مرتبہ ایلیا کے لئے صبح و شام کوؤں کا روٹی اور گوشت لانا مذکور ہے۔ بائیبل کے تمام اردو۔ انگریزی۔ فارسی اور عربی ترجموں میں بھی یہی ترجمہ دیا گیا ہے یہاں تک کہ امریکہ کی مطبوعہ مترجم بائیبل جو یہود نے چھاپی ہے اس میں بھی یہی ترجمہ ہے۔ مگر عبری بائیبل میں کوّوں کے لئے لفظ عوربیم آتا ہے جس میں م جمع ہے۔ عوریب کے معنی کوّا بھی ہیں، اور عرب کا باشندہ بھی اور فلسطین کے انتہائی جنوب میں عرب کا ملک ہی ہے دوسری طرف عبرانی میں غین نہ ہونے کی وجہ سے غراب کو عوریب لکھتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں نے اہل عرب کی بجائے اس کا ترجمہ کوّا کر دیا یعنی مہمان اور نیک انسان ہونے کی وجہ سے اہل عرب ان کو گوشت اور روٹی کھلاتے رہے۔ ترجمہ کرنے والوں کی ذرا سی غلطی نے اسے افسانہ (معجزہ) بنا دیا۔ بائیبل کی اصل اور ترجموں میں ایسی بہت سی فروگذاشتیں اور لغزشیں ہیں جو علماء کی توجہ کی محتاج ہیں بالخصوص ان علماء کی جو عبرانی۔ عربی اور سامی زبانوں کے عالم ہوں۔ اسی طرح یرمیاہ نبی کی کتاب ۲:۳ میں یہی لفظ موجود ہے اور آیت کا ترجمہ ہے "پہاڑوں کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا اور دیکھ کونسی جگہ ہے جہاں تو نے زنا نہیں کیا عرب کی مانند جو بیابان ہے تو ان کے لئے راہوں پر بیٹھی" مگر ایک مرتبہ اس کا ترجمہ یوں کیا گیا "بابلیوں کے خُدا کوّوں کی مانند ہیں جو آسمان اور زمین کے درمیان اُڑتے ہیں۔"

کرنا ہے۔ اس تذکرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک ظالم انسان بداندیش بھائی اور سنگدل شخص نے اخوت کے تعلقات اتقا اور احسان کے اعلیٰ اخلاق اور معصومیت کی نرم اور نازک رگ پر نہایت بے دردی سے چھری چلادی۔

قرآن مجید کا اسلوب بیان کس قدر حکیمانہ ہے۔ نفسیاتی نکتہ نگاہ سے ایک شخص کے اندر دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ ابھارنے والے جس قدر موجبات ہیں ان کو بیان کیا بالآخر ان کے خون کر دینے کا ذکر کرکے یہ ثابت کر دیا کہ ایسا شخص انسانیت سے گرا ہوا ایک ادنیٰ جانور سے بھی حقیر اور قابلِ نفرت انسان ہے۔ کوا اگر ایک طرف جانور ہونے کی وجہ سے فطرتاً حرص اور لالچ کا بندہ ہے اور دوسروں کو دُکھ دیتا ہے تو دوسری طرف اپنے بھائیوں کا بے انتہا خیر خواہ ہمدرد اور سوشل جذبہ کا مالک ہے مگر ظالم انسان انسان کہلانے پر بھی برادرانہ اُنس موانست سے بالکل بیگانہ ہے۔

نفسیاتی اعتبار سے الرحمٰن ہمیں کیا تعلیم دیتا ہے

آیت مذکورہ بالا میں تین مرتبہ اَخِی اور اَخِیہ (بھائی اور اس کا اپنا بھائی) کے الفاظ استعمال فرما کر کے یہ بتایا ہے کہ بھائی کا بھائی پر کس قدر حق ہے بھائی خواہ ایک ہی ماں باپ کا بیٹا ہونے کے لحاظ سے ہو یا جنس اور قوم کے اعتبار سے جیسا ایک کوا دوسرے کوؤں کا بھائی ہے۔ یا شہر۔ وطن۔ پیشہ۔ ہم سبق ہمسفر اور ہمسایہ ہونے کی نسبت سے ہوں ان سب کے ایک دوسرے پر برادرانہ حقوق ہیں اور قرآن مجید جو سوشل سائنس پر ایک بے نظیر کتاب ہے اس میں ان سب کے حقوق کا ذکر ہے۔

الرّحمٰن کے معنی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے اپنی تمام مخلوق پر بلا کسی تخصیص، بلا معاوضہ بغیر کسی محنت کوشش اور دُعا کے اپنے انعامات کی بارش برساتا ہے اور انسان پر اپنے احسانات کی اس قدر بخشش کرتا ہے کہ اگر وہ غافل نہ ہو اور اس کا علم حاصل کرے تو اپنے دل میں اس کی محبت اور کشش محسوس کرنے لگتا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں اپنے آپ کو یوں رنگین کر سکتا ہے کہ وہ بھی بلا معاوضہ بغیر بدلہ کی نیّت کے دوسروں سے نیکی اور احسان کرنے کی عادت ڈالے اور ایسے اخلاق اختیار کرے کہ لوگ اپنے دل میں اس کی محبت محسوس کرنے لگیں اور اس طرح وہ اللہ تعالےٰ کا بھی اور مخلوق خدا کا بھی محبوب ہو جائے۔ غرض اور مطلب کی پُر تکلّف دعوت کی نسبت خُلوص اور بے غرضی کا نان و نمک ثواب میں شامل ہے۔ اسلام میں لوگوں سے حُسنِ سلوک عبادت میں داخل ہے۔ اس لئے یہ دُنیوی نفسانی اور ذاتی اغراض اور نفع کی اُمید سے پاک ہونا چاہیئے چنانچہ فرمایا:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (۲:۲۰۷)

" اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو بیچ ڈالتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے"

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ (۲:۲۶۵)

"اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ کی رضا چاہتے ہوئے۔"

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ (۲:۲۷۲)

" اور تم خرچ نہیں کرتے مگر اس لئے کہ اللہ کی رضا چاہو۔"

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (۴ : ۱۱۴)

" جو شخص اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ایسا کرے گا اسے ہم بہت بڑا اجر دیں گے۔"

بغیر کسی غرض اور لالچ کے احسان کرنے کی تعلیم جو صفت رحمان کا پَرتو ہے کے بعد اُن اخلاقِ عامہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے جن میں اِنسان کے اِنسان پر حقوق کی تفصیل مذکور ہے۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۳ : ۱۳۳)

" اور سخت غضب کو دَبا لینے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔"

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا (۴ : ۱۴۹)

" اگر تم نیکی کو ظاہر کرو یا اُسے چھپا کر کرو، یا بدی سے درگذر کرو تو اللہ معاف کرنے والا اور قدرت والا ہے۔"

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (۱۵ : ۸۵)

" سو خوش اسلوبی سے درگذر کرتے رہو۔"

فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا (۱۷ : ۲۸)

" (اگر مسافر اور مسکین کو کچھ دے نہ سکو) تو ان سے نرمی سے بات کہدو۔"

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲ : ۸۳)

" اور لوگوں کو اچھی بات کہو "

قرآن مجید کا یہ مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اس کا اختصار مشکل ہے والدین سے سلوک بڑوں کی عزت۔ چھوٹوں سے محبت۔ اپنے بھائی کے لئے وہی چاہنا جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ غلاموں۔ ہمسایوں۔ یتیموں، بیواؤں۔ مسکینوں سے سلوک، اہل وعیال کی پرورش حاجت مندوں کی امداد۔ اندھوں کی دست گیری۔ مقروض کی گردن قرض سے چھڑوانا۔ بیماروں کی عیادت اور خدمت، دوسروں کی مصیبت پر خوش نہ ہونا اور ہمدردی کرنا۔ شیریں کلامی۔ خوش خُلقی۔ فیاضی۔ مہمان نوازی۔ مسافروں کی خدمت اپنے بھائیوں کی عیب پوشی۔ سلام و تحیہ۔ مصافحہ۔ معانقہ، صدقہ و خیرات کی تفصیل میں فرمایا جس کے پاس زیادہ ہو وہ دوسروں کی حاجت روائی پر خرچ کرے حاجت مند ہونے کے باوجود اپنی ضرورت پر دوسروں سے ہمدردی کو ترجیح دینا۔ وہ چیز دوسروں پر خرچ کرنا جو اپنے کو محبوب ہو یعنی اچھا اور پاکیزہ مال جو محنت سے کمایا گیا ہو مسکینوں پر صدقہ کرنا۔ اپنے ڈول کا پانی بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔ صدقہ کرکے احسان نہ جتاؤ۔ خفیہ بھی صدقہ کرو اور علانیہ بھی تاکہ دوسروں کو بھی ترغیب ہو۔

انسانی جسم کے اندر رحمانیت کے کرشمے

اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمان پر بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ بتایا تھا کہ اس کے ایک معنی قرآن مجید نے ہر شئے کو بالحکمت بنانے والا بھی بتائے ہیں اسی کی تفصیل میں پرندوں کے ایک ایک پَر اور پرزہ کا نہایت دانائی اور حکمت اور اس کے وظیفۂ عمل کے لحاظ سے موزوں ہونا بیان کیا تھا جو مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمٰنُ کی تفسیر تھا۔ یعنی

رحمان کے سوا کون فضاءِ آسمانی میں ان کی حفاظت کرتا ہے اُس کی حکمتِ بالغہ اور صنعتِ کاملہ نے پیشتر سے ان کے جوڑ جوڑ اور بند بند کو کانٹے کی تول موزوں بنایا ہے کہ کسی جگہ کوئی نقص نظر نہیں آتا اور وہ نہایت آسانی اور آزادی سے فضائے آسمانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ دوسری جگہ اپنی صفتِ رحمٰن کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۱ : ۴۲)

"کہو کون رات کو اور دن کو رحمٰن کی جانب سے تمہاری حفاظت کرتا ہے مگر وہ اپنے رب کی یاد سے منہ پھیر رہے ہیں"

يَكْلَؤُ اور كلاء کسی چیز کی حفاظت کرنا اور اسے بقاء عطا کرنا ہیں۔ رحمان سے حفاظت کرنے کے معنی ہیں اگر اللہ تعالیٰ کی رحمانیت نہ ہو تو انسان شب و روز اپنے خفیہ اور ظاہر دشمنوں سے گھرا ہوا ہے انسان کا نظامِ حیات بے شمار قواعد اور قوانین کا حامل ہے جس کی پابندی کے بغیر انسانی زندگی محال ہے اور یہ سارا نظام اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمٰن کے ماتحت ہے آیت مذکورہ سے پہلے یہ ذکر تھا کہ منکر لوگ اپنے آپ کو عذابِ آخرت سے بچا نہ سکیں گے اب بتایا کہ اس کے اوپر دلیل یہ ہے کہ رات اور دن اگر خدائے رحمان کی حفاظت شامل نہ ہو تو اس دنیا میں بھی انسانی زندگی کا قیام و بقا ناممکن ہے اگر وہ آفات کو اپنی رحمانیت سے روک نہ دے جو ہمارے اندر ہر آن پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ ان حفاظتی تدابیر کو پیدا نہ کرے جو ممدِ حیات ہیں اور ان ہماری غلطیوں اور خطاؤں کا اپنے آبِ رحمت سے ازالہ نہ

کر دے۔ جو ہمیں ہر لحظہ ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں تو ہمارا جینا ناممکن محض ہے۔

یہاں رات اور دن سے مراد رات اور دن کا ہر ثانیہ ہے اور پھر اس میں نہایت صفائی سے یہ اشارہ بھی کر دیا ہے کہ دونوں وقتوں کی مخصوص آفات ہیں دن میں جب تم جاگتے ہو اور رات کو جب تم سوتے ہو رحمٰن سر پر کھڑا تمہاری حفاظت کرتا ہے اس کی پوری پوری تفصیل ایک قابل ڈاکٹر یا محرم تشریح الابدان ہی بیان کر سکتا ہے تاہم موجودہ تحقیقات سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی رحمانیت پر دلائلِ عقلیہ کا ایک نہایت ہی وسیع اور دلچسپ باب کھلتا ہے۔

انسانی جسم خالقِ کائنات کا ایک بے نظیر شاہکار ہے اس سہ منزلہ عمارت میں ایک عظیم الشان ورکشاپ ہے جس کا ہر حصہ بلحاظ مقاصد اور پائیداری اس قدر مکمل ہے کہ کوئی انسانی صنعت و ایجاد جو بن چکی ہے یا آئندہ بنے گی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے اندر لاکھوں مختلف اشیاء ہیں اور اس کی پوری آبادی خلیات (سیلز) کا مجموعہ ہے، ہر خلیہ کا ایک خاص وظیفۂ عمل اور ایک خود مختارانہ زندگی ہے۔ مثلاً ہڈی کا خلیہ (سیل) خوراک میں سے صرف چونا کو جذب کرلے گا لیکن عصبی خلیہ اسے قبول نہ کرے گا ایک شہوانی خلیہ خون میں سے اپنا زوج لیتا ہے لیکن دوسرے اعضاء کے خلیے اسے چھوڑ دیں گے۔ ہر خلیہ یا سیل (Cell) اپنی الگ زندگی حرکت اور خاص مقصد رکھتا ہے۔ وہ جسمانی ریاست کا خود مختار شہری ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس

ریاست کے دوسرے شہریوں کے ساتھ بھی جسم کی حفاظت اور بہبود کے لئے اتحادِ عمل رکھتا ہے۔

ہماری صحت خلیوں کے اتحادِ عمل کا نام ہے

ہماری صحت درحقیقت اپنی لاکھوں خلیات کے اتحادِ عمل کا نام ہے یہ خالقِ ابدان کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے کہ جسم اپنے اندر کروڑوں اور اربوں آزاد خلیات رکھتا اور ان میں اعتدال برقرار رہنے کا نام صحت ہے ہم اس وقت چیخ اٹھتے اور اپنے آپ کو آسیب زدہ محسوس کرتے ہیں جب یہ خلیات باہم رنجیدہ ہوتے یا باہم بیمار ہوتے ہیں پہلے آپ خون کو لیں جو ہماری جان یا سرمایۂ حیات کہلاتا ہے اس میں ۲۵ کھرب سُرخ ذرّات ہیں اور ہر ۵۰۰ سرخ ذرات کے حساب سے اس میں ایک سفید ذرّہ ہے اعداد و شمار کا یہ دشوار گذار حل اس مثال کے ذریعہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ آپ ہر ذرّہ خون زمین پر ترتیب وار پھیلا دیں تو وہ ۲۵۰۰ مربع گز زمین پر چھا جائیں گے اور اگر آپ انہیں ایک قطار میں دوش بدوش رکھدیں تو وہ ۱۲۰۰ میل پر پھیل جائیں گے۔

اس میں ایک اور عجوبہ یہ ہے کہ ہمارا دل ایک رات اور ایک دن میں ایک لاکھ مرتبہ خون کو ضرب لگاتا ہے اور اس عرصہ میں جو کام وہ کرتا ہے اس کا اندازہ ۵۰ ٹن یا ۱۴۰۰۰ من وزن زمین سے ایک فٹ اونچا اٹھانے کے برابر ہے کیونکہ دل ایک منٹ میں ۷۵ اور ۲۴ گھنٹہ میں ایک لاکھ ضرب لگاتا ہے اور فی ضرب ½۱ چھٹانک خون کے حساب سے تمام جسم میں پہنچاتا ہے۔ گو ایک آدمی کے جسم میں ۱۵ پائینٹ یا ½۷ سیر خون ہوتا ہے جسے دِل بار بار سارے جسم میں باریک باریک رگوں

کے ذریعہ سینچتا ہے، رات اور دن کسی وقت سونا نہیں اور لگاتار کام میں لگا رہتا ہے اور اوسطاً ستر سال تک کام کرتا ہے اس کی جسامت دیکھو تو وہ ایک مٹھی سے زیادہ نہیں۔ اس کے رات اور دن کے روزانہ کام کا حساب لگاؤ اور پھر ۷۰ برس یعنی ۲۵۵۵۰ دن کے ساتھ اس کے روزانہ کام کو ضرب دو، اتنا چھوٹا سا گوشت کا لوتھڑا اور اس کا اتنا عظیم الشان کام کیا کسی قسم کی دھات کی مشین اور اتنا چھوٹا پمپ اس کا مقابلہ کر سکتا ہے یہ خیال ہی ایک انجینیر کو حیرت زدہ کر دیتا ہے کہ کوئی دھات کی مشین رات دن کام کرتی رہے اور ۷۰ سال تک لگاتار چلتی رہے اور وہ محض ایک نرم و نازک اعصابی تھیلہ ہو کیا کسی انجینیر اور ماہر فن کاریگر کی نگرانی اور حفاظت کے بغیر رات اور دن یہ کام ستر سال تک چل سکتا ہے قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ اس عظیم الشان ورکشاب کو رات اور دن رحمٰن ہی اپنی حفاظت اور نگرانی میں چلاتا ہے۔

سخت کام کے بعد آرام

دل ایک زندہ نظام کا مرکز ہے جس کے لئے کام کے بعد آرام ضروری ہے اس لئے اس کے زیادہ قریب ہو کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس کے آرام کی کیا صورت ہے دل دو قسم کی ضرب لگاتا ہے اور ہر ضرب کی آواز اور کام مختلف ہے اعصابی کشش اور دفع جس میں کشش بند ہو جاتی ہے اور خون دل کی طرف دوڑتا ہے تاکہ دوسری مرتبہ کشش پیدا ہو سکے۔ یہ چکر ایک سیکنڈ کے ۴/۱ حصہ میں پورا ہو جاتا ہے اور کشش کا وقفہ ایک سیکنڈ کا ۴/۳ حصہ ہوتا ہے اس طرح آرام کا وقفہ ایک سیکنڈ کا ۵/۴ رہتا ہے۔

دل کی ہر ضرب کے بعد آرام کا وقفہ کام کے وقت سے کچھ زیادہ ہوتا ہے مگر اس سے بھی زیادہ آرام کا وقفہ کشش خون کے وقت بھی ہوتا ہے۔ اس لئے کام کے چکر میں دو وقفے ہیں ایک کام کے بعد سکون کا وقفہ جو ذرا لمبا ہوتا ہے اور دوسرا وقفہ دفع کے بعد جو چھوٹا ہے دل کے ماہرین اس چھوٹے وقفہ کے بعد خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس طبعی سکون کے بغیر دل یقیناً ٹوٹ جائے گا دوسری وجہ کہ یہ چھوٹا وقفہ نہایت اہم ہے کہ اس عرصہ میں دل کے اعصاب کے اندر خون پھر سے بھر جاتا ہے۔ آرام اور سکون کے وقفہ کے دوران دل کو اس کی غذا پہنچانا ایک حیرت انگیز عجوبہ ہے یعنی اس سے پیشتر کہ دل دوبارہ اعصابی کشش کا کام شروع کرے وہ ایک لمحہ بھر آرام کر لیتا ہے یہی راز ہے کہ وہ اتنا عرصہ تک کام کرتا ہے۔

دل کا ایک اور عجیب کام

دوسری حیرت انگیز بات یہ ہے کہ دل اپنی ضربیں باقاعدہ رکھتا ہے یا اس کی یہ ضربیں اوزانِ شعری سے مشابہ ہیں نہ زیادہ تیز اور بے قاعدہ نہ زیادہ سُست دونوں قسم کی ضربیں اپنے مقررہ وقت کی سختی سے پابند رہتی ہیں ان میں سے کوئی بھی اپنی رفتار میں سست نہیں ہوتا اس سے ایک اور بھی سبق سارا کام رحمان کے ہاتھ میں ہونے کا ملتا ہے صفتِ رحمان جہاں ہر شئے کا بالحکمت ہونا ظاہر کرتی ہے وہاں اوقات کی پابندی کو بھی لازم کرتی ہے جو کفایتِ وقت، کفایتِ طاقت اور کفایتِ مکان و مادہ کے لئے نہایت ضروری ہے یعنی کفایتِ مادہ کے لحاظ سے دل کتنا چھوٹا سا عضو ہے کام اور طاقت کے لحاظ سے

کتنا عظیم الشان ہے اور کفایت وقت کے لحاظ سے اس کی حرکت اور اس کا سکون اور وقفہ کتنا باقاعدہ اور اندازہ کے اندر ہے کہ ایک حرکت سیکنڈ کا $\frac{۱}{۵}$ حصہ ہے تو دوسرا وقفہ ایک سیکنڈ کا $\frac{۳}{۵}$ اور تیسرا آرام کا وقفہ $\frac{۱}{۵}$ فی سیکنڈ ہے اس ساری باقاعدگی اور تاب و تواں کا ناظم اعلےٰ یقیناً انسانی شعور نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمان ہے اسی لئے فرمایا: قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ بتاؤ تو سہی رات اور دن رحمان کی طرف سے کون تمہاری حفاظت کرتا ہے کہ یہ سب کام باقاعدہ پُر حکمت طریق پر تمہارے اندر ہو رہا ہے جس میں تمہاری زندگی کی حفاظت ہے اگر یہ کہو کہ اس کا ناظم اعلیٰ دماغی شعور ہے تو یہ کام باقاعدہ رات کو بھی ہوتا رہتا ہے۔ جب تمہارا دماغی شعور نیند کے قبضہ میں جا کر اپنا احساس کھو بیٹھتا ہے اس میں شبہ نہیں دل بھی کسی کا تابع فرمان ہے البتہ دماغ یا اس کے اعلےٰ مراکزِ عقل اور جذبات کو اس میں کچھ دخل نہیں تاہم وہ اپنی مقررہ رفتار پر چلتا اور مراکزِ عقل کی پروا نہیں کرتا اور سچ تو یہ ہے کہ یہ تحت الشعور کا تابع فرمان ہے۔ دل کے اعصاب پر حکومت دو طرح کی ہے۔ اول وہ جو حکم دیتی ہے کہ آہستہ چلو یا محتاط رہو اور فوراً ضرب آہستہ ہو جاتی ہے اس کا صدر دفتر دماغ میں نہیں بلکہ اس بیضوی عضو میں ہے جو دماغِ زیریں کے عین نیچے ہے جس کا نام Medulla oblongata یا سرِ حرام مغز ہے اس لئے یہ فعل خود بخود یا طبعی ہے جب جسمانی احساسات فساد پذیر ہو جاتے ہیں تو یہی "روک لو" کا حکم دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ سارا کام جو دل کرتا ہے جس پر ہماری زندگی، ہماری صحت جسمانی اور حفظ و بقا کا انحصار ہے اس کی باگ ڈور مکمل طور پر رحمٰن کے ہاتھ میں ہے اور

قل من یکلؤکم باللیل والنہار من الرحمٰن کی مکمل تفسیر ہے انسانی جسم کی اس پُرحکمت مشینری پر اگر پوری کتاب لکھی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی صفتِ رحمانیت پر ایک ضخیم اور مدلل صحیفہ ہو سکتا ہے۔

وحی اور الہام فیضان رحمان ہے

اصطلاحِ اسلام میں وحی اور نبوت کو موہبت یا بخششِ الٰہی کہا جاتا ہے قرآن مجید نے اسے اللہ تعالیٰ کی صفت رحمان کا فیضان قرار دیا ہے جیسا کہ فرمایا اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۵۵ : ۱-۲) رحمان نے ہی قرآن سکھایا ہے تَنْزِیْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (۴۱ : ۲) یہ قرآن رحمان الرحیم کا اُتارا ہوا ہے۔ کافر کہتے ہیں۔ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ (۳۶ : ۱۵) رحمٰن نے کچھ بھی نہیں اتارا۔ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِمْ اٰیٰتُ الرَّحْمٰنِ (۱۹ : ۵۸) جب ان پر رحمان کی آیات پڑھی جاتی ہیں اِنَّ الشَّیْطَانَ کَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِیًّا (۱۹ : ۴۴) فی الحقیقت شیطان اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمان (وحی الٰہی) کا منکر ہے وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ (۴۳ : ۳۶) جو رحمان کے کلام (یا ذکر جو رحمان کی یاد دلاتا ہے) سے روگردانی کرتا ہے وحی اور نبوت کو صفتِ رحمان کا فیضان اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ کسی انسان کی اپنی کوشش اور غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا اور یا اس لئے کہ وہ کسی شخص کے اعمال کا معاوضہ اجر اور بدلہ نہیں بلکہ بغیر سعی عمل اللہ تعالےٰ جسے چاہتا ہے وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (۲ : ۱۰۵) اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت (نبوت) سے سرفراز فرماتا ہے۔ اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (۶ : ۱۲۵) اللہ تعالےٰ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کسے اپنی رسالت کا عہدہ عطا فرمائے۔ یا وحی اور نبوت اس

لئے عطاءِ رحمٰن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور دانائی انسان کی زبان میں گوندھ دی جاتی ہے کہ کسی بڑے سے بڑے فلاسفر اور حکیم کا کلام اپنی صحت وصفائی، لطافت طاقت اور افادہ کے لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وحی الٰہی چونکہ اولیاء اللہ سے مخصوص ہے اور ہر شخص اس کا مزہ خود نہیں اٹھا سکتا اس لئے عوام اس پر ایمان لانے کے لئے دلائل کے محتاج ہیں اور اس کا انکار کرنے والے کئی قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ وہ بھی جو سائینٹیفک علوم اور اکتسابی فنون کے عالم اور ماہر ہیں اور وہ بھی جو وجدانی کیفیات پر فوقیت حاصل ہے اس لئے سب سے پہلے انہی دلائل کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔

شہد کی مکھی کو وحی اور اس کے محیر العقول کارہائے نمایاں

قرآن مجید میں ایک سورۃ النحل (شہد کی مکھی) کے نام سے موسوم ہے اس میں فرمایا:۔

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۱۶: ۶۸-۶۹)۔

"اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ تو پہاڑوں، درختوں اور ان میں جو لوگ بناتے ہیں اپنے گھر بنا۔ پھر تمام پھلوں سے کھا اور اپنے رب کے

رستوں پر فرمانبرداری سے چلتی جا۔ ان (مکھیوں) کے
پیٹوں سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کی مختلف
اقسام ہیں اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے یقیناً اس
میں اس قوم کے لئے نشان یا دلائل ہیں جو فکر سے کام
لیتے ہیں۔"

قرآن مجید کی اکثر آیات کے پہلے حصہ کو اس کے آخری حصہ سے ربط ہوتا ہے۔ نیز آیت کے ترجمہ سے ظاہر ہے کہ یہ ایک عظیم الشان مضمون پر مشتمل ہے اسی لئے اسے اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ پر ختم کیا ہے۔ وہ جماعت اور گروہ جن کا کام ہر وقت غور و فکر کرنا ہوتا ہے انہیں شہد کی مکھی کی وحی پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ عربی زبان میں لفظ فکر اور تفکر کسی شئ معلوم پر اپنے علم کی روشنی ڈال کر اسے بار بار غور سے دیکھنا اور تامل کرنا ہے۔ یہ آپ جانتے ہیں کہ کسی امر پر علماءِ فن کو غور و فکر کی دعوت دینا اس کے اندر پوشیدہ اور چھپے ہوئے حقائق کو معلوم کرنے پر توجہ دلانا ہے۔ کوئی ذی علم اور ذی عقل شخص اپنی کسی بات پر غور کرنے کے لئے کہتا ہے تو وہ کوئی اہم عظیم الشان بات ہوتی ہے اور فکر کے ایک معنی تَرَدُّدُ الْخَاطِرِ بِالتَّاَمُّلِ وَالتَّدَبُّرِ لِطَلَبِ الْمَعَانِیْ ہیں کسی مقصد اور مطلب کی تلاش میں دل کو تامل اور تدبر کے ساتھ بار بار کسی امر پر لوٹانا ہیں پس اس آیت میں سب سے پہلی بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ علماء کی ایک مخصوص جماعت کو اس آیت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے توجہ دلا کر بتانا یہ چاہتا ہے کہ اس میں تمہاری نظر اور فکر کے لئے نہایت اعلیٰ درجہ کے

حقائق نہاں ہیں جو آیندہ چل کر ظاہر ہونے والے ہیں جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جائے گا وہ سب کے سب واشگاف ہوتے جائیں گے۔ علم ایک روشنی ہے اور روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی ترقی اور تیزی کے ساتھ ساتھ حقائق الاشیاء کو زیادہ سے زیادہ کھولتی اور ظاہر کرتی جاتی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ گلاب کا پھول جو سرخ رنگ کا ہے اگر اسے گہرے سبز رنگ یا تاریکی میں دیکھا جائے تو وہ ہمیں سرخ دکھائی نہیں دے گا اور اگر خالص سُرخ رنگ کی روشنی میں سفید پھول کو دیکھائے جائے تو وہ سرخ رنگ کا پھول نظر آئے گا۔ نظر کے یہ دھوکے علم کی بے عیب سفید اور تیز روشنی میں دُور ہو جاتے ہیں۔

غور اور فکر کرنے والی قوم

آیت میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ غور و فکر کی دعوت کسی ایک فرد کو نہیں دی گئی بلکہ ایک قوم یا گروہ کو دی گئی ہے گویا یہاں ایک ایسی جماعت سے خطاب ہے جن کا وظیفۂ عمل اور کام ہر بات کی تہہ تک پہنچنا اور اشیاء کا مشاہدہ کرنا ہے۔ جب بھی ان کے سامنے کوئی چیز آتی ہے ان کی عادت ہے کہ وہ اس پر ضرور غور کرتے ہیں۔ آیتِ بالا پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصولاً یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو خارجی اشیاء یا قدرتی چیزوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو انسانی روح کی نشو و نما کی فکر رکھتے ہیں مذہب کا اصل مقصد انسانی روح کی حفاظت اور روحانی زندگی کا تحفظ ہے۔ علم کی یہ دونوں لہریں یعنی دنیوی علوم یا ترقی اور روحانی قوتوں کا ارتقاء شروع دنیا سے چلی آئی ہیں ایک گروہ قانونِ قدرت کی تحقیق میں دل لگاتا چلا آیا ہے اور دوسرا شریعت کی پابندی اور دعا سے

قدرت خداوندی کا مشاہدہ کرتا رہا ہے۔ کسی وقت جہالت کے زمانہ میں یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے کے خلاف سمجھی جاتی تھیں۔ لیکن اسلام نے انسانی دل و دماغ کی ترقی کے لئے ان دونوں کا مطالعہ ضروری قرار دیا اس لئے قومٌ یتفکرون یا مفکر قوم سے مراد صرف وہی لوگ نہیں جو کلام الٰہی یا روحانیات میں شغف رکھتے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی جو شہد کی مکھی کے طریقۂ کار اور اس کے کام میں باریک در باریک حکمت اور محیر العقول عجائبات سے بھی بہرہ وافر حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً آرٹسٹ۔ انجینیر۔ ڈاکٹر۔ کیمسٹ۔ بایو لوجسٹ۔ سائیکولوجسٹ اور ماہرین سوشل سائنس وغیرہ وغیرہ سائینٹیفک علوم کے عالم پس قَوْمٌ یَتَفَکَّرُوْنَ میں اول تو وہ لوگ آتے ہیں جو مختلف شعبہ ہائے سائنس میں دسترس اور بہرہ وافر رکھتے ہیں مگر انہیں خدا کی ہستی۔ وحی الٰہی اور نبوت و رسالت کے من جانب اللہ ہونے یا محمد رسول اللہ کے کامل اور آخری نبی ہونے میں کچھ شکوک و شبہات ہیں یا قرآن مجید کو کلام الٰہی قبول کرنے میں تردّد ہے اگر وہ شہد کی مکھی کے شاہکار پر غور کریں تو انہیں دلائل اور نشانات کا سلسلہ نظر آئیگا ان کے علاوہ وہ لوگ۔ جو مذاہب اور روحانیات سے پوری پوری خبر رکھتے ہیں انہیں بھی مذہب اسلام کے کامل اور آخری مذہب ہونے کے دلائل ملیں گے۔

مفکّرین کو شہد کی مکھی کے کام پر غور اور فکر کرنیکی دعوت کیوں دی گئی؟

غور اور فکر کی صفت جیسا کہ اس کے لغوی معنوں سے ثابت ہے صرف انسان سے مخصوص ہے مفردات راغب میں لکھا ہے۔ اَلتَّفَکُّرُ

جَوْلَانُ تِلْكَ الْقُوَّةِ بِحَسْبِ نَظَرِ الْعَقْلِيِّ وَذَالِكَ لِلْاِنْسَانِ دُوْنَ الْحَيْوَانِ۔ "تفکر یعنی فکر کی قوت کا عقلی نظر کے مطابق دوڑانا ہے اور یہ صفت دیگر حیوانات کے سوا صرف انسان سے خاص ہے۔"

یعنی فکر اُس نظرِ عقلی کا نام ہے۔ جو انسان کے علاوہ کسی دوسرے حیوان میں پائی نہیں جاتی دِماغی ارتقاء کے لحاظ سے حیوانات کو دو جماعتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے وہ جانور جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی موجود ہے اور وہ جن میں یہ فقرات (ہڈیاں) موجود نہیں۔ ریڑھ کی ہڈی نہ رکھنے والے جانوروں کے دماغ میں غور اور فکر کا مادہ نہیں پایا جاتا لیکن ورٹبریٹ (Vertebrate) ریڑھ دار جانوروں میں کچھ نہ کچھ سمجھ ہوتی ہے تربیت سے نشو ونما دی جا سکتی ہے مکھی ان جانوروں میں سے ایک کیڑا ہے جس میں ریڑھ کی ہڈی اور غور و فکر کا مادہ موجود نہیں۔ قرآن مجید کا ایک مکھی کو پیش کر کے اس کے کام پر مختلف شعبوں کے سائنسدانوں کو غور و فکر کی دعوت دینا گویا اعلیٰ درجہ کے عقلا کو ایک فکر نہ کرنے یا بلا سوچے سمجھے کام کرنے والے کیڑے کے کام کی طرف توجہ دلانا عجیب صنعت استدلال ہے۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔ ہر شخص جانتا ہے اور اس کا ذاتی تجربہ بھی ہوگا کہ جو لوگ اپنے کاموں میں عقل اور فکر سے کام نہیں لیتے ان کے کام ناقص اور نکمے ہوتے ہیں بلکہ ایک سمجھدار انسان بھی جب اپنے کسی کام میں جلد بازی سے کام لے کر بلا سوچے سمجھے کوئی کام کر گزرتا ہے تو اس میں اکثر نادم اور شرمندہ ہوتا ہے اور کام بھی تکلیف دہ اور خراب ہوتا ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر کسی بے عقل اور بے سمجھ آدمی کی طرف کوئی اعلیٰ درجہ کا کام منسوب ہو تو ہم فوراً بول اٹھتے ہیں کہ یہ کام اس کا نہیں بلکہ کسی نے اس کے لئے

یہ کام کر دیا ہے یا کم از کم کرایا ہے۔ شہد کی مکھی کا کام ان تمام علماء سائنس کی مفکر جماعت کو دعوت دیتا ہے جو پیشہ کے لحاظ سے آرٹسٹ۔ انجینیر۔ اکانومیٹس۔ کیمسٹ۔ ڈاکٹر سوشل ورکرز۔ سٹیٹسمین فوڈ کنٹرولرز اور ڈائرکٹرز ان چیف کہلاتے ہیں یا آسمانی پادشاہت کے مبشر کہلاتے ہیں کہ وہ اس کے نظم کار اور محیر العقول دانش و بینش کا مطالعہ کریں کہ شہد کی مکھی اَن پڑھ اور اُمّی ہونے کے باوجود اپنے سیماء گویا سے علماء زمانہ کو کیا کیا علم سکھاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ریڑھ کی ہڈی نہ رکھنے والے جانوروں کو حیوانات کی ابتدائی اور ادنیٰ قسم سمجھا جاتا ہے۔ حیوانات کی اعلیٰ انواع میں دماغ دوسروں کی نسبت اِرتقاء پذیر ہوتا ہے۔ اور ان میں سے انسان کا دماغ سب سے زیادہ بلکہ ارتقاءِ دماغ کی آخری کڑی یعنی انتہائی بلندی پر ہے بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ کائناتِ عالم میں غور و فکر کے لحاظ سے انسانی دماغ کا مقابلہ دوسری کوئی نوع مخلوق نہیں کر سکتی۔ نسلِ انسانی میں بھی آگے بہت سے درجے ہیں ان میں مفکّرین کا درجہ سب پر فائق ہے انتہا درجہ کی مفکّر ہستیوں کو ایک نہایت ہی ادنیٰ مخلوق یعنی مکھی (جس میں غور و فکر کا کلیتہً فقدان ہے) کی صنعت پر فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ انسان کے سوا باقی حیوانات کے متعلق ایک قاعدہ کلیہ یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے کم ہیں مگر کرتے بہت کچھ ہیں۔ اس پیچیدہ اور مشکل امر کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری زبان، ہماری آنکھیں، کان اور ہمارے اندر کی ساری مشینری دل، معدہ، جگر اور اعصاب وغیرہ وغیرہ ہمارے علم کے بغیر اور ہماری دماغی قوتوں کا بیشتر حصّہ ہمارے غور و فکر سے بے نیاز ہو کر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے اور ایسے عجیب اور ما فوق الفہم طریق

پر کام کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر کام ہمارے لئے معمہ بنے ہوئے ہیں اور شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راز اور معمہ ہی بنے رہیں۔ شہد کی مکھی کا سارا کاروبار اور لائحہ عمل اس کے ذاتی ادراک اور فہم کے بغیر چل رہا ہے۔ قرآن مجید کے اس کے سارے لائحہ عمل کو اللہ تعالیٰ کی وحی قرار دیا ہے جیسا کہ فرمایا وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی اور اس وحی کو تین حصوں پر تقسیم کیا ہے اور علمائے سائنس کے تین گروہوں کو اس پر غور کرنے کی دعوت دی ہے۔ (۱) انجینیرز۔ آرٹسٹ۔ اکانومیٹس۔ (۲) میکینکس، سوشل ورکرز، سٹیٹس مین وغیرہ۔ (۳) فوڈ کنٹرولرز۔ کیمیٹس۔ ڈاکٹرز اور ڈائرکٹرز، بایولوجسٹس۔ زدولوجسٹس ہورٹیکلچرسٹس وغیرہ وغیرہ۔

کس خوبی اور دانائی کے ساتھ اپنے گھر کے لئے وہ جگہ کا انتخاب کرتی ہے جو ایک دوراندیش ٹاؤن پلینر اور ہیلتھ آفیسر کا کام ہے۔ اس چھوٹی سی بستی کے اندر بیوت یا گھروں کی تعمیر میں اکانومی آف سپیس اکانومی آف میٹر اور اکانومی آف ٹائم یعنی کفایت جگہ کفایت مادہ اور کفایت وقت کو کس طرح بدرجۂ غایت ملحوظ رکھا جاتا ہے یہ اعلیٰ درجہ کے قابل انجینیرز اکانومٹس آرٹسٹ اور میکینکس وغیرہ کا فن ہے۔ قوم اور بستی کے باشندوں اور مختلف افراد کی مخصوص ضروریات کو باحسن وجوہ مہیا کرنا یہ سوشل ورکرز۔ فوڈ کنٹرولرز۔ ڈائرکٹرز کے اعلےٰ فرائض ہیں۔ سردی اور گرمی، ہوا اور بارش کی تندی اور ریلے دشمنوں کے حملے سے حفاظت، دھوپ اور ہوا کی مناسب آمد و رفت کے اعتبار سے، قوم کے افراد کے اعداد و شمار کے لحاظ سے، صحت و صفائی

کے نقطہ نگاہ سے بچوں کے قدو قامت کے، ملکہ کے لئے بڑے بڑے خانے، کارندہ مکھیوں کے لئے ان کے جسم کے مطابق چھوٹے چھوٹے گھر، اور نکھٹوؤں کے لئے مناسب کواٹروں کی تعمیر، آمدورفت کے وقت کسی دوسرے کے کام میں مزاحمت نہ ہو اور نہ کسی کے انتظار میں دوسرے کو بیکار بیٹھنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قوم یا بستی کے بیسیوں آرام و آسائش کے جدید اصول جو انسان نے حال ہی میں دریافت کئے ہیں یعنی موسم کی سختی گرمی اور سردی برسات آندھی اور گرد و غبار سے بچاؤ کے لئے ایرکنڈیشنڈ اور جدید سے جدید طریقے استعمال کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں واشنگٹن کے ایک اخبار میں "انسان کے لئے قدرتی معلم" کے زیر عنوان ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"Man's things accepted as wonders of the modern world, such as air conditioning, underground railway systems and dehydrated foods, have been in use by *nature's engineers* for as long as 40 centuries. The honey bee, for example, has devised a system of air conditioning to control the temperature of its hive. In summer, well-organised bees flutter tirelessly. The air circulation maintains a pleasant atmosphere for breeding bees and removes excess moisture which would ferment the nectar."

"زمانہ حال کی انسانی ایجادات کو معجزہ تسلیم کیا گیا ہے۔ مثلاً سردی اور گرمی کی شدت میں گھر کے اندر کی ہوا کو معتدل اور خوشگوار رکھنا۔ زمین کے نیچے ریلوے کی آمدورفت اور خوراک کی نمی دور کر کے ان کو دیر تک محفوظ رکھنا۔ آج سے چالیس صدیاں پیشتر یہ

سب کچھ قدرتی انجینیر عمل میں لاتے رہے ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی اپنے چھتہ کی حرارت کو معتدل رکھنے کے لئے ایرکنڈیشن کا اصول عمل میں لاتی ہے۔ گرمیوں میں نہایت منضبط طریق پر مکھیاں لگاتار ہوا کو متحرک رکھتی ہیں اور ہوا کی پیہم حرکت سے ہونے والی نسل کے لئے خوشگوار فضا قائم رکھتی ہیں اور نمی کو جو قوام شہد میں تخمیر پیدا کر دے دور کرتی رہتی ہیں۔ جاڑے کے دنوں میں یہ بستی اپنے چھتہ کو گرم رکھنے کے لئے مرکز قائم کرتی ہے۔ تمام مکھیاں ملکہ کے گرد لپٹ جاتی ہیں جو مکھیاں باہر کی طرف ہوتی ہیں وہ باہم ایک دوسرے کو دبا کر ایک حفاظتی ڈھال بنا لیتی ہیں اور کارخانہ کے اندر کی مکھیاں حرارت پیدا کرتی ہیں اور باہر کی حفاظتی اور اندر کی حرارت پیدا کرنے والی مکھیاں اپنی اپنی جگہ بدلتی رہتی ہیں۔"

اور یہ سب امور " وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ " تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی، کے ماتحت سرانجام پاتے ہیں۔

اس کے بعد وحی کا دوسرا حصہ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ کے زیر ہدایت پھولوں اور پھلوں کا انتخاب، ان کے اندر سے مفید مطلب رس جمع کرنے، محفوظ کرنے، اور تبخیر رس موسم کے مطابق دور دور سے خوشبو اور پھلوں کا نچوڑ، سورج کی شعاعوں کو اس رس میں قید کرنے پانی ہوا نمک، وٹامنز کا انتخاب اور چار قسم کا راشن الگ الگ عمر طاقت اور کام کے لحاظ سے بچوں۔ نکھٹوؤں۔ ملکہ اور کارندوں کے لئے چھانٹ کر

لانا وغیرہ وغیرہ سے متعلق ہے۔

وحی کا تیسرا حصہ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا جس کے ماتحت بعض ایسے قوانین پر چلنا ہے جس کے اندر کام میں کسی جگہ سستی، بیکاری، گداگری، نافرمانی، کھانے پینے میں کمی بیشی، اسراف، حق تلفی، ظلم، بے اتفاقی لڑائی جھگڑا، راشن حاصل کرنے میں دھکا مکا اور بے جا قتل و مقاتلہ نظر نہیں آتا۔ ہر فرد کو اپنے فرض کا احساس ہے دشمنوں کی مدافعت کے لئے محافظ دستے (باڈی گارڈ) ہر وقت پہرہ پر حاضر۔

اس سے پیشتر کہ ہم 'شہد کی مکھی کو وحی' کے حصہ سوم پر جو ایک نہایت ہی اہم حصہ ہے غور اور فکر کریں سر دست مذکورہ بالا دونوں حصص وحی پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔

شہد کی مکھی کی وحی کا جز اوّل

اس حصہ وحی میں گھر کے لئے (۱) جگہ کا انتخاب (۲) اس کی پر حکمت تعمیر (۳) آرام و آسائش (۴) امن و صحت کے اصول (۵) اس کا استحکام (۶) اور آبادی کے لحاظ سے وسعت اور کفایت سبھی کچھ آجاتا ہے۔ فرمایا تیرے رَبّ نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی یا رمز اور اشارہ سے اُسے بتایا اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ اتخاذ اور انتخاذ کسی کو چُن لینے اور کسی وجہ اور حکمت سے کسی امر کو انتخاب کرنے یا اختیار کرکے بنا لینے کے معنوں میں آتا ہے۔ پہاڑوں میں درختوں میں اور لکڑی کے بکسوں میں ہر جگہ مکھی اپنا گھر نہیں بناتی، بلکہ بلندی پر۔ محفوظ جگہ پر۔ دشمنوں کی کثرت سے بچ کر، ہوا کی تیزی کے رُخ کو بدل کر۔ تیز رو۔ پانی اور شور و غل کی جگہ سے دُور۔ بدبودار جگہ

کو چھوڑ کر، سورج کی روشنی اور حرارت سے مناسب طور پر مستفید ہونے کا لحاظ رکھ کر وہ اپنا گھر بناتی ہے۔ پہاڑوں میں درختوں میں وہ جگہیں انہیں پسند ہیں جہاں سورج کی شعاعیں پتوں سے چھن کر ان کے چھتہ تک پہنچیں۔ اس کے اندر رنگوں کی حس بہت زیادہ ہے کسی قدر روشن گلابی، کھلا ہوا زرد، اور سب سے زیادہ نیلگوں رنگ انہیں بہت پسند ہے۔ لکڑی کے بکسوں کے رنگ یہی ہونے چاہئیں۔ جگہ کے انتخاب میں سب سے آخری اور سب سے ضروری امر یہ ہے کہ کھانے پینے اور مکان کی تعمیر کا سامان زیادہ فاصلہ پر نہ ہو وہی شہر زیادہ آباد ہوتے ہیں جن کے نزدیک سامانِ خورد و نوش کی قلت نہ ہو ورنہ اس کے فقدان میں آباد شہر بھی برباد اور ویران ہو جاتے ہیں۔ شہد کی مکھی سریع السیر ہونے کے باوجود اسی جگہ پر اپنا گھر بناتی ہے جہاں پھول اور پھل آسانی سے میسر آسکیں۔ رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔ (۱۴: ۳۷)

کوئی شہر پولیس کی نگرانی اور ان کی مناسب جگہ پر چوکیوں کے بغیر چوروں، ڈاکوؤں کی دیکھ بھال سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بالعموم نیچر میں یہ پولیس دو قسم کی ہوتی ہے ایک سویلین اور دوسری ملٹری طرز کی۔ چھتہ کے اندر محافظ دستے سویلین فرائض ادا کرتے ہیں۔ مگر باہر کی حفاظت کا کام بالعموم دوسرے جانوروں سے لیا جاتا ہے۔ مہذب اور ترقی یافتہ شہروں میں بعض کمپنیاں چوروں اور ڈاکوؤں سے مکان کی حفاظت

کا بیمہ کرتی ہیں اور ایک معمولی سی رقم ماہانہ لے کر خانگی سامان چوروں سے بچانے کے طریق بتاتی اور اگر چوری ہو جائے تو اس کا پورا پورا معاوضہ ادا کرتی ہیں مگر نیچر میں بعض چھوٹے چھوٹے پرندے جو درختوں پر اپنے گھر بناتے ہیں یا ان کی شاخوں سے عجیب و غریب گھر لٹکاتے ہیں ایک تو وہ دُور تک نیچے لٹکے ہوئے ہونے کی وجہ سے جنگلی بلّیوں سے جو ان کی دشمن ہوتی ہیں محفوظ رہتے ہیں اس کے علاوہ ایک اور انتہائی حکمت و دانائی ان گھروں کے متعلق یہ ہے کہ یہ گھر ایسی شاخوں سے لٹکائے جاتے ہیں کہ جن کے بڑے تنہ کے اوپر بھڑوں یا بڑے زنبور کا چھتہ ہوتا ہے تاکہ دشمن کو اُن کے گھر تک پہنچنے سے پہلے ان خطرناک زنبوروں سے مقابلہ پیش آئے۔ شہد کی مکھی بھی جنگل میں اپنے چھتہ کی دشمنوں سے حفاظت کے لئے بالعموم اس قسم کی تدابیر کام میں لاتی ہے۔

گھروں کی پُرحکمت تعمیر

جگہ کے موزوں اور دانشمندانہ انتخاب کے بعد گھروں کی پُرحکمت تعمیر بھی قابلِ ملاحظہ ہے جس میں سب سے پہلی چیز بنیاد کی مضبوطی ہے۔ انسان کا تیار کردہ گھر بہت سے دوسرے جانوروں کے گھروں کی طرح زمین سے اُوپر کی طرف اٹھتا اور بلند ہوتا جاتا ہے شہد کی مکھیوں کا گھر اوپر کی طرف سے نیچے کی طرف لڑھکایا جاتا ہے انسانی گھر کی زمین پر بنا ہونے کی وجہ سے یہ بنانے والے کے لئے آسانی دیتا ہے مگر اوپر نیچے کی طرف لڑھکنے والا گھر بنانے والے کے لئے بہت سی مشکلات کا موجب ہوتا ہے۔ جس طرح ایک ہوشیار انجینیر گھر کی لمبائی چوڑائی اور دیواروں کی موٹائی (اُسار) کو دیکھ کر اس پر چھت کے وزن کا تناسب نکالتا ہے ورنہ

چھت کے نیچے آرہنے کا اندیشہ رہتا ہے یا دیوار کا وزن مدنظر رکھ کر بنیاد کی مضبوطی کی جاتی ہے۔ اسی طرح شہد کے چھتہ کا وزن۔ آندھی ہوا کے جھکولے بارش کے ریلے اور ان کی قوت کے لحاظ سے درخت کی کافی موٹی شاخ اور اس کے ساتھ چھتہ لٹکانے کے لئے ایک مضبوط جوڑ کی ضرورت ہوتی ہے اس جوڑ کو یا اس گھر کی اُلٹی بنیاد کو کس مصالحے سے مضبوط کیا جائے۔ بنیاد کتنی چوڑی ہو اور لمبی ہو۔ یہ سب باتیں گویا گھر کی بناء مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہوتی ہیں اور یہ سب حکمتیں اور دانائیاں مکھی جیسی کمزور اور ننھی سی مخلوق کے لئے اللہ تعالےٰ کی طرف سے وحی ہونے کے بغیر ناممکن ہیں۔ گھر کے لئے صالح ماحول اور موزوں جگہ کے انتخاب کے بعد گھر کی حفاظت اور آرام و آسائش کا سوال سامنے آتا ہے لیکن اس سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ گھر کیا چیز ہے؟ یا وہ زندگی کی کونسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔ اس کے جواب متعدد اور مختلف ہوسکتے ہیں۔ گھر بنانے کی قابلیت (انسٹنکٹ) کے لحاظ سے تمام حیوانات کو گھر بنانے والے اور گھر نہ بنانے والے جانوروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے گھر بنانے والے جانوروں کو بہرحال فضیلت حاصل ہے۔ اس کے بعد سیدھے سادھے گھر یعنی زمین کھود کر بل بنانے والے اور مٹی کے اُونچے اُونچے گھروندے بنانے والوں کی قسم آتی ہے اور سب سے عمدہ ڈایزائن اور اعلےٰ صنعت کے نمونے پیش کرنے والے جانوروں کو ان سب پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک اور تقسیم کے اعتبار سے ضروریاتِ زندگی کو مدّ نظر رکھ کر گھر بنانے والوں، دشمنوں سے حفاظت کے لئے صرف اپنے جوڑے کے لئے اور پوری قوم کی آبادی کے لئے نقشہ تیار

کرنے والوں کو ترتیب وار فضیلت حاصل ہے اس کے بعد اپنے ذاتی فائدہ اور آرام کے لئے گھر بنانے والوں اور اپنی ضروریات کے علاوہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے کارخانہ تیار کرنے والوں کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ مختلف جانوروں کے گھروں کی اس نمائش میں تفوق، امتیاز اور ارتقاء کے تمام درجے شہد کی مکھی کے گھر کو حاصل ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اور سب جانوروں کے گھر بنانے کی وحی اور انسٹنکٹ کا ذکر نہ کر کے صرف شہد کی مکھی کی وحی اور گھر بنانے کی اہلیت کا ذکر کیا ہے۔

ایک اور خوبی کے لحاظ سے غور کیا جائے تو تمام جانور کسی نہ کسی اعتبار سے انسان کے لئے مفید ہیں مثلاً گھوڑا، اونٹ ہاتھی وغیرہ سواری کے کام آتے ہیں۔ گائے۔ بھینس۔ بکری، اونٹنی وغیرہ دودھ دیتی ہیں۔ کتا وفادار چوکیدار ہے بعض جانور کھانے کے کام بھی آتے ہیں مگر ان میں سے اکثر جانور اپنی خدمت کا معاوضہ کھانا اور مکان وغیرہ کی صورت میں طلب کرتے ہیں لیکن "اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہ" میری خدمت کا اجر مجھے میرا اللہ دے گا اس کا مصداق شہد کی مکھی ہے۔ پہاڑوں میں درختوں میں آبادیوں سے دور جنگلوں میں اپنا گھر بناتی ہے نہ مکان طلب کرتی ہے اور نہ تمہارے کھانے کی محتاج ہے۔ ہاں اگر اپنے آرام اور فائدہ کی خاطر اسے پالنا چاہو تو تمہارے بنائے ہوئے بکسوں میں بھی اسے شہد جمع کر دینے میں کوئی عذر نہیں۔ وہ شہد جو تمہارے چھوٹے بچوں، جوانوں، بوڑھوں تندرست اور بیماروں کے کھانے اور ٹوسٹ پر لگانے کے کام آتا ہے ایک ننھی سی مخلوق کی یہ ساری محنت "دو اور لو" (Give and take) کے اصول پر نہیں بلکہ خدمت

بلا معاوضہ اور نسلِ انسانی پر احسانِ بے مزد ہے جو خود غرض اور لالچی انسان کو ایک اعلےٰ درجہ کا سبق دیتی ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ (۶ : ۹۰)

شہد کی مکھی کو وحی کا دوسرا حصّہ
کسی کو نقصان نہ پہنچا کر استفادہ کرنا اور فائدہ پہنچانا ہے

گھروں کی تعمیر کا حکم دینے کے بعد فرمایا ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ تمام پھلوں کو استعمال میں لا۔ اور یہ اس کی پیدائش کی دوسری غرض وغایت کو پورا کرتا ہے بلاشبہ قدرت کی ہر شئے کا ایک طبعی میلان ہے لیکن ناشگفتہ کلیوں کا منہ کھولنے کے لئے نسیم سحر کے جھونکے بھی ضروری ہیں۔ نسیم سحر کو کلیوں کے ساتھ عشق ہے اور کلیوں کو نسیم سحر کے ساتھ پیار۔ اس لئے کلیاں بھی اس سے مل کر مسکرا دیتی ہیں ؎

ازاں حسنِ روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

مکھیاں موسم بہار کی ابتداء میں جاگ اٹھتی ہیں اور ادھر پھول بھی جوش شباب سے جھومنے لگتے ہیں۔ مکھیاں اپنا کام نہایت تندہی اور محنت سے شروع کر دیتی ہیں۔ سب سے پہلے جتھا بنانا اور اس کے بعد نئی ملکہ کے ساتھ پرانا شہر چھوڑ کر اڑ جانا اور پھر نئے شہر کی بنا ڈالنا۔ ان کا سال بالعموم مارچ سے شروع ہوتا ہے اور اوائل سرما تک رہتا ہے۔ ابتداء سال میں عالم نباتات کی حسین ترین تخلیق (پھول) مکھیوں تک اپنا پیغام محبت اور سندیسۂ عشق بھیجتی ہے۔ قدرت نے پھولوں کو رنگ اور خوشبو بخشی ہے

اور انہیں مکھیوں کے لئے جنوں خیز مسحور کن حُسن دیا ہے اور مکھیوں کو گودیں لینے۔ رس چوسنے اور زرِ گُل لوٹنے کے لئے موزوں جسم دیا ہے۔ کم و بیش دس ہزار قسم کے پھُول مکھیوں کی خاطر جوشِ شباب سے بھر دیئے گئے ہیں دونوں کے عشق کا یہ حال ہے کہ اگر مکھیاں پھولوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں تو پھول بھی مکھیوں کے بغیر کھل نہیں سکتے۔ مارچ میں جب فضا پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھتی ہے تو دُور دُور سے مکھیاں دیوانہ وار ان کی طرف پرواز کرتی ہیں۔ درختوں کے اوپر خوشی کا ایک نغمہ ہوتا ہے اور مکھیاں پھُولوں سے ہم آغوش ہوتی ہیں ان کی شیرینی سے لُطف اندوز ہوتی ہیں بعض اوقات وہ زرِ گُل کی خاطر پھول کے اندر تک اُتر جاتی ہیں اور باہر آنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے کون جانتا ہے کہ اس تنہائی اور راز کے لمحوں میں دونوں کس قسم کے پیار اور محبت کا تبادلہ کرتے ہیں لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ شہد کی مکھی پھولوں کے ساتھ عشق میں وفادار ترین عاشق ہے بھونرے، تیتریاں، بلبلیں اور انسان پھولوں کے سبھی عاشق ہیں مگر شہد کی مکھیاں ایک وقت میں ایک ہی قسم کے پھولوں سے پیار کرتی ہیں اور ان کا پیار سب سے انوکھا پیار ہے کہ وہ پھولوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتیں۔ بھونرے، تیتریاں ایک ہی وقت مختلف قسم کے پھولوں پر گھومتے ہیں بلبلیں اپنی چونچوں سے پھولوں کی پتیاں بکھیرتی ہیں اور انسان پھولوں کو توڑتے اور برباد کرتے ہیں۔ لیکن شہد کی مکھی ایک ہی قسم کے پھولوں سے رس چوسنے کے علاوہ پودوں کے نر و مادہ کے بیج کو ملاتی اور انہیں بارور کرتی ہیں۔ پس یہ مکھیاں نہ صرف اپنے

فائدہ کے لئے پھولوں کا رس چوستی اور زرِ گل جمع کرتی ہیں بلکہ پودوں کو فائدہ اور نفع اور بقاء نوع اور حیات دائمی کا انعام بھی دیتی ہیں۔ پس پھولوں کے ساتھ بھونروں۔ تیتریوں۔ بلبلوں اور انسانوں کی محبت اپنی غرض کی محبت ہے لیکن مکھیوں کا عشق عشقِ صادق کہلانے کا مستحق ہے ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ یہ ایک عجیب نکتہ ہے کہ پھولوں اور پھلوں کی خوشبو اور ہر ایک وہ کیمیائی جوہر لوہا، تانبا، وٹامنز، مینگنیز وغیرہ وغیرہ جو زمین سے ان پھولوں اور پھلوں میں آتے ہیں ان کو لے جانے پر بھی نہ پھول کو نقصان پہنچتا ہے اور نہ پھل کو۔ دُنیا کا کوئی بڑے سے بڑا کیمسٹ پھولوں اور پھلوں کو نقصان پہنچائے بغیر ان کا شربت تیار نہیں کرسکتا۔

وحی الٰہی کا تیسرا حصہ

رشتہ در گردنم افگندہ دوست : وحی الٰہی کا تیسرا حصہ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا "اور اپنے رب کی راہوں پر نہایت فرمانبردار ہو کر چلتی جا" فَاسْلُكِي میں "فا" تعقیب کا ہونا ضروری نہیں گھروں کی تعمیر اور پھولوں پھلوں سے استفادہ سب میں مکھی رب کی راہوں پر فرمانبردار ہو کر چلتی ہے اور اس کے بعد بھی تمام کاموں میں اس کا شغف وحیِ الٰہی کی کامل فرمانبرداری ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گھر بنانے کی انسٹنکٹ دراصل امومت (مادری محبت) کا کرشمہ ہے جس کی نسبت یہ کہا گیا ہے کہ وہ دنیا کی ساری محبتوں سے زیادہ بھاری اور قیمتی یعنی دنیا کے تمام عشاق کی محبت کو اگر میزان کے ایک پلڑے میں اور ماں کی محبت جو

اپنے بچوں سے ہوتی ہے اسے دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو مادری محبت والا پلڑا جھک جائے گا۔ جانوروں میں ماں ہی تنکا تنکا جمع کے ان کو ایک خاص ترتیب سے باہم سمو کر انڈے دینے سے پہلے گھر بناتی ہے پس گھر درحقیقت اولاد کی محبت کا جنونِ کار ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کا مُظہر ہے یہ ہے گھر کا فلسفہ۔ اب اس کے بعد گھر کی تعمیر اس خوبصورتی اور دلکشی کا سوال ہے گھر مٹی۔ تنکوں، لکڑی، چمڑہ اینٹ پتھر، بجری وغیرہ سے بنائے جاتے ہیں اپنی مضبوطی اور فائدہ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں شہد کی مکھی کا گھر باوجود ہلکا ہونے کے آندھی بارش اور حد سے زیادہ گرمی کا خُوب مقابلہ کرتا ہے۔ دیواروں کے پتلا ہونے کے باوجود اس میں مصالحہ چونکہ موم کا استعمال ہوتا ہے اس لئے پانی اس میں اثر نہیں کرتا یہ مصالحہ مکھیاں خود شہد کو اپنے منہ کی گرمی پہنچا پہنچا کر پختہ کرتی ہیں اگر کسی فرم کے لئے یہ امر قابلِ فخر ہے کہ اس کا کارخانہ سو سال سے برابر قائم ہے اور اس کا تیار کردہ عمارتی مصالحہ سو سال سے برابر اعلیٰ درجہ کی عمارتوں میں استعمال ہوتا چلا آتا ہے اس میں آج تک کوئی نقص نہیں پایا گیا کہ جس کی وجہ سے اس میں ترمیم یا اس کی تنسیخ کی ضرورت پیش آئی ہو۔ تو شہد کی مکھیوں کا یہ لاکھوں برس کا معمول ہے ان کے گھروں کے لئے موم نہایت موزوں اور سائنٹیفک مصالحہ ہے قدرت کی اس ننھی سی مخلوق کے گھروں کی تعمیر کے لئے اس مصالحہ (موم) کے استعمال کی قدر و قیمت ہمیں بتاتی ہے کہ یہ مصالحہ خود اس کی بُود و باش، صحت و سلامتی۔ مادہ اور مکان کی کفایت وقت کی بچت محنت کی

قلت اور آیندہ آنے والی نسل کی فلاح و بہبود اور مکان کی مجموعی افادی قیمت کے لحاظ سے ہرگز گراں نہیں بلکہ مکان کی غرض و غایت کما حقہٗ پوری کرنے اور لاگت سے کئی گنا زیادہ فائدہ اور آرام پہنچانے کے بعد بالکل بوسیدہ اور ویران ہوجانے پر بھی دوسروں کے تاریک گھروں کو روشنی اور نور بخشنے کی تاثیر رکھتا ہے اور انسانی روگوں میں کام آتا ہے۔ مکھیوں کا یہ کارنامہ ایک مومن کی زندگی کے ساتھ پوری مماثلت رکھتا ہے کہ وہ جیتا ہے تو دوسروں کے آرام کی خاطر جیتا ہے مگر مرنے پر بھی اس کا فیضان ختم نہیں ہوجاتا بلکہ وہ اپنے نیک اعمال اور الٰہی احکامات کی اطاعت اور کامل فرمانبرداری کی ایک ایسی یادگار چھوڑتا ہے جو صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ[1] یا فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا کی عملی تفسیر ہوتی ہے اور اس کی موت کے بعد آنے والی نسلوں کو زندگی اور نور بخشتی ہے۔

شہد کی مکھی کا گھر اپنی بناوٹ اور خوبصورتی کے لحاظ سے ایک مکمل گھر ہے گھر کے مصالحہ کی افادی حیثیت پر بحث کرنے کے بعد گھر کا نقشہ قابلِ غور ہے ایک عقلمند اور عالم نقشہ نویس جب کسی گھر کا نقشہ تیار کرتا ہے تو اس میں سکونت اختیار کرنے والوں کی ضروریات کے علاوہ جگہ کی کفایت کو بھی مدنظر رکھتا ہے ایک شہر کا پلان تیار کرنے والوں کو اپنے نقشہ میں بے شمار ضروریات کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے اور سب سے بڑھ کر صحت و صفائی کو ذہن میں رکھا جاتا ہے مضمون چونکہ طویل ہوتا جاتا ہے اس لئے اختصار سے لکھا جاتا ہے کہ شہد کی مکھی کے مکانوں کو غور سے دیکھو تو ان کی شکل نہ مربع ہے نہ مستطیل اور نہ گول جو نسبتاً آسان اشکال ہیں ان کے تمام خانے شش پہلو ہوتے ہیں

[1] ۱:۶

خانوں کی مضبوطی کے لحاظ سے گول کمرہ سب سے مضبوط کمرہ ہوتا ہے اگر چھت کے تمام کمرے گول ہوتے تو ظاہر ہے کہ کمروں کی دیواریں باہم مشترک نہ ہو سکتی تھیں اور خانوں کے باہر جگہ ضائع ہو جاتی اور محنت زیادہ کرنی پڑتی مگر شش پہلو کمرے بنانے میں دو فائدے ہیں ایک تو تمام خانوں کی دیواریں باہم مشترک ہوں گی اور دگنی محنت نہ کرنی پڑے گی دوسرے خانوں کے درمیان جگہ ضائع نہ ہوگی۔ ہر ایک انجینیر جانتا ہے کہ کسی عمارت کی تعمیر میں جگہ۔ مصالحہ اور محنت تین قسم کی کفایت مدنظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

مربع اور مستطیل خانے بنانے میں چوکور خانوں میں گول بچوں کی ناموزوں مثل صادق آتی اور گول خانوں کے بالمقابل کہ جن میں باہر کی جگہ ضائع جاتی ہے مربع اور مستطیل کے اندر کی جگہ فالتو بچ جاتی ہے پس شش پہلو خانے آسانی سے صفائی کے لحاظ سے مضبوطی کے اعتبار سے اور بچوں کے آرام سے پرورش پانے کے لحاظ سے جگہ کی کفایت کو مدنظر رکھ کر محنت اور مصالحہ کے کم خرچ ہونے کی وجہ سے دیواروں کے اشتراک سے فائدہ اٹھانے کے لئے عقل و دانائی اور کمال صنعت کا نمونہ پیش کرتے ہیں یہ ہے اس دانا اور چابکدست نحلی مکھی کا فنِ انجینیری اور حفظانِ صحت میں کمال۔ ہر شخص جسے مشینری کے علم سے کچھ واقفیت ہے وہ جانتا ہے کہ کسی پرزے کی گول حرکت نہایت سہل حرکت ہے مربع اور مستطیل حرکت بھی مشکل نہیں لیکن کسی شکل کا شش پہلو بنانا بغیر کسی پیمائش کے آلہ کی مدد کے بنانا اور پھر تار یکی میں ان کو متوازی بنانا وحی الٰہی کے اشارہ کے بغیر ناممکن امر ہے کہتے ہیں لندن میں آرٹ کی نمائش کے موقعہ پر ایک بنگالی کا یہ کمال نہایت حیرت انگیز سمجھا گیا کہ اس نے پنسل

اٹھا کر ایک کاغذ پر تین دائرے بغیر پرکار کی مدد کے بلا تکلف بنا دیئے جو پرکار کی رُو سے نہایت صحیح اور تینوں برابر تھے۔ لیکن بنگالی آرٹسٹ کے منہ میں اگر پنسل دیدی جائے اور روشنی گل کر کے کہا جائے کہ ایسے چھوٹے چھوٹے شش پہلو دائرے بنا کر دکھاؤ جیسے مکھی بناتی ہے تو یہ امر قطعاً محال ہوگا اور بغیر مدتوں کی مشق کے ناممکن ہوگا لیکن مشق تم جانتے ہو ایک عقلمند کا کسی فن میں ماہر ہونے کے لئے ضیاعِ وقت کا دوسرا نام ہے لیکن فطری الہام اللہ تعالیٰ کی وحی کا وہ اشارہ ہے جس میں غور و فکر اور مشق و مہارت میں ضیاع وقت کی ضرورت نہیں جس طرح تم مقناطیسی سوئی کے اندر قطب ستارہ کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ شہد کی مکھی کو دیکھ کر اس خفیہ پیغام اور وحی کو پڑھ سکتے ہو جو یزدانی انگلیوں نے اس میں لکھ رکھی ہے۔ مقناطیسی سوئی کو مشق اور تعلیم کی ضرورت نہیں کہ وہ قطب شمالی کی طرف منہ کرے۔ دونوں کو آزاد چھوڑ دو سوئی اپنی مقسومہ وحی سے قطب کی طرف راہنمائی کرے گی اور شہد کی مکھی بغیر پیمانہ اور پیمائش کے شش پہلو خانے بناتی جائے گی مگر تم اپنی قیمتی زندگی کے کئی سال ضائع کرنے پر بھی شاید اس میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔

سول انجینئرنگ میں شہد کی مکھی کا کمال

یہ بتایا جا چکا ہے کہ شہد کی مکھی کے چھتہ کے بیوت (خانے) شش (چھ) پہلو ہوتے ہیں ہر شخص یہ جانتا ہے کہ چھ کا عدد ایک معین عدد ہے۔ ہندسے ایک سے دس تک اپنا ایک خاص مفہوم رکھتے ہیں ایک سے مراد اکائی ہے دو سے مراد دو اکائیاں اور تین سے مراد تین اکائیاں ہیں اس طرح شمار کرنے کا نام مسلسل گنتی

(Series meaning) ہے اس میں چھ سے مراد ہوگا پانچ پر ایک زیادہ اور سات سے ایک کم گویا مسلسل گنتی میں یہ پانچ اور سات کا درمیانی عدد ہے۔

(۲) چھ میں چھ اکائیاں ہیں اس کے مجموعی معنی (Collective meaning) خاص ہیں جو چھ کو باقی تمام ہندسوں سے متمیز کر دیتا ہے۔

(۳) دو ایک کا دُگنا ہے اور تین ایک کا تین گنا ہے اور چھ ایک کا چھ گنا ہے یہ نسبتی معانی ہیں (Ratio meaning)

(۴) کوئی خاص عدد کسی سے چھوٹا ہوگا اور کسی سے بڑا اس کی رُو سے چھ تین چار پانچ سے بڑا ہوگا اور سات آٹھ سے چھوٹا ہوگا وہ تین کا دگنا اور دو کا تین گنا اور آٹھ سے دو کم ہے اس میں چار ملا دیں تو دس ہو جاتا ہے چار کم کر دیں تو دورہ جاتا ہے۔

(۵) چھ کا عدد بارہ کا نصف ہے یعنی ۱۲ کو دو پر تقسیم کیا جائے تو حاصل تقسیم چھ ہوگا۔ مندرجہ بالا قاعدے جمع کی بناء پر چھ کا مفہوم، تفریق کی بناء پر چھ کے معنی، اور ضرب کے اعتبار سے چھ کا مطلب، اور تقسیم کے لحاظ سے چھ کا مقسوم متعین اور مقرر کرتے ہیں۔

(۶) فلسفہ کی اصطلاح میں عدد کی تعریف یہ ہے کہ وہ اپنے حاشیتین کے مجموعہ کا نصف (½) ہوتا ہے۔ چھ کا ایک حاشیہ پانچ ہے اور دوسرا حاشیہ سات ہے یعنی چھ کے ایک طرف پانچ کا عدد ہے اور دوسری طرف سات کا عدد ہے پانچ اور سات کا مجموعہ بارہ ہوگا اور ۱۲ کا نصف چھ ہے (آپ کوئی سا عدد بھی فرض کریں پھر اس کے بعد دونوں اس کے حاشیے جمع کریں اور اسے دو پر تقسیم کریں

تو حاصل قسمت آپ کا فرض کردہ عدد ہوگا۔

پس وہ شخص جو دس تک گننا جانتا ہے اسے چھ کے دو کنارے یعنی پانچ اور سات ضرور معلوم ہونے چاہئیں اگر کوئی چھ پہلو والی شکل یا خانے بناتا ہے اور کبھی تین چار یا پانچ نہیں بناتا اور نہ بھول کر کبھی سات پہلو بناتا ہے تو بظاہر یہ ثابت ہوگا کہ وہ سوچ بچار اور غور و فکر کا مادہ رکھتا ہے اور چھ کے حاشیتین کو خوب پہچانتا ہے اگر آپ کی جیب میں دس روپیہ ہوں اور آپ کو یہ کہا جائے کہ اس میں سے چھ نکالدو اور آپ چھ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں نہ پانچ نکالیں اور نہ سات تو یہ امر آپ کی علم حساب سے واقفیت کی دلیل ہوگا۔ ہماری گنتی ایک سے شروع ہوتی ہے ایک دو تین چار پانچ چھ اور سات کی مسلسل گنتی مہذب قوموں کی گنتی کہلاتی ہے ورنہ افریقہ کے حبشی لوگ تین کے آگے بے شمار کہہ کر گنتی ختم کر دیتے ہیں اب یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ انسان کے سوا کوئی جانور ریاضی اور مذہب کی حس نہیں رکھتا۔ بلّی کُتّیا اور مرغی اپنے اپنے بچوں کو الگ الگ جانتی اور پہچانتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ ۱+۱ برابر ہے ۲ کے۔ وہ ہر بچہ کو الگ الگ جانتی ہیں لیکن اِن کی مجموعی تعداد سے ناواقف محض رہتی ہیں۔ شہد کی مکھی کا شش پہلو خانے بنانا بغیر یہ جاننے کے کہ چھ کیا عدد اور چیز ہے یہ اس کی طرف وحی الٰہی کی مضبوط دلیل ہے۔

اس کے بعد دلیل نمبر دوم بھی قابلِ غور ہے جمع اور تفریق کا قاعدہ ایک دوسرے کی ضد ہے اور ضرب اور تقسیم ایک دوسرے کی۔ جانوروں میں اگر جمع کا احساس نہیں پایا جاتا تو تفریق کا بھی نہیں

ہو سکتا اور نہ ضرب اور تقسیم کا لیکن شہد کی مکھی کے چھتہ میں جسے عربی میں نَحَارِیْبُ النَّحْل [1] نام دیا گیا ہے اس میں جمع اور تفریق کے دونوں قاعدے موجود ہیں۔ یہ جُدا امر ہے کہ مکھی کو یہ علم بالکل نہیں کہ جمع کیا ہے اور تفریق کسے کہتے ہیں ہمیں تعجب اس بات پر ہوگا کہ ایک لڑکا نہ یہ جانتا ہے کہ جمع کیا ہے اور نہ اس نے تفریق کا کبھی نام سنا ہے لیکن وہ جمع اور تفریق کے سوال ہمیشہ صحیح نکالتا ہے اور کبھی بھول کر بھی غلطی نہیں کرتا (اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اب جمع تفریق اور ضرب اور تقسیم کے سوال حل کرنے والی مشینیں بھی بن گئی ہیں اور وہ انسان کے بالمقابل صحت سے حساب بتاتی ہیں لیکن وہ بنائی ہوئی انسان کی ہیں جو حساب کا علم رکھتا ہے اور وہ سوال کا جواب نکالنے میں بھی انسان کی محتاج ہیں) شہد کی مکھی جمع اور تفریق کا وقوف اور شعور نہ رکھنے پر بھی غیر شعوری طور پر جمع اور تفریق کا قاعدہ برتتی ہے ذیل میں شہد کے چھتہ کی تصویر ہے جس میں پہلی قطار چھ پہلو خانوں کی ہے مگر بعد کی قطاروں کے خانے آپس میں مشترک دیواریں رکھتے ہیں جن میں جمع اور تفریق دونوں کا قاعدہ ملتا ہے اور اس میں انجینیرنگ کا دوسرا کمال یہ ہے کہ اس میں کفایتِ مادہ اور کفایتِ مکان۔ کفایتِ وقت اور کفایتِ محنت کا سنہرا اصول موجود ہے کہ درمیانی خانوں کا ہر پہلو دوسرے چھ خانوں سے مشترک ہوگا۔ جس کی تعمیر میں وقت جگہ مادہ اور

---

[1] نَحَارِیْب چھ حروف سے مرکب ہے جو چھتہ کے ہر خانہ کے چھ پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

محنت کی ہر ممکن بچت موجود ہے۔

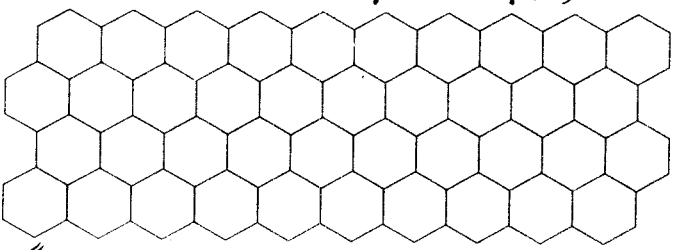

ہر ایک خانہ کا وہ پہلو جو دوسرے سے ملا ہوا ہے وہ ڈبل نہیں بلکہ دو گھروں کی مشترکہ دیوار کی طرح ہے۔ دیوار تو ایک ہے مگر کام دو دیوار کا دیتی ہے چھتہ کے خانوں میں جمع اور تفریق کا یہ عمل شہد کی مکھی کے سوچ بچار اور غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتا جیسا کہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے پس یہ شہد کی مکھی کی طرف وہ وحی ہے۔ جو حسب ارشاد قرآن مجید اللہ تعالیٰ نے کی ہے اور اسی وحی کی تعمیل کی ایک اور دلیل ہے۔

تیسری دلیل جو ان خانوں کی تعمیر سے تعلق رکھتی ہے یہ ہے کہ ایک چھتہ کے اندر سارے خانے ایک ہی پیمائش کے نہیں ہوتے بلکہ یہ خانے تین قسم کے ہوتے ہیں وہ خانے جو ملکہ مکھی کے لئے مخصوص ہوں گے وہ بڑے ہوتے ہیں ان سے دوسرے درجہ پر نکھٹوؤں کے جو قد میں بڑے ہوتے ہیں اور کارندہ مکھیوں کے خانے چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ اے، بی، سی قسم کے کوارٹر اپنی اپنی کلاسوں کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ جو ایک علم اور فکر کو چاہتے ہیں اسی علم و فکر کی نفی مکھی کی تقدیر میں پہلے سے لکھ دی گئی ہے لہٰذا اس کا یہ فعل وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی ہے کی دلیل صداقت ہے۔

دلیل چہارم جو قرآن مجید کے دعوے کی تصدیق کرتی ہے یہ ہے کہ یہ تمام کوارٹر اپنی اونچائی کے لحاظ سے ایک جیسے ہوتے ہیں ان کی بلندی میں کہیں فرق نہیں آتا تاکہ کوارٹرز کی چھتوں کی سطح ہموار رہے اور کام کرنے والوں کو کوئی دقت پیش نہ آئے۔

دلیل پنجم یہ ہے کہ ان خانوں کا ایک حصہ انڈر گراونڈ (زیر زمین) شہر کے طور پر بنایا جاتا ہے تاکہ چھتہ لمبائی اور چوڑائی میں زیادہ دور تک نہ پھیل جائے اس سے مکانات کے زیادہ طول کھینچنے سے وقت، جگہ، مصالحہ اور محنت زیادہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

دلیل ششم یہ ظاہر ہے کہ چھتہ یا بستی ایک محدود آبادی کے لئے بنائی جاتی ہے جیسا کہ سرکاری کوارٹرز کلرکوں آفیسروں کے اعداد و شمار کے مطابق بنائے جاتے ہیں چونکہ چھتہ کی ساری آبادی ملکہ مکھی کی قوت پیدائش پر منحصر ہے جس میں ملکہ نکھٹوؤں اور کارندہ مکھیوں کی مقررہ تعداد ہوگی (چونکہ سارے چھتہ میں سوائے ملکہ مکھی کے اور کوئی مکھی انڈے نہیں دیتی اس لئے یہ ساری آبادی ایک ہی ملکہ کی اولاد ہے) لیکن اس آبادی کا اعداد و شمار ایک حساب کو چاہتا ہے اور اس کی تعداد ہزارہا تک پہنچتی ہے جس کا شعور بالذات مکھی کو نہیں اس لئے آبادی اور اس کے گھروں میں تناسب وحی الٰہی سے ہوگا۔

دلیل ہفتم مکھیوں کی کئی اقسام ہیں اور قد کے لحاظ سے چھوٹی بڑی ہیں اسی نسبت سے ان کے خانے چھوٹے بڑے ہوں گے اور خانوں کا رقبہ کم و بیش ہوگا۔ پھر آبادی بھی ہر قسم کی ملکہ مکھی کی قوت پیدائش کے مطابق ہوگی جس کا اندازہ ایک ماہر اعداد و شمار اور ہوشیار

انجینیر ہی کر سکتا ہے۔

دلیل ہشتم، یہ بتایا جا چکا ہے کہ مکھی چھتہ کا ہر خانہ شش پہلو بناتی ہے مگر مربع یا گول یا مستطیل کیوں نہیں بناتی؟ ایک انجینیر جانتا ہے کہ سب سے مضبوط شکل دائرہ ہوتا ہے گول برج یا گنبد دیرپا اور مضبوط ہوتا ہے۔

پھر جس بچہ کو اس کے اندر پناہ لینی یا رہائش اختیار کرنی ہے وہ بھی گول اور لمبا ہوگا۔ دونوں لحاظ سے بیوت گول ہونے چاہئیں لیکن اس میں قباحت یہ ہے کہ گول دائرے کے بیوت کی کوئی دیوار مشترک نہیں ہو سکتی جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ محنت، وقت، مصالحہ اور جگہ کا خرچ زیادہ ہوگا دوسرا نقص یہ ہے کہ دائروں کے درمیان اس نشان + والی فالتو جگہ ضائع ہوگی جس میں

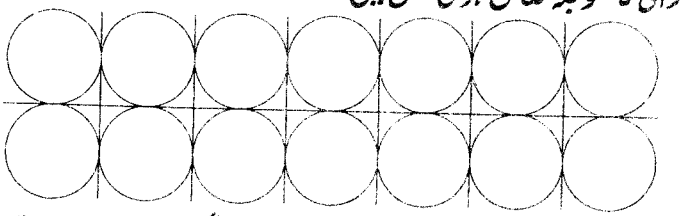

بیکٹریا اور جراثیم آباد ہو جانے کا خطرہ ہے اور اگر خانے مربع یا مستطیل بنائے تو اس میں پہلا نقص یہ ہے کہ یہ شکل دائرہ کے بالمقابل کمزور ہے دوسرے باہر کی دیواریں مشترک ہو سکتی ہیں مگر اندر جگہ کونے بن جانے کی وجہ سے صاف نہ ہو سکے گی۔

دلیل نہم یہ ہے کہ چھتہ کا وزن ہلکا ہونا چاہیئے یہ آپ نے سنا ہوگا کہ ہوائی جہازوں میں سامان اور استعمال کی چیزیں نہایت ہلکی استعمال ہوتی ہیں مثلاً کاغذ کے گلاس پلیٹیں وغیرہ وغیرہ۔ شہد کی مکھی

کا شہر چونکہ ہوا میں معلق ہوتا ہے اس لئے اس کے خانے نہایت ہلکے مصالحے سے اور کاغذ کی طرح پتلے پتلے مگر اس کے ساتھ ہی مضبوط بنائے جاتے ہیں۔

دلیل دہم : ان گھروں کو بارش کے ریلے سے بھی واسطہ پڑیگا اس لئے گھروں کی تعمیر کا مصالحہ کاغذ کی طرح ہلکا تو ہونا چاہیئے کہ بھیگ کر بھاری نہ ہو جائے مگر کاغذ کی طرح پانی جذب کرنے والا نہ ہونا چاہیئے کہ گداز ہو کر گل ہی جائے البتہ ایک اعلےٰ برساتی کی طرح موی یا ربڑ کی مانند ہونا چاہیئے کہ پانی کا اس پر اثر نہ ہو اور شہد پانی کی ملاوٹ سے بھی محفوظ رہے کہ اس میں تخمیر نہ ہو جائے۔ یہ تمام کی تمام باتیں ایک اعلےٰ درجہ کا انجینیر۔ فنکار۔ آرٹسٹ۔ سائنسدان فلاسفر ماہر علم ریاضی فاضل اعداد و شمار اور اعلےٰ درجہ کا ہوشیار کیمسٹ ہی سوچ سکتا اور عمل میں لا سکتا ہے مشکل یہ ہے کہ یہ تمام علوم و فنون سیکھنے کے لئے مکھی کبھی کسی مکتب میں نہیں بیٹھی اور نہ کسی انجینیرنگ کالج کی ڈگری یافتہ ہے اور نہ مشق و اکتساب کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اُمّیِ محض ہے اور اُمّی محض ہونے کے باوجود معلّم علماء اور مدرسِ فضلاءِ دہر ہے۔ بلکہ اس کے متعلق یہ کہنا برحق ہے ؎

اُمّی و در علم و حکمت بے نظیر
زیں چہ باشد جز تتے روشن ترے

اس کے اندر وحی الٰہی ہونے کی اس سے بڑھ کر کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

شہد کی مکھی کے کارہائے نمایاں سے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وحی الٰہی پر استدلال

چھتہ کی پُر حکمت تعمیر کہ جس کا ہر گوشہ اور ہر پہلو اللہ تعالےٰ کی

ہستی اور اس کی طرف سے وحی کی ایک واضح اور بین دلیل ہے جس کے متعلق لندن کے ایک بلڈنگس انجینیر نے یہ شہادت دی ہے۔

"The bee, in constructing a honey-comb, affords an excellent example of the economic application of materials, in that it uses a minimum of substance to maximum advantage."

"شہد کی مکھی اپنے چھتہ کی تعمیر میں کفایتِ مادہ کا نہایت اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہے اس میں وہ کم از کم مصالحہ اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا اصول ملحوظ رکھتی ہے"

یہ زریں اصول نہ صرف چھتہ کی تعمیر میں ہی بلکہ اس کی وحی کے دوسرے حصہ ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ کی تعمیل میں بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر پایا جاتا ہے۔ تمام ضروری پھلوں اور پھولوں سے فائدہ اٹھانا اور بھرپور فائدہ اٹھانا، پھل اور پھول نے جو کچھ زمین، پانی، ہوا اور سورج سے حاصل کیا ہے یا اس کے پودے کی جڑنے زمین کی تاریکیوں میں ایک باریک حکمت کے ساتھ رات اور دن کی لگاتار محنت سے کمایا ہے جس کے متعلق ایک امریکن شاعر نے کیسا اچھا خیال ظاہر کیا وہ کہتا ہے میں نے پھول سے سوال کیا کہ تُو اتنا خُوبصورت کیوں ہے؟ اس نے کہا اس لئے کہ میں دُنیا میں دیکھا جاؤں اور تعریف کیا جاؤں۔ پھر میں نے اس کی جڑ سے پوچھا تو تاریکی اور سختی کے اندر اس قدر محنت کیوں کرتی ہے؟ اس نے جواب دیا بیشک مجھے محنت کرتے ہوئے کوئی نہیں دیکھتا اور میری مشقت کا اندازہ کسی کو نہیں ہوتا۔ لوگ پھول کی تعریف کرتے ہیں پر میری طرف

کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے سر پر میری ہی محنت اور مشقت اور صبر کا صدقہ پھول اور پھل کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسے دنیا دیکھتی اور سونگھتی ہے۔ شہد کی مکھی کا پھولوں اور پھلوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا یعنی ان سے مٹھاس خوشبو اور بیسیوں کیمیاوی اجزا کا رس اڑا لے جانا ایک معجز نما استفادہ اور انسان کے لئے ایک اعلیٰ اخلاقی اور روحانی درسِ معرفت ہے انسان کا پھولوں اور پھلوں سے گلقند اور مربّے اور شربت تیار کرنا ایک ظلوم و جہول کا استفادہ ہے یعنی دنیا کی حسین ترین مخلوق پھولوں اور پھلوں کا ستیاناس کر دیا اور اپنا ایک ادنیٰ سا فائدہ اٹھا لیا لیکن وہ ننھی سی جان اور زندگی کا ایک موہوم سا شرارہ جب پھولوں اور پھلوں سے پیار کرتا ہے تو صرف اپنا ہی مطلب نہیں نکالتا بلکہ پیار اور محبت کے حقیقی فلسفہ کا درس انسان کو دیتا ہے کہ جس سے تمہیں ذرہ بھر بھی فائدہ اور نفع پہنچے اس کا برا نہ چاہو۔ بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ جو تم پہنچا سکتے ہو پہنچاؤ۔ کسی کو نقصان نہ پہنچانا بلکہ اپنے فیضان و کرم سے اسے اور بڑھانا یہ ربّ العالمین کی صفت کا پرتو ہے۔ شہد کی مکھی نے پھولوں اور پھلوں سے پیار کا لطف اٹھایا نہ صرف اسے کوئی نقصان نہ پہنچایا بلکہ اس کا معاوضہ یوں ادا کیا کہ پھولوں اور پھلوں اور ان کے پودوں کو دو رنگوں میں حیاتِ جاوداں بخشی وہ پھول سے پیار کرنے گئی تو اس کی گود میں جہاں تک نیچے جا سکتی تھی اتر گئی اور اس تنہائی اور راز کے مقام میں پودہ کے نر و مادہ کو ملاتی آئی اور دعا دیتی چلی گئی رہتی دنیا تک بڑھو پھلو پھولو اور ترقی کرو۔

شہد کی مکھی کی وحی اور محمد رسول اللہ صلعم کی وحی میں مماثلت

پھولوں اور پھلوں سے

استفادہ کرتے ہوئے شہد کی مکھی نے پھولوں اور پھلوں پر دُوسرا احسان یہ کیا کہ ان سے جو رس چُوس کر لے گئی اس میں سے تغیر پذیر تخمیر کو اپنی اندرونی حرارت سے دُور کر کے ہمیشہ قائم رہنے والا کبھی نہ بگڑنے والا شہد بنا دیا۔ چند دنوں کے بعد دنیا میں اس موسم کے نہ کہیں پھول ہوں گے اور نہ پھل ہوں گے مگر ان کی روح ان کی بُو باس اور پودا کی زندگی بھر کی کمائی اور اندوختہ وہ کیمیاوی اجزا جو زمین پانی ہوا۔ روشنی، سورج اور چاند اور ستاروں سے اس نے اپنے لئے تھے انہیں شہد کے اندر دوامی زندگی بخش گئی۔ اپریل۔ مئی۔ جون۔ جولائی کی دھوپ جو نومبر دسمبر جنوری میں کہیں نہ ملے گی مگر شہد کے اس قوام کے اندر پابز نجیر ملے گی پیو اور گرم ہو جاؤ چکھو اور لطف اندوز ہو۔

کتنے شیریں الفاظ ہیں قرآن مجید کے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہد سے زیادہ میٹھی زبان سے نکلے وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تیرے رَبّ نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی۔ یعنی تیرے رَبّ کی وحی اور شہد کی مکھی کی وحی میں ایک محیر العقول مشابہت اور مماثلت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی نے دُنیا کے کسی پیغامبر اور اس کی پھول جیسی پیاری وحی کو بُرباد نہیں کیا اسے اپنی گود میں اُٹھا کر اسے حیاتِ جاوداں بخش دی یہ روحانی پھول اور پھل جو دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم کے گلستانِ معرفت میں رونما ہوئے اسے اس خَاتَمُ النَّبِیّین اور آخری نبی کی وحی نے بوسہ دے کر اپنی آغوش میں لے لیا اب وہ بہار جانفزا

کے پھول دنیا میں کہیں نہیں مل سکتے مگر قرآن مجید کے سیپاروں میں۔ اب یہ شہد جو کبھی خراب ہونے والا نہیں، ہمیشہ ہمیشہ جوں کا توں دنیا میں موجود رہے گا۔

کم و بیش دس ہزار قسم کے پھول ان مکھیوں کی خاطر خداوندِ عالم نے دلربا رنگوں اور رُوح پرور خوشبو سے بسا دیئے ہیں جن کا پیغامِ محبت جوں ہی مکھیوں کو پہنچتا ہے وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر دیوانہ وار ان کی طرف دوڑتی ہیں خوشی کا ایک نغمہ اور ھَمَّتْ بِہٖ وَھَمَّ بِھَا[1] کا ایک نظارہ، دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش ہوتے اور لطف اٹھاتے ہیں مکھیاں ان کا رس چوستی ہیں مگر اس عالمِ جوش و مستی میں کس قدر ہوشیار ہیں کہ ایک وقت میں صرف ایک ہی قسم کے پھولوں سے پیار کرتی ہیں جس کی وجہ سے ہر قسم کا شہد ایک ہی خوشبو اور مزہ رکھتا ہے بات کسی قدر دُور چلی گئی ہے اس لئے ہمیں ایک مرتبہ پھر اس کے چھتہ کی طرف لوٹنا چاہیئے جاڑے کی ایک طویل نیند جس میں مکھیاں لمبی تان کر سوتی ہیں۔ علماء کی اصطلاح میں اس کا نام (Hibernation) جاڑے کے دن تنہائی یا نیند کے اندر گزارتا ہیں مکھیاں اس سے موسم بہار کی ابتداء میں جاگ اٹھتی ہیں اور اپنا کام نہایت محنت سے شروع کر دیتی ہیں سب سے پہلے ان کا کام جماعت بنانا ہے۔ اس لئے ملکہ پرانے شہر یا چھتہ سے ایک جماعت کو لے کر اڑ جاتی ہے اور کسی دوسری جگہ ایک نئے شہر یا آبادی کی بنیاد رکھتی ہے یا یوں سمجھیئے کہ ملکہ کو یہ وحی اس کے رَبّ کی طرف سے ہوتی ہے یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ[2] اے تنہائی میں زندگی گذارنے والے یا کپڑا اوڑھ کر

[1] ۱۲:۲۴ [2] ۷۴:۱

سوئے ہوئے قُمْ فَاَنْذِرْ[1] اٹھو اور اپنے اقربا کو ڈرا کر جماعت بناؤ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ[2] غافل۔ تنہا نشین اور سوئی ہوئی یا مُردہ دُنیا پر رنج وغم کرنا بے فائدہ ہے اُٹھ بیٹھو اور لوگوں کو ان کے انجام سے ڈرا کر جماعت بناؤ۔ جاگو اور دُنیا میں کچھ کام کر جاؤ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ[1] اور اپنے رَب کی بڑائی بیان کرو ایسے کام کرو جن سے تمہارے رَبّ کی بڑائی ظاہر ہو وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ[1] اپنے کپڑے پاک رکھ اور گندسے دُور رہ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ[1] اس لئے احسان نہ کر کہ زیادہ ملے کپڑا اوڑھنے سے مراد اپنے آپ کو مخفی اور پوشیدہ رکھنا ہے۔ اس تنہائی اور گوشہ نشینی سے باہر اور لوگوں کو دعوت دو کہ وہ ایک جماعت میں شامل ہوں۔ قُمْ فَاَنْذِرْ[1] مستعد ہو کر اٹھو اور دنیا جہان کے لوگوں کو خدا کے کام کے لئے بلاؤ۔ تمہارا کام اور منصب یہی مقرر ہوا ہے مگر لوگ اٹھ کر کیا کریں وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ[1] اپنے رَبّ کی تکبیر اور بڑائی میں لگ جائیں۔ انسان کے بڑے کاموں سے ہی اس کے بنانے والے کی بڑائی ہوتی ہے وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ[2] اپنے کپڑے پاک رکھ مجاز اور حقیقت دونوں کی رُو سے۔ ظاہر حقیقت یہ ہے کہ اپنے کپڑے میل کچیل سے صاف ستھرے رکھو اور مجازیہ کہ حلال کی کمائی کے کپڑے اور تقوے کا لباس پہنو اپنے کام اور اخلاق پسندیدہ اور اعلیٰ بناؤ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ[1] ہر معصیت سے دُور رہو اور امر قبیح سے بچو۔ حکم بظاہر رسول اللہ صلعم سے خاص ہے مگر آپؐ کی وساطت سے مومنوں سے عام ہے۔ البتہ شہد کی مکھی کے حق میں اس کے فطری الہام کا نہایت ضروری جزو ہے چنانچہ تندرستی اور صحت کی حالت میں وہ اپنے چھتہ میں کبھی

[1] ۷۴: ۲ تا ۶ [2] ۲۶: ۲۱۴

رفعِ حاجت نہیں کرتی اور نہ کوئی گند اور مُردار اپنی آبادی میں رہنے دیتی ہے اس کا جسم ایسا بنا ہے کہ وہ اپنے پَروں پر رفع حاجت کر کے اس نامعلوم گند کو بھی باہر جا کر صاف کرآتی ہے، اسے مکھیاں پالنے والے Cleansing flight پروازِ طہارت یا باہر ہوآنا کہتے ہیں۔ موسم بہار میں وہ بہت سی مردہ مکھیوں کو چھتہ سے باہر پھینک دیتی ہیں اور مُردوں کو ہرگز اپنے گھروں میں رہنے نہیں دیتیں یہی معنی ہیں وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ کے۔ اس کے بعد آتا ہے وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ نہ احسان جتانہ عوض معاوضہ یا زیادہ ملنے کی امید رکھو۔ یہ اصول بھی شہد کی مکھی پر منطبق ہوتا ہے وہ شہد بنا کر دیتی ہے مگر اس کے عوض گائے۔ بکری کی طرح نہ رہنے کو گھر اور نہ چارہ طلب کرتی ہے۔ آخر پر فرمایا وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ صرف اپنے رَبّ کی فرمانبردار ہو کر اس کے بنائے ہوئے راستوں پر چلتے جاؤ۔

شہد کے اس محل کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ چھتہ کی پوری آبادی جس میں ہزار مکھیاں آباد ہیں۔ یہ ان سب کی اکیلی ماں ہے اس کے سوا باقی سب بانجھ ہوتی ہیں اس آبادی کے اندر بیسیوں حکمتیں اور سربستہ راز پوشیدہ ہیں جاڑے کی سُستی جھاڑ کر ملکہ انڈے دینا شروع کر دیتی ہے۔ کارندہ مکھیاں درختوں اور پھولوں کی طرف بھاگ نکلتی ہیں۔ بڑی محنت اور مشقت کے بعد تہ خانوں اور بالاخانوں میں زرِ گُل اور شہد بکثرت جمع ہوتا ہے۔ صرف آدھ سیر شہد اکٹھا کرنے کے لئے ان کو گھر سے پھولوں تک ۳۷۰۰۰ چکر لگانے پڑتے ہیں ساری جماعت میں چھتہ کے اندر کوئی سست بے وقت سویا ہوا کبھی نہیں دیکھا گیا سب کی سب نہایت محنتی اور چست اپنی ڈیوٹی پر حاضر کارکن ہیں۔ ان کی مجموعی محنت اور مشقت

سے یہ گھر آباد اور شہد سے بھرپور ہوتا ہے کہ یکایک اہالیانِ چھتہ میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور بوڑھی ملکہ نہایت مضطرب نظر آتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ایک عجیب حادثہ اور سانحہ اگرچہ ملکہ نے اچھی ماں کی طرح اپنے فرائض ادا کر دیئے ہیں مگر اب اسے اس کی محنت کا بدلہ بظاہر کچھ نہ ملے گا۔ ایک نامعلوم وحی اور اشارہ اسے ڈراتا ہے کہ اسے یہ اپنا شہر چھوڑنا پڑے گا۔ ہجرت اور وطن سے جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے جس پر اس نے اتنی مدت محنت کی ہے۔ اور ایک زبردست جتھا اور فوج تیار کی ہے۔ اور وہ ملکہ صرف انسانی ملکہ کی طرح نہیں بلکہ اس نے خود یہ شہر بنایا اور آباد کیا ہے۔ اور سارے اہالیانِ شہر اس کے اپنے بچے ہیں اور یہ سب اس کے فرمانبردار باادب بیٹے بیٹیاں اور شہزادیاں ہیں۔ وہ تمام کارکنوں کے لئے تقسیم کار اور اوقات مقرر کرتی ہے اور ان کی عمر کے مطابق کام تجویز کرتی ہے بچوں کے لئے نرسیں مقرر کرتی ہے۔ چھتہ پر پہرہ دار بٹھاتی ہے اپنی مرضی اور خوشی کی بہ نسبت قاعدہ قانون یا وحی کی زیادہ پابندی کرتی ہے مکھیوں کے چھتہ کا مطالعہ کر کے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے سب کچھ سمجھ لیا۔ مگر اس کے اندر نہیں معلوم کتنے راز ہیں جو حل نہیں ہو سکتے۔ جب ہجرت اور ترک وطن کی وحی آتی ہے وہ مقررہ وقت پر یہ آباد گھر، گھر کی ساری دولت اعزّا اور اقربا سب کچھ بنا بنایا جوں کا توں چھوڑنے کے لئے تیار ہو جائیں گی۔ وہ ناخوشی سے نہیں بھوک بربادی یا جنگ کی تباہی کی وجہ سے نہیں اور نہ فوری طور پر بلکہ اس کے برعکس عرصہ پہلے اس کے لئے تیاری کی جاتی ہے۔ اور ہجرت کے لئے موزوں وقت کا انتظار کیا جاتا ہے۔ فَاِذَا نُقِرَ فِی النَّاقُوْرِ[1] ایک قربانی

[1] ۷۴ : ۸

اور کامل ایثار کی شام جس کے متعلق ایک ماہر حشرات الارض کہتا ہے :۔

"All things go to prove that it is not the queen, but the spirit of the hive that fixes on the hour for the swarm."

کوئی اندرونی روح اور روحی ہوتی ہے جو ہجرت کا وقت مقرر کرتی ہے۔ کیونکہ ملکہ خود بھی ان احکام کی اتباع کرتی ہے جو وہ اپنے متبعین کو دیتی ہے۔ (اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ)[1] تمام مکھیوں کے ساتھ کوئی مشورہ ہوتا ہے یا نہیں کہ انہیں چلے جانا چاہیئے۔ یہ آنے والی نسل کے لئے ایک قربانی ہے کہ بغیر فتنہ اور فساد کے اپنا بنایا شہر چھوڑا جاتا ہے۔ دنیا کے انسانی کارخانوں میں مزدوروں کا لباس، خوراک نیند اور آرام سرمایہ داروں پر قربان ہوتا ہے مگر مکھیاں آئندہ اپنی نسل کی خاطر یا آنے والوں کے لئے قربانی کرتی ہیں۔

"It is the future of the race and that only which directs the bee's action."

کون بتا سکتا ہے کہ یہ صدہا کی جماعت اس قدر قربانی کیوں کرتی ہے اس قدر سخت محنت کرنے کے بعد وہ اپنی محنت کی کمائی سے بے تعلق ہو جاتی ہے۔ شدید محنت جب پھول انہیں دُور سے بُلاتے ہیں یہ اپنے کام کے سوا ہر چیز کو بھول جاتی ہے۔ پورے دِل کے ساتھ وہ اپنے آپ کو کام میں لگا دیتی ہے پانچ ہفتے تک روزانہ ۱۸ گھنٹے کام کر کے وہ چُور چُور ہو جاتی ہے اِس کے پَر ٹوٹ جاتے جسم شکستہ اور زخموں سے رنجور۔ نیند حرام، خُود شہد کی لذت سے محروم۔ اس کے لئے تو صرف دو تین پھول ہی کافی تھے۔ ایک گھنٹہ میں دو تین سو پھولوں پر پھرنا اور رَس جمع

[1] ۲: ۲۸۵۔

کرنا جسے وہ کبھی نہیں کھائے گی یہ سب کچھ کیوں اور یہ جان توڑ محنت کس لئے؟ اس کا جواب صرف ایک ہے کہ وہ رہتی دنیا تک زندہ رہے اس اولاد کی شکل میں جو ان کے بعد آنے والی ہے۔ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۔ یہ ایک اور اس عظیم الشان وحی کا حصہ ہے کہ اپنے رَبّ کی راہوں پر فرمانبردار ہو کر چل۔ ان تمام راہوں اور طریقوں پر جو گھروں کی تعمیر کے لئے ضروری ہیں جن کا ذکر اس سے پیشتر ہو چکا ہے اور وہ تمام طریقے جو پھلوں اور پھولوں سے رس حاصل کرنے اور اس رس میں ان تمام اجزاء کو معین اور مقرر اوزان میں مہیا کرنا اور شہد کی شکل دینے میں جن باتوں کا جاننا ضروری ہے ان تمام سُبُل اور راستوں پر مکھی نہایت فرمانبرداری کے ساتھ چلتی ہے۔ مگر اس کی کامل فرمانبرداری کا ایک پہلو اپنی ملکہ کی کامل فرماں پذیری ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ شہد کی مکھی ایک سوشل کیڑا ہے۔ اس کی زندگی ایک جماعتی زندگی ہے۔ اور اس کا اُولی الامر اس کی ملکہ ہے۔ شہد کی مکھی جماعت سے الگ ہو کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح اپنی ملکہ کی فرمانبرداری اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ملکہ اس پوری آبادی کی ماں بھی ہے اور حکمران بھی ہے۔ چھتہ میں نر سیں حاملہ ملکہ اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں مؤدب اور خدمت گذار ہو کر ہمیشہ ملکہ کی منتظر رہتی ہیں اور اسے کبھی اپنی نظر سے اُوجھل نہیں ہونے دیتیں اور نہ اس کی طرف کبھی پیٹھ کر کے اس کی بے ادبی کرتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوتا ہے؟ جانوروں کے متعلق یہ بحث بہت ہی قدیم ہے کہ ان کی کوئی زبان ہے؟ کیا ان کے اندر عقل اور قوتِ استدلال ہے؟ بعض لوگ ایک کتے کو کچھ سکھا کر ان کے رقعہ خوانی کا تماشہ دکھاتے ہیں

مثلاً کاغذ کے چند ٹکڑوں پر الگ الگ بہت سے نام لکھ دیتے ہیں اور انہیں باہم ملا دیتے ہیں۔ کتا ان سب رقعوں میں سے آپ کا نام نکال کر دکھا دیتا ہے مگر یہ صرف عقل کا دھوکہ اور سمجھ کا پھیر ہے۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اکثر جانور انسان کی نسبت ایک حس نہایت تیز یا کامل ترقی یافتہ رکھتے ہیں اور یہ حس قوتِ شامہ یا سونگھنے کی حس ہے یہ قوت انسان میں بہت ہی کمزور ہے اس لئے ہم جانوروں کے کرشمے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کاغذ کے جن ٹکڑوں پر نام لکھے گئے ان میں سے ایک رقعہ جو آپ کے نام کا تھا کتے کے سامنے کر دیا گیا اس پر اس کے سانس کی بُو لگ گئی جب وہ رقعے باہم ملا دئے گئے تو کتے نے اسی رقعہ کو سونگھ لیا جس پر اس کی بُو لگی تھی اور نکال کر لے آیا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی باتیں جانوروں کی قوتِ شامہ کے کرشمے ہیں۔ جانوروں کی دُنیا فی الحقیقت قوتِ شامہ کی دُنیا ہے۔ ہم نظارہ اور مشاہدہ اور آواز کی دُنیا کے رہنے والے ہیں جانوروں کو یقیناً ہمارے کام عجیب معلوم ہوتے ہوں گے کہ ہم کیونکر کتابیں پڑھتے اور ہزار ہا میل سے ریڈیو پر آواز سنتے ہیں۔ ہمارا موسمیات کا محکمہ بارش کی پیشگوئی کرتا ہے مگر وہ اکثر غلط ہوتی ہے مگر جانور بغیر کسی آلہ کی مدد کے بادلوں کی خوشبو ہماری نسبت دو دن پہلے سونگھ لیتے اور اپنی خوراک جمع کر لیتے ہیں۔ کیا یہ امر عجائباتِ قدرت میں سے نہیں کہ انسان جو کام عقل استدلال، غور و فکر اور دماغ کے علمی بینک کے زور سے کرتا ہے اس سے زیادہ اچھا وہ کام بغیر کسی غلطی کے جانور اور یہ ننھی سی مخلوق کرتی ہے۔ شہد کی مکھی اپنے فطری الہام اور وحی کے زور سے پھولوں اور پھلوں کا انتخاب کرتی ہے۔ پھولوں

اور پھولوں کو اللہ تعالےٰ نے جہاں خوبصورت اور نظر فروز رنگ دیئے ہیں وہاں انہیں بھینی بھینی خوشبو بھی عطا کی ہے جو مکھیوں کو اپنی طرف کھینچتی اور کئی میل سے اپنا پیغام دوستی بھیجتی ہے۔ مکھیاں اڑ کر آتی اور اس میں سے اپنے لئے مفید رس کو جو بیسیوں کیمیاوی اجزاء سے مالا مال ہوتا ہے چوس کر لے جاتی ہیں۔ یہ تفسیر ہے ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ کی۔ اس کے بعد مکھی کی وحی کا دوسرا کمال پھولوں کا انتخاب اور پھر ان میں سے شہد بنانے والے اجزاء کا رس نکالنا یہ عقل و فکر کا کام نہیں بلکہ اللہ تعالےٰ کی وحی ہے۔ جو اس میں مرکوز رکھی گئی ہے۔

وحی الٰہی کا تیسرا حصہ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا سو چل اپنے رب کی راہوں پر فرمانبردار ہو کر۔ پھولوں کے انتخاب ان سے رس حاصل کرنے اور اس میں سے اجزاء شہد کا معین وزن وغیرہ وغیرہ ہر امر میں اس فطری الہام سے سرمو تجاوز نہیں کرتی بلکہ بڑی سختی سے فرمانبردار رہتی ہے۔ لوہا۔ تانبا۔ مینگنیز۔ پوٹاشیم، سوڈیم، فاسفورس پروٹین اور وٹامن کا وزن فی قطرہ شہد اندھا دھند کم و بیش نہیں ہوتا بلکہ عین اندازہ اور ضرورت کے مطابق ہوتا ہے کیا کوئی کیمسٹ اس علم کے بغیر ایک نسخہ بنا سکتا ہے مگر شہد کی مکھی نے کیمسٹری کا علم کہاں سے سیکھا؟ کیا پھولوں اور پھلوں میں سے ان چیزوں کی فراہمی کسی بہت بڑے علم کی محتاج نہیں؟ کیا کوئی بڑے سے بڑا فلاسفر یا کیمسٹ بلکہ دنیا کے تمام ڈاکٹر مل کر بھی کوئی ایسا مرکب تیار کر سکتے ہیں اور اس کے اندر ان تمام اجزاء کو معین اور مقررہ تناسب اوزان میں ملا کر سارے مرکب نسخہ میں جان ڈال سکتے ہیں جو قدرتی شہد میں

مکھیوں کی مجموعی قوتِ عمل سے پیدا ہو جاتی ہے؟ علاوہ ازیں شہد کی مکھی کے چھتہ سے روانہ ہونے، پھولوں پھلوں تک دُور یا نزدیک سے پہنچنے اور وہاں سے واپس آنے میں بھی کئی سلوک کی منزلیں ہیں جو اسے طے کرنی پڑتی ہیں۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں راہ و رسم منزلہا سے خوب واقف اور سالکِ راہِ رَبّ کے خطاب کی مستحق ہے۔

ع کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

مکھی کا اپنے چھتہ سے نکل کر پھولوں تک زاویے بناتے ہوئے جانا اور انہی زاویوں پر واپس آنا ایک عجیب فطری الہام ہے کہ وہ اس آمد و رفت میں ذرّہ بھر ادھر ادھر نہیں ہوتی۔ کیا انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس طرح ہوا میں ایک میل تک زاویے بناتا ہوا دوڑے اور پھر بغیر کسی ظاہری نشان کے انہی زاویوں پر واپس آئے۔ یہ ایک نئی تحقیق ہے مگر قرآن مجید کا لفظ ذُلُلًا اسی حقیقت کو ۱۴۰۰ برس سے ظاہر کر رہا ہے۔ سالک کی بھی یہی شانِ عمل ہے کہ وہ جس راہ کو اختیار کر لیتا ہے اس پر استقلال سے قائم رہتا ہے۔ جہاں چلنا ہو چلتا ہے اور جہاں رکنا ہو رکتا ہے۔ اور اپنا راستہ دائیں بائیں بناتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے مغربی داناؤں نے شہد کی مکھی کے متعلق جو کچھ بتایا ہے وہ سننے کے قابل ہے:

(1) A bee line in other words is a straight line.

(2) He started off bee line, a waving and sinuous line right and left, but following a rule.

(3) The bee is more honoured than any other animal, because she labours, but she labours for others.

(4) While honey lies in every flower no doubt, it takes a bee to get the honey out.

(5) The honey bee has no time for sorrow.

(6) A wise bee sips not a fallen flower.

(7) Where bees are, there is honey.

(8) Good bees never turn drones.

(9) There is a matter of poison to the spider, where there would be a matter of honey to the bee.

(10) Go to the bee, thou poet, consider her ways and be wise.

۱۔ شہد کی مکھی کا راستہ فی الحقیقت سیدھا راستہ ہے۔

۲۔ اس شخص نے شہد کی مکھی کی راہ اختیار کی۔ دائیں بائیں مڑتی ہوئی راہ مگر اُصول کے مطابق۔

۳۔ شہد کی مکھی تمام جانوروں میں معزز ہے کیونکہ وہ محنت کرتی ہے مگر محنت کرتی ہے دوسروں کے فائدہ کے لئے۔

۴۔ اس میں شبہ نہیں ہر پھول میں شہد ہوتا ہے مگر شہد کی مکھی ہی اس میں سے اُسے باہر لاتی ہے۔

۵۔ اپنے کام میں بے حد مصروف رہنے کی وجہ سے شہد کی مکھی کو فکر وغم کرنے کی فرصت نہیں۔

۶۔ دانا مکھی گرے پڑے پھول سے رس نہیں چوستی۔

۷۔ جہاں کہیں مکھیاں ہیں وہاں شہد بھی ہوتا ہے۔

۸۔ کارندہ مکھیاں کبھی نکھٹو نہیں ہو سکتیں۔

۹۔ مکڑی کے لئے جہاں زہر ہے وہاں مکھی کے لئے شہد۔
۱۰۔ شاعر شہد کی مکھی کے پاس جا۔ اس کی راہ و رسم پر غور کر اور دانش و بینش حاصل کر۔

شہد کی مکھی گھر سے نکل کر زاویے بناتی جاتی ہے اور انہی زاویوں پر گھر واپس آتی ہے۔ سارے راستہ میں کسی جگہ بھی ذرہ بھر اِدھر اُدھر نہیں جاتی خواہ وہ راستہ کتنا ہی دُور کا راستہ ہو اس میں انسان کے لئے یہ سبق ہے کہ وہ اپنے کاموں میں مستقل مزاج رہے اور اپنے فرائض کا پابند۔ شاعر یا خطیب کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ شہد کی مکھی سے موزوں اور شیریں کلامی سیکھے۔ خودغرض اور مطلب پرست انسان بے عزت اور ذلیل انسان ہے۔ وہ جو دوسروں کی خدمت کا راستہ اختیار کرتے ہیں خُدا اور مخلوق دونوں کے ہاں عزت پاتے ہیں۔ محنت اور کام میں مصروف مکھی اور انسان کے لئے رنج و غم کھانے کی فرصت ہی کہاں ملتی ہے انہیں کبھی پچھتانا نہ پڑے گا جیسے دانا مکھی گرے پڑے پھول سے رس نہیں چوستی۔ دانا آدمی غریب اور کمزور آدمیوں سے مدد کے طالب نہیں ہوتے۔ مکھی کی محنت شہد بناتی ہے۔ انسان کو اس کی محنت کا پھل ضرور مل کر رہے گا یہ ایک سبق ہے جو شہد کی مکھی سُست ہارے ہوئے اور مایوس انسان کو دیتی ہے۔ دوراندیش لوگ کبھی بے کار نہیں بیٹھتے وہ ہمیشہ اپنی محنت سے دوسروں کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ پھول میں شہد اور زہر دونوں ہوتے ہیں۔ مکڑی اس میں سے زہر چوستی ہے تاکہ دوسروں کو زہر کا انجکشن دے مگر مکھی شہد نکالتی ہے تاکہ دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ شہد کی مکھی کا راستہ ہی صراطِ مستقیم یا سیدھی راہ ہے۔ محنت، محنت اور لگاتار محنت اور اپنی راہ سے ذرہ بھر اِدھر اُدھر نہ جانا قرآن مجید نے

ان حقائق کو فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا کے الفاظ میں گویا دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔

شہد کی مکھی کو وحی کا حصّہ چہارم

يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ (۱۶: ۶۹)۔ اُن کے پیٹوں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف اقسام ہیں اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ گویا وحی کا چوتھا حصّہ شہد کی تیاری تعدیل اور تسویہ یعنی اس کے کیمیاوی اجزاء میں توازن قوام اور حرارت کا ایک خاص ٹمپریچر ہوتا ہے۔ بچوں، جوانوں، کارندہ مکھیوں اور ملکہ کے لئے رائل جیلی کی متوازن غذا ہوتی ہے۔ سرانڈیا تخمیر سے بچا کر ہمیشہ ہمیشہ اسے اصلیت پر قائم رہنے اور خالص رکھنے کے لئے ہر قسم کے جراثیم کش انتظامات ہوتے ہیں۔ اس میں نہ صرف چھتہ کی پوری آبادی کے لئے مکتفی غذا ہوتی ہے بلکہ یہ ایک ایسا کارخانہ ہے جو نہ صرف اپنے بچوں کی ضروریات کا سامان تیار کرتا ہے بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی کافی شہد بناتا ہے۔

امریکہ میں ایک لاکھ سے زیادہ مکھیاں پالنے والے ہیں۔ ان کے اپنے خاص رسالے ہیں۔ وہ سالانہ دو کروڑ پونڈ شہد فروخت کرتے ہیں ان کا اندازہ ہے کہ مکھیاں اپنی محنت سے بیس گنا زیادہ فائدہ دیتی ہیں۔ کیلی فورنیا جو سب سے بڑھ کر اور زیادہ اقسام کا شہد پیدا کرتا ہے وہاں آٹھ لاکھ ایکڑ پھولوں کی فصل ان کے لئے وقف ہے ان کا کہنا ہے کہ بعض خاص قسم کے پودے نفیس قسم کا شہد پیدا کرنے والا رس رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیاہ رنگ اور تیز بُو کا شہد بیکری اور

پیسٹری بنانے والوں کے کام آتا ہے۔ ہر جگہ کا شہد اپنے اندر اُس جگہ کی روح رکھتا ہے۔ رَس بھری رکھنے والے پہاڑوں اور صنوبر کے جنگلوں کا شہد اعلیٰ ہوتا ہے اور اسی طرح پھلوں اور پھولوں کے مختلف اقسام اور الگ الگ موسموں کا شہد متفرق ذائقے اور تاثیرات رکھتے ہیں بلحاظ خوراک یہ ایک مکمل خوراک ہے۔ جو ہزارہا محنتی مزدوروں کی متفقہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ سرجان مور لکھتے ہیں۔

"The bee helps to cure all your inward and outward diseases, and is the best friend a man has in the world."

شہد کی مکھی تمہاری اندرونی اور بیرونی بیماریاں دُور کرنے میں مدد دیتی ہے اور دنیا میں یہ ایک بہترین دوست ہے۔

وہ لوگ جو طبیب ہیں وہی بتا سکتے ہیں کہ ذیابطیس کی بیماری میں جہاں شکر مہلک ہے وہاں شہد کیوں اکثر مریضوں کو موافق آتا ہے۔ بچوں کو یہ مضبوط اعضا اور دانت دیتا ہے۔ بچوں۔ نوجوانوں اور بوڑھوں سب کے لئے مفید ہے جس میں ۸۰ فیصدی نشوونما کے اجزاء موجود ہیں اس میں کیلشیم اور دوسرے ضروری نمک موجود ہیں جو دوسری شکر میں نہیں ہوتے۔ اوسط درجہ کا ایک شخص ۱۰ پونڈ سالانہ شکر اپنے جسم میں جلاتا ہے مگر اسے ہضم کرنے کے لئے اعصاب کو بہت محنت کرنی پڑتی ہے کہ اس میں سے مُضرات دُور کر کے خون کی ندی میں ملایا جائے مگر شہد براہ راست خون میں جا ملتا ہے کیونکہ اس میں وٹامن اور نمک موجود ہوتا ہے۔

نصف لیموا ور ایک چھوٹا چمچہ شہد گرم پانی کے گلاس میں زکام

اور انفلوائنزا کا بہترین علاج ہے۔ ایک ڈاکٹر لکھتا ہے میں اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہارا معاون ہوں تم شہد کو کھانے میں مناسب جگہ دو یہ خدا کی طرف سے کامل غذا ہے۔ اور بیماری میں شفا ہے۔ شہد کی چائے سوء ہضم کے لئے نہایت مفید علاج ہے۔ ایک چمچہ شہد ایک پیالہ اُبلتا ہوا پانی گرم گرم پی لیا جائے۔ ہر کھانے سے پہلے تین دفعہ دن میں۔

یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔

ان کے پیٹوں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ اور اقسام ہیں اس میں لوگوں کے لئے صحت اور شفا ہے۔ اس سے پہلے مکھی کو خطاب تھا کہ تو پہاڑوں درختوں اور چھتوں میں گھر بنا۔ پھولوں اور پھلوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا۔ اپنے رب کی راہوں پر نہایت فرمانبرداری سے چل۔ اس خطاب کے بعد اب مکھی کا ذکر غائب کے صیغہ میں ہے یعنی ان کے پیٹوں سے پینے کی چیز نکلتی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اپنے پیٹوں سے پینے کی چیز نکالو یہ اس لئے کہ انسان کو توجہ دلائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور عجیب صنعت پر غور کرے کہ مکھی بے چاری کی کیا حقیقت ہے اس میں غور و فکر کا کوئی مادہ نہیں اور نہ سوچنے کے قابل دماغ ہے تاہم اللہ تعالیٰ کے حکم کے ماتحت جب وہ محنت اور مشقت کرتی ہے اور اس کی محنت و مشقت میں انفرادیت جماعت کی کوشش میں گم ہو جاتی ہے۔ ہر فرد ایک خاص خاص فرض بجالاتا ہے۔ کوئی باہر سے مصالحہ جمع کر کے لاتی ہیں۔ دوسری ان کو منہ میں لے کر موم میں تبدیل کرتی ہیں تیسری درخت پر الٹی لٹک کر پتھر اور درخت پر جوڑ لگاتی ہیں خانے بناتی ہیں کچھ پھولوں کا رس لا کر دوسری مکھیوں کے منہ میں

دیتی ہیں۔ وہ اپنی زبان جلدی جلدی ہلا کر اس میں سے پانی اڑا دیتی ہیں اور شہد بناتی ہیں۔ خانوں میں بھرتی ہیں۔ بعض ان خانوں پر جب ملکہ انڈہ دے چکتی ہے تو مہر لگا دیتی ہیں بعض کا کام پہرہ دینا، اپنے پرائے کو پہچاننا ہے۔ دشمنوں سے جنگ ہے۔ نرسوں کا کام ہے، گلی کوچوں کی صفائی ہے ساری آبادی کے لئے الگ الگ راشن کا انتظام کرنا۔ سارے چھتہ میں تقسیم کار اور تقسیم خوراک کا ایسا اعلےٰ انتظام ہے کہ نہ کوئی بیکار سست بیٹھا ہے نہ کسی سے لڑائی جھگڑا اور فساد ہے نہ چھینا جھپٹی گالی گلوچ اور مار پیٹ نہ کوئی بھوکا ہے نہ کوئی زیادہ راشن پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ بغیر افسروں کی دیکھ بھال ڈانٹ ڈپٹ کے ہر فرد محنت کی ایک اکائی ہے۔ اب ان کی مجموعی جدوجہد اور محنت کا پھل ہے جو ان کے اندر سے شہد کی شکل میں نکلتا ہے۔ کیا یہ سب کام اللہ تعالےٰ کی وحی کے بغیر ہو سکتے ہیں۔ مکھیوں کی خاطر دس ہزار قسم کے پھولوں کا پیدا ہونا اور پھولوں کی بقاءِ نوع اور ان کی محنت کو دوام بخشنے کے لئے مکھیوں کا پیدا ہونا اور حقیر و کمزور مکھی کا ایسے شاندار کام کرنا کیا یہ کسی اندھے اتفاق کا نتیجہ ہے۔ پھولوں نے مکھی کو پیدا نہیں کیا اور نہ مکھی نے پھول بنایا ہے تاہم دونوں کے اندر پیار و محبت کی لگن کیونکر پیدا ہو گئی۔ مکھی نے کس لیبوریٹری اور معمل میں اور کالج میں تعلیم پائی کہ وہ پہلے ہی دن پیدا ہوتے ہی پھولوں کی طرف دوڑ گئی اور پھول نے ان کے سامنے سر جھکا دیا اور دونوں کے پیار نے شہد کی شکل اختیار کی اور انسان کو یہ سبق سکھایا کہ افراد کی محنت جب سوشل اور جماعتی قوت اختیار کرتی ہے اور اپنے اولی الامر کی مقررہ راہوں پر چلتی ہے تو وہ محنت اور یگانگت کا عسلِ مصفےٰ تیار کرتی ہے جس میں شفا ہے انسان کی ساری

بیماریوں کی۔ شہد کی مکھی کی زندگی جماعت میں ہے اور وہ جماعت سے الگ ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ زندہ قوموں کے اندر ایک دوسرے کی عزت، مدد اور ہمدردی اور دوسروں کی خاطر اپنی جان تک قربان کر دینے کا مادہ ہوتا ہے۔ ع

ز اتفاقِ مگس شہد میشود پیدا

مکھیوں سے جو شہد پیدا ہوتا ہے اس کی تین صفات بیان فرمائیں وہ ایک شربت ہے پینے کی چیز ہے وہ جسے انسان نہایت رغبت اور آسانی سے اپنے اندر لے جا سکتا ہے اور وہ آسانی سے خون میں مل جاتی ہے۔ نہ زبان اور منہ کو اس کے لئے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ ہر حرکت جو انسان کرتا ہے وہ اعصاب کے تکان اور قوت کے خرچ کا ایک ذریعہ ہے۔ کسی کام میں جتنی محنت کم پڑے گی اتنی ہی انسان کی قوت محفوظ رہے گی۔ شہد بنانے میں انسان کو کچھ کرنا نہ پڑا وہ وحی الٰہی نے مکھیوں سے بنوا دیا اب اس کے استعمال میں کتنی آسانی ہے غٹا غٹ پی لو۔ منہ ہلانے چبانے اور نگلنے میں کوئی محنت نہیں پھر معدہ کے اعصاب پر کوئی کام کا بوجھ نہیں وہ براہِ راست خون میں جا ملتا ہے معدہ کو اس پر اپنی قوتِ ہاضمہ اور کھار صرف کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ کوئی دوسری چیز کھانا چاہو شہد میں لپیٹ کر۔ مربّہ بنا کر کھا لو اس کی برکت سے وہ چیز ہضم ہو جائے گی۔ دوسری صفت مختلفُ الوانہٗ سرخ، سفید، زرد اور سیاہ یہ الگ الگ اجزاء اور فوائد پر مشتمل ہے مختلف بیماریوں اور کھانوں میں استعمال کر سکتے ہو، ان کے اختلاف الوان۔ مختلف پھولوں اور موسموں پر منحصر ہیں۔ اگرچہ مکھی ایک تھی

اس نے گرمی میں جو شہد بنایا اس کا رنگ اور تھا بہار میں اور، سردی میں اور، اسی طرح پھولوں کی اقسام کے مطابق خوشبو اور ذائقہ رکھنے والا ہوتا ہے یہ ظاہر ہے کہ مکھی فاعلِ مختار نہیں وہ محنت اور مشقت کی ایک اکائی ہے۔ قدرت کے ہاتھ میں وہ ایک ذریعہ اور آلہ ہے جو وحی الٰہی سے ملتا ہے اور حرکت کرتا ہے۔ اس کی تیسری صفت ہے فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ۔ پھول مکھی اور انسان۔ مکھی نے پہلے پھول سے پیار کیا اس نے اُسے رس دیا مکھی نے رس لے کر اسے ارتقاء کی منزل پر پہنچایا اور شہد بنا دیا اب اس مکھی کی محنت سے انسان نے فائدہ اٹھایا انسان براہِ راست پھولوں سے شہد حاصل نہ کر سکتا تھا۔ اللہ تعالےٰ کے حکم سے وہ ایک حقیر جانور نے کر دکھایا۔

فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شہد ایک کامل غذا اور دوا ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کا مزاج اعتدال سے ہٹ جاتا ہے اور وہ اپنے اندر بے اعتدالی کی وجہ سے زہر جمع کر لیتے ہیں انہیں اپنے مزاج اور شہد کی تاثیر کو دیکھ کر مناسب بدرقہ کے ساتھ اسے استعمال کرنا چاہیئے۔ پرانی طب اور نئی طب دونوں میں اس کے فوائد مسلّم ہیں۔ نئی طب کی رُو سے اس کے اجزاء جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے لوہا۔ تانبا۔ مینگنیز۔ فاسفورس پوٹاشیم۔ سوڈیم۔ پروٹین اور وٹامن کا مجموعہ ہے اور پُرانی طب کی رُو سے یہ گرم خشک ہے بلغم اور رطوبت کو چھانٹتا ہے۔ رنگ نکھارتا ہے۔ سدے کھولتا ہے۔ استسقاء۔ یرقان۔ طحال۔ استرخا۔ قوت باہ کلف۔ عسر بول اور ریاح کے لئے مفید ہے اور پتھری کو توڑتا اور نکالتا ہے۔ امراضِ سینہ و سرد تنائل اور آنکھ کو فائدہ دیتا ہے۔ گرم خشک ہونے کی وجہ سے گرم مزاجوں کو

موافق نہیں مگر پانی ملا کر۔ انار کا رس یا لیموں و سرکہ ملا کر حسبِ مزاجِ مریض استعمال ہو سکتا ہے اور فائدہ دیتا ہے۔ نہ صرف مفرد چٹنی بلکہ مختلف پھلوں کے مربہ کے طور پر دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔ گلوکوس جو ڈاکٹروں کے ہاں طاقت کے لئے کھایا پیا جاتا اور انجکشن میں استعمال ہوتا ہے اسی شہد کی ایک شکل ہے۔ دواؤں کے اندر مرکب ہو کر مریضوں کے لئے شفا دیتا ہے۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے شہد کی مکھی کی وحی الٰہی کے چار حصے ہیں۔ اس وحی الٰہی کے ایک ایک لفظ پر اس ننھی سی جان کا عمل ہے اور عمل میں تندہی۔ جدوجہد، جان کاہ محنت اور سرفروشی کا ثمرہ وہ روح افزاء شربت ہے پھولوں اور پھلوں کی عمر بھر کی کمائی کا کیمیاوی نچوڑ جو نہایت باریک ذرات اور قطرات کی شکل میں اکٹھا کیا جاتا۔ مکھی کے بطون میں پختہ ہوتا اور بالآخر چھتہ کے خانوں میں قوام پاتا ہے۔ موسموں کے گرم اور سرد تغیرات، جان بخش ہواؤں کی لوریوں، تھپکیوں، سورج چاند سیاروں کی گوناگون برقی شعاؤں کے فیضانِ اثر سے۔ پھولوں، پھلوں کی جان بخش خوشبوؤں اور مکھیوں کی بھانت بھانت ذات پات کے اعتبار سے شہد کا رنگ سرخ و سپید۔ زرد اور سیاہ فام ہوتا اور بیسیوں مختلف تاثیرات اور خواص کا حامل ہوتا ہے۔ یہ اس کے مختلف الوان ہیں اور انہی خواص و صفات کے اختلاف کی بناء پر وہ لوگوں کے لئے شفا اور جام صحت ہے سرد و گرم آب و ہوا کے مختلف درجوں میں قسم قسم کے پھولوں اور پھلوں سے کشید کیا ہوا یہ انوشدارو لوگوں کی طبائع پر مختلف اثر پیدا کرتا ہے۔ نہ صرف جسمانی رنگ بلکہ بیاہ شادی اور بچہ کی پیدائش کی رسوم میں اسے

تحفہ، محبت اور عمر بھر کی سلامتی طبع کا شگون سمجھا جاتا ہے اور نوزاد بچہ کے منہ میں شہد عمر بھر کے لئے نیک اطوار کی فال سمجھا جاتا ہے، نہ صرف یہود، مسیحی اور ہندو مذاہب میں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور قدیم اقوام میں مختلف رسوم میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ زبان کی بعض ضرب الامثال میں بتایا گیا ہے کہ مکھی اُڑنے والوں میں سب سے چھوٹی جنس سے ہے مگر جو کچھ وہ پیدا کرتی ہے وہ دنیا کی شیریں ترین چیز ہے۔ اس قدر چھوٹی اور کام اتنا عظیم الشان کہ انسان کی بنائی ہوئی کوئی شکر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اتنی چھوٹی اور نحیف سی چیز مگر اس کی محنت اور محنت میں دانائی، حکمت اور اس کا بدلہ اور نتیجہ دُنیا کا ایسا بیش بہا تحفہ اس کے بنانے والے کی ہستی اور دانشمندی کی واضح دلیل ہے۔

مکھیوں کا سوشل جذبہ ایک بے مثال جذبہ ہے اور اس کے لشکر کو قوی ترین دشمن کے لشکر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ استثناء ۱: ۴۴ زبور ۱۱۸: ۱۲۔

ویدوں میں اگرچہ شہد جلانے کا حکم دیا گیا ہے، اور ہون (نوختنی) اشیاء کا ایک جزو ہے مگر بنی اسرائیل میں اسے حکماً بند کر دیا ہے۔ (احبار ۲: ۱۱)

بنی اسرائیل کو جس سرزمین کا وعدہ دیا گیا اس کے متعلق فرمایا اس میں دودھ اور شہد بہتا ہے۔ شہد کو کلام الٰہی اور روحی الٰہی کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (زبور ۱۱۹: ۱۰۳)

امثال میں حکمت اور دانائی کے ساتھ اسے تشبیہ دی ہے۔

یوحنا بپتسمہ دینے والے کی صفت شہد کھانے والا بیان کی ہے۔ (متی ۳: ۴) (متی ۳: ۴)

ویدوں میں شہد اشونی کمار دیوتا کا تحفہ قرار دیا ہے جو وہ مکھیوں کو عطا کرتے ہیں۔

آسمانی حکومت یا اسلامی حکومت کا نمونہ

دوسری قابل غور بات جو انسان کی اجتماعی اور سوشل زندگی کے لئے سنگِ میل کا حکم رکھتی ہے یہ ہے کہ زندگی کا یہ چھوٹا سا شہرہ شہد کے جمع کرنے ذخیرہ کرنے اور اس کا قوام پختہ کرنے میں جس قدر محنت اور مشقت کرتا اور اپنی جان کی قربانی دیتا ہے وہ صرف اس کے اپنے فائدہ کے لئے نہیں۔ پرندے دانہ دُنکا چنتے اور چیونٹیاں اپنی خورش کا ذخیرہ کرتی ہیں، مگر ان کی محنت اپنے لئے ہوتی ہے ..... شہد کی مکھی کی محنت اور ان تھک مشقت دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہوتی ہے، وہ اپنی اس محنت سے بہت کم کھاتی ہے۔ اور یہی طریق عمل سلوک راہِ رَبّ یا خدا کی محبت اور قربِ الٰہی کا مقام ہے کہ انسان دوسروں سے ہر قسم کے اجر اور بدلہ کی اُمید نہ رکھ کر دوسروں کی خدمت کرے۔ شہد کی مکھی نے چھتہ کے اندر ایک اعلیٰ درجہ کی حکومت کا نمونہ پیش کیا ہے جس میں ہر فرد مملکت کے لئے رہنے کا ایک آرام دہ گھر اور ہر شخص کے لئے متوازن صحت افزاء روزکی روٹی اور اس جماعت کا ہر ممبر دیانت و امانت کی ایک اکائی ہے یہ ہے اسلامی حکومت کا ایک چھوٹا سا نمونہ جو خداوند عالم نے شہد کے چھتہ میں خود پیش کیا ہے۔ سب کے لئے صحت بخش روٹی۔ رہنے کو آرام دہ گھر۔ اور دلوں کی مساوات یہ ایک اعلیٰ درجہ کی حکومت وسلطنت کا طرۂ امتیاز ہے، جو اسے آسمانی بادشاہت کا نام معنون کرتا ہے۔

Honey	(شہد)
Honesty	(دیانت و امانت)
Honour	(عزت)

یہ تین الفاظ جو آپس میں ایک دوسرے کے بھائی معلوم ہوتے ہیں اور ایک معزز حکومت کے اراکین اعلیٰ ہیں یہ ایک اخلاقی ، روحانی یا سلوک الی اللہ کی ایک منزل ہے جسے شہد کی مکھی اپنی زندگی میں طے کرتی ہے۔ اور اس کی روزانہ ۱۸ گھنٹے کی دوڑ دھوپ میں نمایاں نظر آتی ہے۔

فلسفۂ اخلاق و حکمت اور معرفت الٰہی ان سب کو اس امر میں سمو دیا گیا ہے کہ شہد کی مکھی موسم اور ملک کے ، اختلاف کے اعتبار سے اپنے ہر قطرۂ شہد میں نہایت متناسب اجزاء کو اکٹھا کرتی اور اس کا قوام پختہ کرتی کچھ ایسے ایسڈ ملاتی جس سے شہد کو زندگی دوام مل جائے۔ لوگوں کے پیٹ کی بیماریوں۔ جگر۔ دل اور دماغ اور خون کو صحت اور توانائی بخشے۔ اس کے ہر قطرہ کا متوازن اجزاء سے مرکب کرنا کیا اس کے لئے کیمسٹری کی اعلیٰ درجہ کی واقفیت اور انسانی جسم اور وظائف الاعضاء کی معرفت کی ضرورت نہیں کیا یہ ننھا سا حیات کا اڑتا ہوا شرارہ بغیر وحی الٰہی کے یہ کام کر سکتا ہے۔ علوم کا وہ دریا جو وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ میں بتایا گیا ہے کیا وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صدق نبوت پر گواہ نہیں۔ شہد کی یہ کیمیاوی ترکیب جس میں لوگوں کی بیماریوں کا علاج اور شفا رکھدی گئی اور اس آسمانی نسخہ کا بخلاف انسانی نسخہ جات کبھی تغیر پذیر نہ ہونا اور ہمیشہ ہمیشہ اپنی اصلیت پر قائم رہنا کیا محمد رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت کی روشن دلیل نہیں۔ ایک قطرہ شہد فی صدی جن قیمتی اجزاء سے مرکب ہوتا ہے اس کا کسی قدر نمونہ درج ذیل ہے :۔

نسخۂ شہد

پانی ۔ ۱۳ سے ۲۰ فی صدی اختلاف آب وہوا کے مطابق

Loenulose	اعلیٰ درجہ کی شکر ۴۰ سے ۵۰ فیصد
Dextrose	" " " ۳۲ — ۳۷ " "
Sucrose	" " " ۱۲ " "
معدنی اجزاء کا کشتہ	$\frac{1}{۲۵}$ " "
Invertase	ہاضم اجزا نہایت موزوں تناسب سے
Diastase	
Inulase	
Catalase	
Vitamins	
Pollen Grains	زرِ گُل "
Suspended Solids	بعض نامعلوم اجزاء "
Proteins	گوشت بنانے والے اجزاء "
Malic Acid	مختلف تیزاب "
Succinic Acid	
Acetic Acid	
Citric Acid	
Formic Acid	

Xanthophyl Chlorophyl Carotin	درختوں کے رنگ

اس کے علاوہ سورج کی شعاعیں جو ہمیشہ کے لئے اس میں قید کرلی جاتی ہیں ایک معمولی سمجھ کا آدمی ان اجزاء کی ماہیت کو بھی نہیں سمجھ سکتا، ایک مولوی اور عربی کا فاضل ان حقائق کو شہد میں نہیں دیکھ سکتا البتہ ایک اعلےٰ درجہ کا کیمسٹ اور کمپونڈر ان اجزا اور ان کے فوائد سے واقف ہوسکتا ہے، لیکن کسی مصنوعی شربت میں یہ اجزاء اس نسبت سے جمع نہیں کرسکتا جو شہد میں مکھی جمع کرتی ہے، اس کے پاس نہ تو اجزاء تولنے کا کانٹا ہوتا ہے اور نہ ہی بنی بنائی یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ پھولوں اور پھلوں کے آبِ حیات سے یہ چیزیں اکٹھی رکھی ہوئی اڑا نہیں لاتی اس کا ننھا سا منہ اور چھوٹی سی تھیلی اور برائے نام آنکھ جو ان اجزاء کو دیکھ نہیں سکتی، لے دے کے ایک قوت شامہ (سونگھنے کی حس) اس کے ذریعہ مذکورہ بالا اجزاء وہ چھانٹ کر لاتی ہے اور ایسے طریق پر لاتی ہے کہ جو انسان سے کسی صورت قیامت تک ممکن نہیں۔

ایک لطیفہ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد میں ایک لطیفہ لکھا ہے۔ خوجی (ایک مسخرا) یورپ کے اثناءِ سفر میں ایک جگہ پینے کا پانی طلب کرتا ہے ایک شخص پانی کا گلاس لاتا ہے تو خوجی اکڑ جاتا ہے کہ ہم اس بدتمیزی سے پانی نہیں پئیں گے۔ پوچھا گیا کہ کس طرح پئیں گے انہوں نے کہا کہ پہلے ایک میز مہیا کیا جائے۔ چنانچہ میز لایا گیا، فرمایا اب ایک کرسی لاؤ۔ کرسی کے بعد ایک مونڈھے

کی فرمائش ہوئی جو بمشکل تلاش کیا گیا۔ خوجی صاحب بولے میز کے اُوپر کُرسی پر مونڈھا، اور پانی کی بھری صراحی لے کر مونڈھے پر چڑھ کر کھڑے ہو جاؤ ہم نیچے کھڑے ہو کر منہ کھولتے ہیں صراحی سے ایک ایک قطرہ ٹپکاتے جاؤ خبردار دوسرا قطرہ نہ ٹپکے جب تک ہم پہلے قطرہ کو گلے سے نیچے نہ اُتار لیں۔ آپ اندازہ لگائیے یہ کتنا مشکل کام ہے مگر شہد کی مکھی جو ایک اکیلی ہی یہ کام نہیں کر رہی ایک قطرہ کا نہایت حقیر حصّہ کسی پھُول سے چوس کر لاتی ہے اور اس کی جیسی سینکڑوں مکھیاں یہی کام کر رہی ہیں، مگر جب شہد کا قوام تیار ہوگا اس کے ہر قطرہ میں فیصدی اسی نسبت سے وہ تمام اجزاء پائے جائیں گے جن کا ذکر اُوپر ہو چکا، آخر یہ مزدوروں کی کی جماعت جو مختلف اجزاء چُوس چُوس کر لا رہی ہے ان کی مجموعی محنت کا نتیجہ ایسا موزوں اور متناسب مرکب کیسے ہو سکتا ہے کہ ہر جُز اپنی مقدار اور وزن سے بڑھنے نہ پائے۔ پانی فیصدی ۱۳ سے ۲۰ فی صدی ہو شکر اعلیٰ بھی ہو مگر ۴۰ سے ۵۰ فیصد اور دوسرا ۳۲ تا ۳۷ فیصد اور معدنی اجزا صرف $\frac{1}{2}$ فیصد اور ہاضم جنھیں (Enzymes) کہا جاتا ہے وہ متعدّد اور سب متناسب ہوں وغیرہ وغیرہ اور یہ سب کچھ مل کر جو کچھ ہے اس کے متعلق علماءِ ابدان اور اطبّاءِ کرام یہ فتوے دیں:۔

"Honey is highly nutritive, especially as a fuel for the energies of the body, as four-fifth of its components are Carbohydrates, the remainder being water with a trifle of protein, a small amount of mineral salts, fine colouring materials, aromatic bodies, enzymes, pollen grains and occasionally rare sugars and other carbohydrates."

(Encyclopaedia America)

"شہد نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی مقوّی غذا ہے بالخصوص جسمانی قوتوں کے لئے ایندھن کا کام دیتا ہے کیونکہ اس کا ۵/۴ حصّہ پرورشی اجزاء ہیں اور بقیہ اجزاء لحمیہ کی قلیل چاشنی کے ساتھ پانی ہے کچھ معدنی نمک۔ پانچ رنگ دینے والے مادے۔ خوشبو۔ ہضم کرنے والے اجزاء۔ زرِ گل۔ اور نایاب قیمتی شکر اور بالیدگیٔ جسم کے لئے مقویات ہیں۔" ہندوؤں کے مقدّس نوشتوں میں یہاں تک بھی لکھا ہے کہ خاص اوقات میں حاصل کیا ہوا شہد مُردہ کو بھی زندہ کر سکتا ہے۔ میرے خیال میں قرآن مجید کی طرف اشارہ ہے کہ جس سے رُوحانی مردے زندگی پاتے ہیں۔

کیمسٹری کا وہ باریک علم اور جسمِ انسانی کی بالیدگی پرورش اور قوت۔ حفظِ صحت کا مرکب تمام ڈاکٹر مل کر بھی پیدا نہیں کر سکتے کہ جو نہ صرف دُنیا میں ایک بے نظیر نسخہ ہے بلکہ ہزاروں برس تک بغیر کسی تغیّر کے جوں کا توں مصر کے دفینوں میں پایا گیا ہے۔

شہد کی مکھی ایک خاص دَرجہ حرارت پر اس کا قوام رکھتی اور اس میں سُورج کی شعاعوں کو قید کر دیتی ہے، اس کے اندر جراثیم زندہ نہیں رہ سکتے کہ اس میں فارمک ایسڈ کی ملونی ہے اور یہی اسے متغیر ہونے سے بچاتا ہے۔ اگر اس کے اصل درجہ حرارت سے زیادہ گرم کر دیا جائے تو اس کے اجزاءِ ہاضم فنا ہو جاتے ہیں اور اگر اسے کپڑے میں چھان لیا جائے تو یہ زرِ گل کی دولت سے خالی ہو جاتا ہے۔ مکھی کی محنت دُنیا میں قدرت کا ایک محیّر العقول اعجاز ہے۔ وہ دن بھر صدہا چکر چھتہ سے پھول تک اور پھول سے چھتہ تک لگاتی ہے ایک اور۔ ایک اور آخری چکر اور مایہ حیات کا ننھا سا قطرہ چھتہ تک پہنچاتے پہنچاتے اس کے پَر

کثرتِ پرواز سے ٹوٹ جاتے ہیں، اس کوشش میں تکان سے چُور ہوکر وہ کسی کھیت کے کنارے گر پڑتی ہے۔ وہ میدانِ جہاد میں جان دیتی اور عرصہ کارزار میں شہید ہوتی ہے۔ اس کے پھولوں کے ساتھ عشق سے پھول زندہ ہوتے، پھل پیدا ہوتے، سبزہ وگھاس کی دنیا میں نمود ہوتی۔ اس کی محنت سے شہد اکٹھا ہوتا، لوگوں کی بیماریوں اور غذاؤں میں کام آتا ہے اور لوگوں کو توانائی اور زندگی ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفت رحمانیت اور غیر مذاہب

اللہ تعالیٰ کی صفت الرحمان

پر بحث کے ضمن میں شہد کی مکھی کا قصہ دراز تر ہو گیا گویا اس میں وحیٔ الٰہی صداقتِ نبوّت و رسالت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختمِ نبوت جیسے اہم مضامین بھی زیر بحث آگئے

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت جو کائنات کے ذرّہ ذرّہ اور ہر نوعِ مخلوق میں اپنا اظہار کرتی ہے اور وہ اللہ تعالےٰ کے بالحکمت خالق ہونے پر شہادت دیتی ہے۔ کتبِ انبیاء بھی اس پر گواہ ہیں اور نیچر کی ہر چیز شاہد ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مخلوق کی حفاظت اور اس کی ترقّی کے اسباب وذرائع کو مفت عطا کیا ہے بغیر معاوضہ اور بلا بدل اور محض اپنے فیضِ رحمانیت سے قائم رکھتا اور اسے ترقی دیتا ہے تعجب کی بات ہے کہ عیسائی مذہب اور آریہ دھرم اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمان کے منکر ہیں۔ قرآن مجید بھی مشرکین عرب کے متعلق فرماتا ہے وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ (۱۳ : ۳۰) (خدا کے منکر نہیں مگر) رحمان کے یا صفتِ رحمانیت کے منکر ہیں۔ آریوں

کے خیال میں خدا کا تصوّر ایک ادنےٰ بنئے کا تصوّر ہے جو بلا بدل اور بلا معاوضہ کسی پر نہ احسان کرنا جانتا ہے اور نہ اپنے کسی بڑے سے بڑے بھگت (نیک انسان) کا گناہ معاف کرنے پر قدرت رکھتا ہے یا یوں سمجھئے کہ وہ آگ کے شعلہ کی طرح اپنے غصّہ پر آؤٹ آف کنٹرول ہے۔ رہا مسیحی دوستوں کا تصوّر کہ خدا باپ صرف عدل کر سکتا ہے رحم کی صفت سے خالی ہے اور یہ صفتِ رحم صرف بیٹے سے مخصوص ہے گویا باپ اور بیٹا دونوں مل کر ایک مکمل خدا بنتا ہے خدا کے لئے عدل اور رحم دونوں کا ہونا ضروری اور مسلّم ہے مگر یہ دونوں صفات ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں، دوسری طرف انسان کی نجات کا انحصار ان دونوں صفات پر ہے تو باپ اور بیٹا دونوں مل کر یا عدل اور رحم اکٹھے ہو کر انسان کی نجات کا ذریعہ بنتے ہیں، باپ کے پاس رحم نہیں بیٹے کے پاس عدل نہیں چڑیا اور کوّے کی کہانی کی طرح دونوں مل کر دال چاول لائیں تو انسانی نجات کی کھچڑی پکتی ہے چڑیا کے پاس چاول نہیں کوّے کے پاس دال نہیں البتہ دونوں کے اتحادِ عمل سے انسان کے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے گویا دونوں اپنی اپنی جگہ ناقص ہیں اور کامل تصوّرِ خداوندی سے محروم ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کے محتاج ہیں باپ کے بغیر بیٹا یتیم ہے اور بیٹے کے بغیر باپ ابتر ہے اس عقیدہ میں ان کی ٹھوکر کا باعث یہ وہم ہے کہ صفتِ رحم صفت عدل کے خلاف ہے، اگر عدل کیا جائے تو رحم کھڑکی کے راستے بھاگ جاتا ہے اور اگر رحم کیا جائے تو عدل پورا نہیں ہوتا گویا یہ دونوں صفات ایک دوسرے کی ضد ہیں جو ایک ہی ہستی سے صادر نہیں ہو سکتیں۔ اس سے پیشتر کہ عدل اور رحم دونوں کے عمل میں لانے کا سوال پیدا ہو

یا ایک ہی خدا دونوں متضاد صفات کو کیونکر عمل میں لاوے، دریافت طلب یہ امر ہے کہ آیا فی الحقیقت رحم اور عدل دونوں صفات خدا میں ہیں بھی یا نہیں ؟ یہ ظاہر ہے کہ خدا میں عدل کا ہونا بھی ضروری ہے اور رحم کی صفت بھی لابدّ۔ ان میں سے ایک صفت کی نفی بھی اگر خدا سے کر دی جائے تو خُدا خُدا نہیں رہتا۔ اگر خدا میں رحم نہ ہو تو خدا کی بے شمار صفات اور افعال کا انکار کرنا پڑے گا اور بے رحم خدا ہرگز ہرگز خدا کہلانے کا مستحق نہ ہوگا۔ رحم اللہ تعالےٰ کی وہ صفتِ کمال ہے جس سے وہ اپنی مخلوق کو دُکھوں اور مصائب سے بچاتا ہے زبور میں حضرت داؤدؑ کہتے ہیں :۔

"اے ساری زمینو ! خداوند کے لئے خوشی کا نعرہ مارو۔ خوشی سے خداوند کی عبادت کرو۔ گاتے ہوئے اس کے حضور حاضر ہو۔ تم سمجھ لو کہ خداوند ہی خدا ہے اسی نے ہمیں بنایا نہ کہ ہم نے اپنے آپ کو۔ ہم اس کے بندے ہیں اور اس کی چراگاہ کی بھیڑیں۔ شکرگذاری کرتے ہوئے اس کے دروازوں میں اور حمد کرتے ہوئے اس کی بارگاہ میں داخل ہوں۔ اس کا احسان مانو، اس کے نام کو مبارک کہو کہ خداوند خوب ہے اس کی رحمت ابدی ہے اور اس کی وفاداری پُشت در پُشت ہے۔" (زبور ۱۰۰)

موسیٰ علیہ السّلام کی کتاب خروج میں ہے :۔

"اور خداوند اس کے آگے سے گذرا اور پکارا خداوند!

خداوند! خدائے رحیم اور مہربان اور قہر میں دھیما اور رَبُّ الفیض ہے اور وفادار ہزار پشتوں کے لئے فضل رکھنے والا گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا۔"

(خروج ۳۴ : ۶ - ۷)

موسیٰؑ کی کتاب شمار میں ہے :۔

"خداوند بڑا صابر اور بڑا رحیم ہے گناہوں اور خطاؤں کا بخشنے والا۔" (شمار ۱۴ : ۱۸)

کتاب استثناء میں ہے :۔

"پس تو جان رکھ کہ خداوند تیرا وہی خدا ہے وہ وفادار خدا ہے جو عہد کا پاس کرتا ہے اور ہزار پشت تک اُن پر جو اس کے دوست ہیں اور اس کے حکموں کو مانتے ہیں رحم کرتا ہے۔" (۷ : ۹)

حضرت داؤدؑ فرماتے ہیں :۔

"میں ابد تک تیری رحمتوں کے گیت گاؤں گا۔"

(زبور ۸۹ : ۱)

ایک اور جگہ فرمایا :۔

"جس وقت میں نے کہا میرا پاؤں پھسل چلا سو اے خداوند تیری رحمت نے مجھ کو تھام لیا۔" (زبور ۹۴ : ۱۸)

اس طرح کے صدہا حوالجات جن میں خدا تعالےٰ کی رحمانیت کا ذکر ہے موجود ہیں، اللہ تعالےٰ کی ذات میں رحم کا نہ ہونا اور گناہوں کی معافی نہ ہونا بلکہ خداوندِ عالم کا مخلوقِ خدا سے فدیہ لے کر ان کو بخشنا یہ ایسے

عقائد و خیالات ہیں کہ اللہ تعالےٰ کو ان صفات سے خالی قرار دینا ہیں جن کی وجہ سے خداوند خُدا کہلاتا ہے اور نجات انسانی کے لئے بالکل ادھورا اور نکما خدا ہے۔ انسانی زندگی کا نصب العین اگر حصولِ نجات اور ترقیٔ درجات ہے تو باپ کی نسبت خدا بیٹا زیادہ کارآمد معلوم ہوتا ہے جس نے اپنی جان سوزی سے مخلوقِ خدا کی جان بخشی کرادی، ورنہ اس ساری نسلِ انسانی کے بچاؤ کی کوئی سبیل نہ تھی ع

"اگر پدر نتواند پسر تمام کند"

جو کام باپ سے نہ ہوسکا وہ بیٹے نے کر دکھایا مگر اب سوال یہ ہے کہ خدا باپ کی عبادت اور اس سے دُعا کا فائدہ ہی کیا؟

آریوں کے خیال میں مسئلہ تناسخ اس امر کا متقاضی ہے کہ انسان کا گناہ معاف نہ ہو گناہ معاف ہو جائیں تو روح کو نجاتِ ابدی ملنی چاہیئے اور اگر ارواح کو نجاتِ ابدی مل جائے تو وہ ہمیشہ کے لئے پرماتما کے ہاتھ سے نکل جائیں گی اور پرماتما کے پاس دنیا میں دوبارہ انہیں جنم دینے کا کوئی عذر اور بہانہ نہ رہے گا پس غیر مذاہب کے عقائد خُدا باپ کا تصوّر ایک ناقص تصوّرِ خدا ہے۔ خدا کا بیٹا ہونا۔ کفارہ صلیب مسیح۔ گناہ معاف نہ ہونا۔ خدا کا محض جج کی طرح صرف مُنصف ہونا اور رحمِ مطلق سے اس کا خالی ہونا اور آریوں کا مسئلہ تناسخ میعادی نجات اور کسی معمولی سے معمولی گناہ کا معاف نہ ہونا یہ خیالات اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت کے انکار سے پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر تفصیلِ بحث کا یہاں کوئی موقع نہیں۔

باب پنجم

الرّحِیم کی صفت

اَلْ : خاص کرنے کے لئے آتا ہے۔

رَحِیْم : اَلْ + رَحِیْم سے مل کر اَلرَّحِیْم بنا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالےٰ کا نام ہے۔

رحمان کی طرح رحیم بھی رَحم سے مبالغہ کا صیغہ ہے اللہ تعالےٰ کی صفت جس کی خصوصیت بار بار یا ہمیشہ رحم کرنا ہے۔ رحمان کی خصوصیت اگر یہ تھی کہ بکثرت اور بلا معاوضہ رحم کرتا ہے تو رحیم کی خصوصیت انسان کے اعمال پر نتائج مترتب کرنا اور ہمیشہ ہمیشہ رحم کرتے چلا جانا ہے یا کسی کے عمل کو یا ذرّہ بھر عمل کو بھی ضائع نہ کرنے والا ہیں بلکہ ہر عمل پر صحیح نتیجہ مترتب کرنے والا ہے رحمان اور رحیم دونوں ناموں کا آپس میں تعلق یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت نے جو قویٰ اور سامان ہمیں عطا کئے ہیں اور وہ مفت اور بلا بدل عطا کئے ہیں ان کو استعمال میں لانا یا ان سے کام لینا اور صحیح طریق پر عمل میں لانے سے اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحیمیت اس پر صحیح نتیجہ مرتب کرتی ہے۔ کھانا کھانے سے فائدہ صرف اسی صورت میں پیدا ہوگا کہ جائز کھانا اور درست طریق پر کھانا کھایا جائے۔ زہر کھانے۔

پرخوری۔ کم خوری اور مضرِ صحت اشیاء کھانے سے رَحیمیت صحیح نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی۔ اس لئے فرمایا کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا۔ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ۔ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا۔ طیّب اور حلال چیزیں کھاؤ۔ کھاؤ، پیو، مگر زائد از ضرورت نہ کھاؤ۔

(قرآن، ۲: ۱۶۸، ۱۷۲، ۷: ۳۱)

جس طرح نظامِ جسمانی میں رحمانیت اور رحیمیت کا یہ اصول مسلّم ہے اسی طرح نظامِ روحانی میں بھی اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ (۵۵: ۱-۲) رحمٰن نے جو قرآن عطا کیا ہے اس پر عمل کرنے اور شریعت کے احکام جوں کے توں بجالانے پر رحیمیت۔ روحانی ثمرات مرتب کرتی ہے دونوں صفات میں فرق یہ ہے کہ رحمٰن صرف اللہ تعالےٰ کا نام ہے اور رحیم دوسروں کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے، یہ بھی کہا گیا ہے ھُوَالرَّحْمٰنُ الدُّنْیَا وَالرَّحِیْمُ الْاٰخِرَۃ کہ اللہ تعالےٰ دنیا میں رحمان ہے اور آخرت میں رحیم ہے یہ اس لئے کہ دنیا میں اس کا انعام اور فضل کافر اور مومن دونوں پر ہے۔ مگر آخرت میں رحیم صرف مومنوں کے لئے ہوگا۔ کافر نے تو کوئی کام اس دنیا میں صحیح طریق پر یعنی آخرۃ میں ثواب ملنے کی نیت سے کیا ہی نہیں وہ تو صرف دُنیا کا طالب تھا۔

صفت رحیمیّت کے مظاہر قرآن مجید میں

الرحمان کی طرح الرحیم اور رحم کے مشتقات قرآن مجید میں بکثرت آئے ہیں اور ان کا استعمال بالعموم ان معنوں میں ہوا ہے۔

اللہ تعالےٰ لوگوں پر مہربان ہے رحم کرنے والا ہے۔ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے وہ بے انتہا رحم کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے،

میں توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت مانگو بے شک وہ حفاظت کرنے والا بار بار رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان ضائع کرنے والا نہیں کیونکہ وہ لوگوں پر مہربان اور رحیم ہے یعنی کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا اور نہ بے نتیجہ چھوڑتا ہے۔ کوئی شخص اضطراری حالت میں حرام شے کھالے مگر نہ اس میں زیادتی کرلے اور نہ عادی ہوجائے تو اللہ بخشنے والا رحیم ہے۔ حرمت والی مسجد کے قریب جنگ منع ہے اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشدے گا۔ حج میں مقررہ راہ پر چلے چلو اور اللہ کی حفاظت مانگو تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کرنے والے اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ معاف کرنے والا رحیم ہے۔ جو اپنی بیویوں سے ایلا (علیحدگی اختیار) کرتے ہیں ۴ ماہ انتظار کریں اگر باز آجائیں تو یقیناً اللہ تعالیٰ غفور بھی ہے رحیم بھی ہے۔ منکرین اسلام کامیاب نہ ہوں گے۔ تم زنا سے بچو اور رکے رہو تو اللہ بخشنے والا رحیم ہے۔ سزا پانے کے بعد چور اگر توبہ کرلے اور اصلاح کرلے ڈاکو اگر گرفتاری سے پہلے سچی توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے (یعنی اللہ کی سزا سے بچ جائے گا) مسیح کے پجاری توبہ کرلیں بخشش مانگیں تو اللہ غفور رحیم ہے یہ جان لو اللہ بدلہ دینے میں سخت ہے اور غفور رحیم بھی ہے۔ ملک میں تمہیں اس نے حکمت دی، ایک کو دوسرے پر فوقیت دی اس لئے کہ وہ تمہیں آزمائے کیونکہ وہ اعمال کا بدلہ جلد دینے والا اور وہ بخشنے والا رحیم ہے مسلمانوں کے لئے کسی کا مال بغیر جنگ جائز نہیں

بعد جنگ وہ حلال طیب ہے مگر اس میں تقوے شرط ہے زیادتی جائز نہیں بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ تمہارے ساتھ جنگ کرنے والے نماز قائم کریں، زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کی راہ نہ روکو یقیناً اللہ غفور رحیم ہے۔ مخلص ہیں مگر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو ان کے پاس کچھ نہیں اللہ بخشنے والا رحیم ہے۔ نیکی کرنے والوں پر الزام نہیں جو اعتراف گناہ کر لیں۔ نیک اور بد ملے جلے کام کریں اللہ بخشنے والا رحیم ہے۔ میرا رب رحم کرنے والا اور پائیدار محبت کرنے والا ہے۔ یہ تمہارے رب کی عنایت اور رحم ہے کہ تمہارا بوجھ جانور اُٹھاتے ہیں یقیناً اللہ تعالےٰ کی نعمتوں کا شمار نہیں بے شک وہ حفاظت کرنے والا اور رحیم ہے۔ زمین میں ہر چیز مسخر ہے، دریا میں چلنے والی کشتی فرمانبردار وہ آسمان کو زمین پر ٹوٹ پڑنے سے روکتا ہے یقیناً اللہ لوگوں پر مہربان ہے اور رحم کرنے والا ہے۔ اقربا مساکین اور مہاجرین کے قصور معاف کرو اللہ تمہاری مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے کسی کے جبراً گناہ کرانے کے بعد مجبور کو اللہ تعالےٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے انسان کو توبہ کے کلمات اللہ تعالےٰ نے خود سکھائے کیونکہ وہ بہت توبہ قبول کرنے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے۔ موسےٰ اور قومِ موسیٰ کو نجات اور آلِ فرعون کو غرق کرنا یہ بھی عزیز اور رحیم کا کرشمہ ہے۔ انبیاء اور مومنین کی حفاظت اور منکرین کی ہلاکت صفتِ رحیمیت کا تقاضا ہے۔ جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو اس سے پیدا ہوتا ہے جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور آسمان کی طرف چڑھتا ہے۔ اس میں رحم کرنے والے بخشنے والے کا ہاتھ ہے۔ بعض قوموں کے افعال ایسے ہیں کہ ان پر آسمان پھٹ پڑے مگر ملائکہ کا حفاظت طلب کرنا اور اللہ تعالیٰ کا غفور رحیم

ہونا اسے روکتا ہے دکھوں اور مصیبتوں میں صبر۔ سزا میں تخفیف۔ اللہ کی راہ میں شہادت۔ دلائلِ عقلیہ (بیّنہ) وحیِ الٰہی۔ خواہ مخواہ بدظنی نہ کر کے کسی بات کا یقین کرنا لینا۔ قرآن مجید اور اس کے بیان کردہ واقعات و دلائل۔ سب اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ کسی امر میں بظاہر عذاب مگر پوشیدہ رحمت ہے۔ جن کے چہرے سفید (گناہوں کی سیاہی سے پاک) ہیں وہ اللہ کی رحمت میں ہیں۔ گمراہوں کے سوا اللہ کی رحمت سے کوئی مایوس نہیں۔ انسان تنگدل ہے اگر اللہ تعالیٰ کی رحمت کے خزانوں کا مالک بنا دیا جائے تو خرچ ہو جانے کے خوف سے ہاتھ کو روک رکھے گا۔ اللہ تعالےٰ کے ایک بندے ذکریا نے جب عاجزی سے اپنے رب کو پکارا تو اللہ تعالےٰ نے اس پر بے حد رحمت کی۔ مُردہ زمین کو زندہ کر دینے والے آثارِ رحمۃ کو دیکھو وہی مُردوں میں جان ڈالنے والا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے انہیں کہدو اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اللہ سب گناہ بخشنے والا غفور رحیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی رحمت ہے تُو لوگوں پر نرم دل ہے۔ لوگوں کو کہو تمہارا رب بڑی رحمت والا ہے اللہ لوگوں کے لئے جس رحمت کو کھولتا ہے اسے بند کرنے والا کوئی نہیں۔ اور جسے وہ روک لے اسے کوئی دوسرا پہنچانے والا نہیں، نیک لوگوں کو خوشخبری دیتا ہے اپنی رحمت رضا اور جنّت کی اس میں دائمی نعمت ہوں گی۔ یہ بھی تیرے رب کی رحمت ہے کہ تو اس قوم کو ڈرائے جن کے پاس تجھ سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا۔ اور اس کی رحمت میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے رات اور دن بنائے تاکہ تم اُن میں آرام کرو اور اس کا فضل تلاش کرو۔ اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے، رحمت سے پیشتر وہ خوشخبری دیتے

والی ہوائیں بھیجتا ہے۔ وہ جو رات کی گھڑیوں میں عبادت کرتا سجدہ کرتا اور کھڑا ہوتا ہے اور آخرت کا خوف رکھتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا امیدوار ہے۔ وہی ہے جو نا امیدی کے بعد بارش اتارتا ہے اور اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے اور "میری رحمت ہر چیز سے وسیع تر ہے"۔ "جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ میری رحمت سے مایوس ہیں"۔ جو شخص نفس کی برائی سے بچایا گیا اس پر اس کے رب کی رحمت ہوئی۔

یقیناً نفسِ انسانی انسان کو بدی کا حکم دیتا رہتا ہے مگر جس پر میرا رب رحم کرے (یعنی نیکی اور بدی کی سمجھ بوجھ عطا کر دے)۔

آج اللہ کی سزا سے کوئی بچانے والا نہیں مگر وہی بچے گا جس پر اللہ رحم کرے (اس کے گناہوں سے درگذر کرے)۔

وہ جو اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شک تیرے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔

منکرین کی حالت یہ ہے اگر ہم ان پر رحم کریں اور ان کی تکلیف دُور کر دیں تو اپنی سرکشیوں میں اندھا دھند بھٹکتے رہیں گے۔ نیکوں کی پکار یہ ہے اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہماری حفاظت نہ کرے تو ہم خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے۔ اپنی رحمت میں ہمیں داخل کر تو تو سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ آدمؑ کی نوحؑ کی ہودؑ اور موسیٰؑ سب کی یہی دعا تھی۔

جب قرآن تم پر پڑھا جائے تو اسے سُنو اور خاموش رہو تاکہ

تم پر رحم کیا جائے۔ مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اپنے بھائیوں میں صلح کرادو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

صفت رحیمیت اور عملی زندگی

رحمانیت اللہ تعالیٰ کی وہ صفت ہے جو اللہ تعالےٰ سے خاص ہے زمین و آسمان کی پیدائش سورج اور چاند سیاروں ستاروں کی تاثیرات جو زمین کی روئیدگی اور جانداروں کے خون اور رگ و ریشہ پر اثر انداز ہیں۔ بادلوں کا لاکھوں اور کروڑوں من پانی اوپر اٹھا کر برسانا ہر مخلوق کو پُر حکمت وجود ملنا اور پھر انسان کے اندر زمین اور آسمان کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی استعدادیں اور قابلیت یہ سب کچھ اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحمانیت کا فیضان ہے۔ اس لئے یہ صفت اللہ تعالےٰ سے خاص ہے جس کا صدور کسی دوسرے سے متصور نہیں۔ جب بھی کوئی شخص دوسرے سے بھلائی کرتا ہے اس کی کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے خواہ اس سے مقصود اپنے ضمیر کی محض خوشی اور راحت ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اللہ تعالےٰ کی رحمت جو صفتِ رحمانیت کے ماتحت ظاہر ہوتی ہے اس میں اللہ کا ذاتی مفاد کچھ بھی نہیں کیونکہ اس کی ذات غرض، احتیاج اور کمی بیشی سے پاک ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کا ایک رنگ ناقص طور پر انسان بھی اختیار کر سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بغیر کسی ذاتی مفاد یا معاوضہ کی امید کے محض اللہ تعالےٰ کی رضا مدنظر رکھ کر احسان کرے اور یہ انسان کی یا مؤمن کی سب سے اعلیٰ صفت بیان کی گئی ہے وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا۔ اللہ تعالےٰ کی محبت کی وجہ سے مسکین

یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ ہی شکریہ (۷۶: ۸-۹)

رحیمیت کا پرتو انسان کے اندر۔ یوں منعکس ہو سکتا ہے کہ وہ رحمانیت کے ماتحت اللہ تعالےٰ سے عطا شدہ اسباب و ذرائع قویٰ اور استعدادوں کو کام میں لائے۔ اور اس کوشش اور سعی میں دُکھ اور تکلیف بخوشی برداشت کرے۔ قرآن مجید کی رُو سے زندگی کا نَصْبُ العین دُکھ اور تکلیف سے اپنے آپ کو بچانا نہیں بلکہ دُکھ اور تکلیف اٹھا کر اپنی استعدادوں کو ترقی دینا کمال تک پہنچانا اور محنت اور مشقت میں راحت محسوس کرنا ہے پس رحیمیت کا پیغام انسان کے نام یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالےٰ نے تخلیقِ عالم میں اپنی محبت کا اظہار کیا ہے اور وہ ہر آن ایک نئی شان میں جلوہ گر ہوتا ہے اسی طرح انسان اپنے قویٰ اور استعدادوں کو ترقی دے کر ہر روز علم و عمل میں آگے بڑھتا چلا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حصولِ کمال کی خاطر انسان کو دُکھ اور مصیبت برداشت کرنا پڑتا ہے اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ انسانی زندگی میں دکھ بہت زیادہ ہے جو بسا اوقات انسان کو اللہ تعالےٰ کی ہستی یا رحیمیت کا منکر بنا دیتا ہے مگر اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ اپنے بچہ کو اگر اُٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے کی تکلیف سے بچا کر اپنے رحم اور محبت کا اظہار کرتا ہے یا اسے ہر کام میں آزادی دے کر خوش رکھنا چاہتا ہے یا حصولِ تعلیم کا اس پر بوجھ نہ ڈال کر اپنا دلی پیار ظاہر کرتا ہے یہ رحم و محبت درحقیقت رحم و محبت نہیں بلکہ بچہ کے ساتھ اصل میں دشمنی ہے اس لئے حصولِ کمال کے لئے دُکھ اُٹھانا درحقیقت دُکھ اٹھانا نہیں بلکہ یہ حصولِ کمال کا دوسرا نام ہے۔ ڈاکٹر کا نشتر اور دوائی کا کڑوا پن بھی فی الحقیقت صحت و سلامتی اور رحیمیت کا دوسرا رُخ ہے۔

باب ششم

مالک یوم الدّین

سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالےٰ کی صفتِ رحیمیت کے بعد "مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس کے لفظی معنی تو اس قدر ہیں کہ وہ جزا اور سزا کے وقت کا مالک ہے یا عدل و انصاف پر کُلّی اختیار رکھتا ہے قرآن مجید میں مَلِک اور مَالِک ایک ہی مادہ سے دو لفظ ہیں ایک کے معنی بادشاہ اور دوسرے کے معنی مالک یا صاحبِ اختیار ہیں۔ نیک اور بد فرمانبردار اور نافرمان، حق پسند اور باطل پرست میں فرق اور امتیاز ہونا ضروری ہے اگر دُنیوی نظام کے اعتبار سے فرمانبردار اور نافرمان اور نیک و بد میں امتیاز نہ ہو تو کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا اور حکومت کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو قائم نہیں رہ سکتی، مگر اس کا دوسرا پہلو بھی قابل غور ہے کہ انسان کا بنایا ہوا قانون غلطیوں سے پاک نہیں ہو سکتا۔ قانون اکثر بَر سر اقتدار فریق اور طاقتور انسان کے حق میں جانب دارانہ اور دوسروں کے حق میں غیر منصفانہ ہوتا ہے اس لئے قانون بالخصوص مہذّب ممالک کے قانون اقتدار کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں۔ قانون کے متعلق علماء اور حکماء کی آراء کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

؎ عدل ہے کچھ اور شئے قانون ہے کچھ اور چیز۔

"Whenever I hear any man talking of an unalterable law, the only effect it produces upon me is that he is an unalterable fool."

"جب میں کسی شخص کو یہ کہتا ہوا سنتا ہوں کہ یہ ناقابلِ تبدیل قانون ہے تو اس کا اثر مجھ پر یہ ہوتا ہے کہ مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ شخص لاعلاج بے وقوف ہے۔"

ایک اور رائے سنئے:۔

"Written laws are spider's web. They hold the weak and delicate who might be caught in their meshes but are torn in pieces by the rich and powerful."

"مکتوبہ قوانین مکڑی کا پُرفریب جال ہیں وہ جو کمزور اور نازک ہیں ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں مگر امیر اور طاقتور انہیں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔"

یہ بھی سنئے:۔

"Entangles justice in her net of law."

"انصاف اپنے قانون کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔"

"Still for the strong too weak, for the weak too strong."

"قانون ابھی طاقت ور کے لئے نہایت کمزور اور کمزور کے لئے نہایت مضبوط ہے۔"

"The more law, the less justice."

"زیادہ قانون انصاف کم۔"

عدالتوں کی تعریف میں خوب کہا گیا ہے۔

"Winning a cat you loose a cow."

"بلی حاصل کرنے کے لئے آپ گائے کھو دیتے ہیں۔"

دنیا کی کوئی زبان نہیں جس میں انصاف سا میٹھا لفظ نہیں کوئی ملک نہیں جس میں اس کی پیاس نہیں جتنا یہ لفظ عام ہے اسی قدر وہ نایاب ہے عام طور پر ہر جگہ قانون اور عدل کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے اور قانون کا پورا پورا نفاذ عدل و انصاف کا پورا ہونا سمجھا جاتا ہے لیکن اکثر اور بیشتر قانون اور انصاف میں تضاد ہے اس لئے انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لئے قانون بدلتا رہتا ہے مگر عدل ایک لافانی اور غیر متبدل چیز ہے جہاں اپنے قانون کے متعلق علماء کی آراء سنیں عدل و انصاف کے متعلق بھی چند مقولے سننے کے قابل ہیں :۔

"Justice is a great gift of God."

"عدل اللہ تعالیٰ کا عطیہ عظمیٰ ہے۔"

"In justice is all virtue found in sum."

"انصاف میں ساری نیکی کا نچوڑ ہے۔"

"Justice is the first of virtues."

"عدل کو تمام نیکیوں پر تقدم حاصل ہے۔"

"Justice is the queen of virtues."

"انصاف نیکیوں کی ملکہ ہے۔"

"Justice is to give every man's due."

"عدل ہر انسان کو اس کا حق دینے کا نام ہے۔"

"Justice is the only thing that follows men after death."

"انصاف ہی ایک چیز ہے جو موت کے بعد باقیاتِ صالحات میں سے ہے۔"

"The just man enjoys the greatest peace of mind."

"عادل انسان سب سے زیادہ اطمینانِ قلب حاصل کرتا ہے۔"

"The path of the just is as the shining light that shineth more unto the perfect day."

"عادل کی راہ روشن نُور کی مانند ہے۔ جو روز روشن کی طرح زیادہ سے زیادہ چمکتا جاتا ہے۔"

"Justice is justly represented as blind, because she sees no difference in the parties concerned."

"درست ہی انصاف کو اندھا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مدعی اور مدعا علیہ میں امتیاز نہیں کرتا۔"

"Justice discards party friendship, kindered and is therefore always represented as blind."

"انصاف کسی فریق کی رعایت نہیں کرتا اور نہ دوستی و رشتہ داری کا لحاظ رکھتا ہے اس لئے اندھا دکھایا جاتا ہے۔"

"Justice is blind not deaf, justice listens too much and

looks to little."

"انصاف اندھا ضرور ہے مگر بہرا نہیں وہ سنتا بہت زیادہ ہے مگر دیکھتا بہت ہی کم ہے۔"

اسلام سے پیشتر عدل اندھا ہی نہیں بہرا بھی تھا

قانون اور سمتریوں کے نقائص اور

عدل وانصاف کے متعلق علماء وحکماء کے خیالات سننے کے بعد مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے عدل وقسط کے متعلق سنئے کہ قرآن مجید کیا فرماتا ہے مقنّن کا پہلا نقص اس کے ذاتی علم اور حکمت کی کمی ہے اسی بنا پر کہا جاتا ہے:۔

"Justice without wisdom is impossible."

"انصاف حکمت و دانائی کے بغیر ناممکن ہے۔"

اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مذاہب نے فال شگون اور جھوٹی کرامتوں کا سحر پیدا کیا۔ شری رام چندر جی کی بیوی نے دلائل سے اپنے اوپر سے الزام کو دور نہیں کیا بلکہ ہاتھ میں آگ اٹھا کر اپنے پاک ہونے کا ثبوت دیا۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام پر سے الزام اس دلیل کے ذریعہ رَدّ کیا گیا کہ اگر یوسف کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے تو قصور یوسف کا ہے لیکن اگر پیچھے سے اور طول میں چاک ہوا ہے تو قصور عورت کا ہے۔

اسلام نے سب سے پہلے اس اصول کو منوایا ہے کہ ہر ایک جج اور منصف اس ایمان اور یقین کے ساتھ عدالت کی کرسی پر بیٹھے کہ اس کے اوپر بھی ایک عالم الغیب والشہادۃ ہے يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ (۶ : ۳)۔

"تمہارے خفیہ ارادوں اور ظاہرا دھوکہ دہی کو جانتا ہے۔"
وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفَى۔ "اور اگر تم پکار کر بات کہو تو وہ بھید کو اور پوشیدہ تر بات کو یقیناً جانتا ہے" (۲۰: ۷)
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالِ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍۢ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ۔ (۱۳: ۹، ۱۰) "وہ غائب اور حاضر کا جاننے والا بہت بڑا بلند ہے۔ برابر تم میں جو چھپ کر بات کرے اور جو اسے پکار کہے اور جو رات کو چھپ رہا ہو اور جو دن کو چل رہا ہو"

عدل وانصاف کا وقت جو انسان کے انصاف کے اوپر ایک اور انصاف کا وقت ہے اس کے مختلف نام قرآن میں آئے ہیں مثلاً یَوْمُ الدِّيْنِ۔ یَوْمُ الْاٰخِرِ۔ یَوْمُ الْبَعْثِ۔ یَوْمُ الْقِيَامَةِ۔ یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ۔ یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ۔ یَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ یَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ یَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ۔ یَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ۔ یَوْمُ الْحَسْرَةِ۔ یَوْمُ الْحَشْرِ۔ یَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ۔ یَوْمُ الْحَقِّ۔ یَوْمُ الْمَوْعُوْدِ۔ فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا۔ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا۔ یَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ۔ یَوْمَ لَا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ۔ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وغیرہ وغیرہ۔

ہر ایک شخص جو انصاف کی کرسی پر بیٹھا ہے کتنی بڑی حکومت اور رعب وجلال کا نمائندہ ہی کیوں نہ ہو، اسے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کے ہر فیصلہ پر ایک اور میزان کھڑی ہونے والی ہے۔ جو اس وقت

یہ فیصلہ کرے گی کہ مجرم وہ تھا کہ جس نے ایک معصوم کو مجرم ٹھہرایا مجرم حج تھا جس نے کسی رشتہ ناطہ ذات پات رنگ اور قوم کے جذبہ کے ماتحت اسے مجرم ٹھہرایا وہ وقت جب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کھل کر سامنے آجائے گا وہ یَوْمُ الدِّیْن ہے اس لئے کہ انسان کے تمام اعمال کی کامل جزا و سزا کا وہ وقت ہے جب حقا اور زور، روپیہ اور پیسہ، زبان کی چالاکی اور حکومت کا رعب کسی کام نہ آسکے گا۔ وہ یَوْمُ الْاٰخِرَہ ایک اور دن ہے اس دن کی شان نرالی ہے۔ جب پیروں کی پیری۔ لیڈروں کی لیڈری اور ساحروں کی ساحری کسی کام نہ آئے گی وہ یَوْمُ الْبَعْث ہے جب انسان اپنے تمام امتیازی نشانوں سے محروم ہو کر نئی پیدائش میں بیکس و بے بس ہو کر اپنی قبروں سے اُٹھ کھڑا ہوگا اس دن کا نام یَوْمُ الْقِیَامَہ ہے وہ یَوْمُ السَّاعَۃ نہیں کہ جو ہر چیز کی تباہی اور بربادی کی گھڑی ہے بلکہ وہ یَوْمُ الْقِیَامَہ ہے نئی زندگی کا وقت ہے جو تباہی کے بعد قائم ہوگی وہ ہر چیز کے فنا اور مٹ جانے کا نام نہیں بلکہ اپنے اعمال کی کامل جزا و سزا پانے کا وقت ہے یَوْمَ تُبْلَی السَّرَآئِر اس دن انسان کے اعمال میں سے کوئی چیز چھپ نہ سکے گی یا چھپائی نہ جاسکے گی نہ کسی میں چھپانے کی ہمت ہوگی اور نہ کوئی بچانے والا مددگار ہوگا اس دن لوگ رَبُّ العالمین کے سامنے حاضر ہوں گے۔ جس دن ہر عمل کا بدلہ عمل کے موافق ملے گا اچھے کا اچھا اور بُرے کا بُرا۔ انسان کھلے طور پر اپنے ہاتھوں کی کرتوت دیکھے گا۔ صادقوں کو اُن کے صدق کا یقیناً فائدہ ملے گا۔ لیکن بعض دوسرے لوگوں کے لئے یہ کمال حسرت اور افسوس کا دن ہوگا۔ ظالم اپنے ہاتھوں کو اپنے ظلم یاد کر کے کاٹے گا۔ سچائی کے اظہار کا دن۔ وہی دن جس کا وعدہ تمام انبیاء نے دیا تھا۔ کسی کو ایک

دوسرے پر اختیار نہ ہوگا۔ پیروں کی بے بسی اور مُریدوں کی بے کسی دیکھنے کے قابل ہوگی۔ کوئی فدیہ بدلہ اور معاوضہ۔ تعویذ اور گنڈا۔ جنتر منتر کام نہ آسکے گا۔ یہاں تک کہ باپ بھی بیٹے کو نہ بچا سکے گا کہ وہ پیغمبر تھا ولی اور قطب تھا۔ مجرموں کے لئے اس دن کسی طرف سے خوشخبری کی آواز نہ آئے گی۔

انسان میں عدل وانصاف کا تخیل اور دیگر حیوانات

عدل وانصاف کا تخیل صرف نسلِ انسانی سے مخصوص ہے

بنی نوع انسان کے علاوہ دوسرے حیوانات میں اس کی تلاش فضول ہے۔ قدرت نے بھیڑیئے اور بکری، مرغی اور لومڑی، بلّی اور چوہیا، باز اور چڑیا میں کوئی انصاف نہیں رکھا، ہندوؤں اور بُدھوں کے خیال میں انسان اور جانوروں میں بھی انصاف ہونا چاہیئے اور اس گمراہ کن خیال نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ ان کے نزدیک ایک گائے اور کبوتر ذبح کرنے کی پاداش میں انسان کو ذبح کر دینا عین انصاف ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی دھرم شاستر کے اندر خواہ وید ہوں، سمرتیاں ہوں یا بدھوں کے شاستر ہوں ایسا کہیں نہیں لکھا کہ اگر گائے کسی انسان کو سینگ مار کر مار دے تو گائے کو اس جرم میں پھانسی کے تختہ پر لٹکایا جائے گا۔ اگر دونوں کا درجہ جاندار ہونے کی حیثیت سے برابر ہو تو جیسے گئو ہتیا ایک بھیانک جرم ہے اسی طرح گائے یا بیل کا انسان کی جان لینا برابر کا جرم ہونا چاہیئے۔ مگر کبھی نہیں سُنایا گیا کہ دھرم شاستر کی رُو سے کسی گائے یا بیل کو پھانسی دی گئی ہو۔ دوسری طرف دُنیا کی ہر قوم میں بیمار ہونے پر علاج کرانا نہ صرف جائز بلکہ فرض ہے مگر آج کون نہیں جانتا کہ اکثر اور بیشتر بیماریاں جراثیم یا زندہ ننھے ننھے جانوروں کی وجہ سے ہوتی ہیں اور علاج کے معنی ہیں

کران کروڑھا جراثیم کی ہلاکت اور تباہی۔ بے آپ جین مت والوں کی طرح مُنہ اور ناک پر کپڑا باندھ سکتے ہیں لیکن جراثیم پانی، دودھ، ہوا کے ذریعہ اندر جاتے اور کروڑوں اور جراثیم خون کے اندر پیدا کرتے ہیں اگر جراثیم کو ہلاک نہ کیا جائے تو انسان کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ ہمارے جسم میں جہاں زخم ہو جاتا ہے پھوڑا نکل آتا ہے وہاں اَن گنت جراثیم جو ہمارے خون میں سفید ذرات کی شکل میں رہتے ہیں آتے اور باہر کے جراثیم سے جنگ کر کے ہلاک ہوتے ہیں، انسان کا سارا کا سارا جسم جراثیم کُش ہے وہ جراثیم جو باہر سے جسم پر حملہ آور ہوتے ہیں اندرونی جراثیم کے اَن گنت لشکر اُن پر حملہ آور ہوتے مارتے اور مارے جاتے ہیں کوئی ہندو، بدھ یا جینی اس جراثیم کُشی کے خلاف شور نہیں مچاتا۔ کون نہیں جانتا کہ گنوریا سفلس اور کاربنکل کا علاج کرانا بے شمار جیووں کا تہس نہس کرنا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی ناواجب طور پر کوئی چیز اُٹھا لیتا ہے ہر دُنیا کی گورنمنٹ اس جرم کو قابلِ سزا قرار دیتی ہے لیکن اگر گائے کسی غریب خوانچے والے کا سودا سلف چٹ کر جائے تو اس پر مقدمہ چلا کر جیل نہیں بھیجا جاتا اگر جانور کو یہ سمجھ کر معذور سمجھا جاتا ہے کہ یہ بے سمجھ ہے اور کبھی اسے پھانسی کے تختہ پر نہیں لٹکایا جاتا۔

عقل و دانش کے بغیر عدل ناممکن ہے

"Justice is impossible without wisdom."

یہ کس قدر افسوسناک امر ہے کہ مذکورہ مذاہب نے جانوروں کے ساتھ نام نہاد انصاف کا بہانہ کر کے انسانی حقوق پر ڈاکہ ڈالا ہے اسلام کے کے نزدیک نسلِ انسانی میں مساوات ہے لیکن حیوانات میں قدرت

نے ہرگز ہرگز مساوات نہیں رکھی ورنہ گائے بیل بکری بھیڑ مرغی اور چڑیا کے لئے بھی استغاثہ کی عدالتیں قائم ہوتیں اور وہ لوگ جو جانوروں پر اپریشن کرکے اور ان کو انجکشن دے کر انسانی معالجہ کے لئے تجربے کرتے ہیں وہ سب مجرم قرار دیئے جاتے ایسے ہی جیسے ایک انسان کو زہر کھلا کر یا زہریلا انجکشن اس کی مرضی کے بغیر دے کر ارتکاب مجرمانہ کیا جائے۔ ان لوگوں کی جانوروں کے ساتھ ہمدردی غلط اور بے جا فعل ہے اور اس کی اصل وجہ حیوان پرستی (Zoolatry) ہے اس کے خلاف اگر جانوروں کے حقوق انسان پر ایسے ہی سمجھے جائیں جیسے انسان کے باہمی حقوق ادا کرنے ضروری ہیں تو اس کا نتیجہ نسلِ انسانی کی تباہی اور ہلاکت ہوگا بے شک ہم اپنے ہندو بھائیوں اور بدھوں کے ساتھ یہاں متفق ہیں کہ ہمارا فطرتی جذبہ حیوانات کے دُکھ سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہے کہ ہر جان بلا لحاظ دوست اور دشمن ہونے کے قابلِ حرمت ہے یا اعلیٰ اور ادنےٰ کے فرق کے بغیر سب کی حفاظت یا جیو رکھشا ہونی چاہیئے چوہوں اور مکھیوں کو آزادی سے ہمارے گھروں میں رہنے کا حق ہے یا ٹڈی دَل کے حملے کے خلاف انسان کو اپنے اناج کی حفاظت نہ کرنی چاہیئے، کیونکہ ان کی ہلاکت میں ہمارے جذبۂ ہمدردی کی ہلاکت ہے اور جیو ہتیا سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں اور جوں وکھٹمل مارنا۔ طاعون و ہیضہ کا علاج وسیع پیمانہ پر جیو ہتیا کا ہی نام ہے اور ہر ایک مہذب گورنمنٹ ملیریا، طاعون، اور ہیضہ سے انسان کی جان بچانے کے لئے ان جراثیم کو تباہ کرتی ہے کیونکہ انسانی فلاح و بہبود مقدم ہے حیوانی بہتری پر۔ ابتداء دنیا سے انسان اور حیوان کی جنگ چلی آئی ہے اور ہزاروں برس کی جنگ کے بعد انسان نے اپنے

دوست و دشمن دونوں پر فتح حاصل کی ہے تاہم بعض نیم مہذب قوموں میں اب بھی جانوروں کی پوجا ہوتی اور سانپوں تک کو خدائی کا درجہ حاصل ہے۔

کیا یہ جائز ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ دکھ اٹھائے اس لئے کہ حیوانات کو سکھ پہنچایا جائے

انسان فطرتاً جنگل کے قانون کو پسند نہیں کرتا اور اسے خلاف اخلاق، اور تہذیب سمجھتا ہے اگر ہر حیوان برابر کے مساوی حقوق رکھتا ہے کیونکہ انسانی روح ہی تناسخ کے چکر میں پھنس کر کبھی کبھی چوہے، کتے، گدھے کا قالب اختیار کرتی ہے اور بحیثیت حیوان سب برابر ہیں اور یہ نظریہ درست ہے تو انسان کو کہاں تک حق حاصل ہے کہ وہ جانوروں سے مشقت لیں، ان کو زینت اور تفریح کے لئے سدھائیں ان کو داغ لگانا، خصی کرنا ظلم ہوگا، کوئی وجہ نہیں کہ گدھا اینٹیں یا بوجھ اٹھائے۔ ان کے چمڑے اور بال استعمال کرنا ظلم عظیم ہوگا۔ گئو ماتا مر جائے اور اس کی کھال کا جوتا بیٹا پہنے۔ جنگ میں دونوں طرف انسان لڑتے تھے مگر یہ کہاں تک جائز تھا کہ انسانی جنگوں میں گھوڑوں کو جھونکا جائے۔ جو ویدوں کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا بلکہ قابل تعریف سمجھا جاتا تھا حیوان پرستی اور جیو ہتیا کے خیال نے انسان کے اندر اپنی نوع کا احترام اور عزت کم کر دی ہے اور بڑے دھرماتما لوگ کتوں کو گھی کے پراٹھے کھلانا بھوکے انسان کو سوکھی روٹی دینے کی نسبت زیادہ ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ رحمدلی اور سنگدلی کا یہ ملا جلا جذبہ ہندو زندگی میں سب جگہ نظر آتا ہے۔ گوالیار کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک برہمن ایک موٹی تازی گائے کو گھی کے پراٹھے کھلا رہا تھا کہ اتنے میں ایک دبلا پتلا، ہڈیوں کا ڈھانچ ہندو نے اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا میں

بالکل بھوکا ہوں ایک روٹی کا سوال کیا۔ برہمن نے اس کی طرف غضبناک آنکھوں سے دیکھا کہ یہ وہ گھی کا پراٹھا مانگتا ہے جو میں گئو ماتا کو کھلا رہا ہوں، بھوکا انسان ڈر کر پیچھے ہٹ گیا کہ اتنے میں برہمن کا ایک دوست آگیا اور دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے موقعہ پاکر فقیر نے روٹی کا بھورچور جو گائے کے منہ سے گر گیا تھا جلدی سے اٹھا کر کھانا شروع کر دیا برہمن نے جو مڑ کر دیکھا تو غریب بھوکے فقیر کی پیٹھ پر اس زور سے ڈنڈا مارا کہ بے چارا چیختا چلّاتا چلا گیا۔ جس طرح اس قسم کے واقعات ہندو قوم میں روزمرہ نظر آتے ہیں اسی طرح بنی اسرائیل صرف اپنے آپ کو انسان بلکہ ماوراء الانسان سمجھتے ہیں، اور دوسری اقوام عالم کے انسانوں کو کتوں کی طرح ذلیل جانور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام کے متعلق انجیل میں لکھا ہے۔

"ان بارہوں کو یسوع نے فرما کے بھیجا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے بنی اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ۔ اور چلتے ہوئے منادی کرو اور کہو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی۔" (متی، ۱۰: ۵ تا ۷)

یہاں صاف طور پر اپنی روحانی روٹی کے حقدار بنی اسرائیل یا اپنی قوم کو قرار دیا ہے ایک اور جگہ غیر قوموں کے حق میں اس سے بھی سخت الفاظ استعمال کئے چنانچہ لکھا ہے:۔

"تب یسوع وہاں سے روانہ ہو کے صور اور صیدا کی اطراف میں گیا اور دیکھ ایک کنعانی عورت وہاں کی سرزمین سے نکل کر اسے پکارتی ہوئی چلی آئی کہ اے خداوند

داؤد کے بیٹے مجھ پر رحم کر کہ میری بیٹی ایک دیو کے غلبہ سے بے حال ہے۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا تب اس کے شاگردوں نے پاس آکر اس کی منت کی کہ اسے رخصت کر کیونکہ وہ ہمارے پیچھے چلاتی ہے اس نے جواب میں کہا میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ پر وہ آئی اور اسے سجدہ کر کے کہا اے خداوند میری مدد کر۔ اس نے جواب دیا، مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو پھینک دیویں۔ اس نے کہا سچ اے خداوند، مگر کتے بھی جو ٹکڑے ان کے خداوند کی میز سے گرتے ہیں کھاتے ہیں۔" (متی، ۱۵ : ۲۱ تا ۲۷)۔

پھر اس کی تائید میں فرمایا:۔

"وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو، اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو، ایسا نہ ہو کہ وہ انہیں پامال کریں، اور پھر کر تمہیں پھاڑیں۔"

(متی ۷ : ۶)۔

غیر اقوام کی عورتوں کے متعلق مہذب اقوام کے گڈریے نے فرمایا:۔

"پہلے فرزندوں کو سیر ہونے دو کیونکہ فرزندوں کی روٹی لے کے کتوں کے آگے ڈالنا لائق نہیں اس نے جواب میں کہا ہاں اے خداوند لیکن کتے میز کے

تلے فرزندوں کی روٹی کے ٹکڑوں میں سے کھاتے ہیں۔"

(مرقس ۷: ۲۷-۲۸)

غیر اقوام کے متعلق اس قسم کے خیالات اور احکامات کی موجودگی میں کیونکر ممکن ہے کہ ایک قوم یا مذہب دوسری اقوام اور مذاہب کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرسکے رَبِّ الْعَالَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ خدا کے سوا اور اس قوم کے سوا جو ایسے خدا پر ایمان لاتی ہے کہ وہ رَبُّ الْعَالَمِیْن ہے نسل انسانی کے لئے مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہی حقیقی عدل اور انصاف کرسکتا ہے۔ مشرق میں ایک طرف اگر حیوان پرستی (Zoolatry) نے اگر دھرم شاستر کی میزانِ عدل کو انسان کے بالمقابل جھکا رکھا ہے تو دوسری طرف مغرب میں اسرائیل مذہب نے انصاف کے پلڑے کو غیر اسرائیلی قوموں کے حق میں دبا رکھا ہے۔

مغربی اقوام کا میزان عدل

گذشتہ صدی میں مسئلہ ارتقاء کی تفصیلات نے مغربی اقوام کا زاویہ نگاہ اور بھی کج کر دیا اور اس کی وجہ درحقیقت وہ رنگین عینک تھی جو مسیحی مذہب نے انہیں عطا کی تھی۔ کہ دنیا میں بعض قومیں خدا کا اکلوتا منہ بولا بیٹا ہیں اور باقی اقوام انسانیت کے درجہ سے گر کر ناپاک کتوں کے برابر ہیں۔ مسئلہ ارتقاء پر سب سے زیادہ بحث کرنے والا ڈارون تھا جس نے بنی نوع انسان میں ارتقاء کو ایک ایسا خط مستقیم سمجھ لیا جس کی تہ میں حبشی (رنگدار) اقوام اور چوٹی پر (خدا کے قریب) گوری اقوام ہیں اس خیال نے جرمنی کی نازی حکومت کو دنیا کے خلاف گمراہ کیا کہ آرین خون کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ دنیا پر حکومت کرے

اور وہ اپنے رنگ کی وجہ سے ساری نسل انسانی پر تفوق اور فضیلت رکھتا ہے اگر جرمنی کو گذشتہ جنگ میں شکست نہ ہو جاتی تو دنیا کے اندر رَبُّ الْعَالَمِیْن کی پرستش کی بجائے آرین قوم کا نسلی بُت سب جگہ پوجا جاتا کیونکہ فرض یہ کیا گیا تھا کہ اولادِ آدم کی ایک نسل بندر کے بالکل قریب ہے اور دوسری فرشتوں سے کچھ ہی نیچے ہے۔ خدا کی قدرت ہے جن کو یہ تکبّر اور غرور تھا کہ وہ فرشتوں سے کچھ ہی کم ہیں جب ان کے خط و خال رنگ و روغن اور جسمانی خصوصیات کا مقابلہ کیا گیا تو ثابت ہوا کہ دراصل وہ خود بندر سے بہت کم مختلف ہیں۔ بندروں کی اعلیٰ نسل کی جلد کا رنگ گورا ہے گندمی اور سیاہ نہیں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ بندروں کے جسم پر بال بکثرت ہیں اور دنیا میں گوری قوم سب سے زیادہ Hairiest بالوں والی ہے۔ بندروں اور گوری قوموں میں تیسری مشابہت ہونٹوں کا باریک ہونا ہے حبشی قوموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ہونٹ موٹے ہوتے ہیں۔ چوتھی مشابہت بندر اور گوری قوموں میں ناک کی بناوٹ ہے۔ ستواں ناک بندر اور گوری قوموں میں وجہ مشابہت ہے۔ حبشی اقوام کی ناک چپٹی اور موٹی ہوتی ہے۔ پانچویں مشابہت کانوں کی ہے۔ حبشی قوموں کے کان بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ مگر بندر اور گوری قوموں کے کان چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔

جلد کی رنگت سفید ہونا

قرآن مجید دنیا کی الہامی کتابوں میں سے ایک بے نظیر کتاب ہے جس نے ایک ایک کر کے ان تمام خصوصیات کی تردید کی ہے جو کسی قوم اور مذہب کے خیال میں اس کی نسلی و قومی۔ لونی جغرافیائی خصوصیات کے

لحاظ سے برتری اور فضیلت ظاہر کرتی خیال کی جاتی ہیں قدیم زمانہ سے لے کر اس وقت تک رنگ کی برتری کا سوال ہمیشہ ہمیشہ لوگوں کے دماغ میں جاگزین رہا ہے آریہ قوم کا ورن اور رنگ کے اعتبار سے کالی قوموں پر انرا نا ویدوں کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک برابر قائم ہے آریہ ورن اور کرشن جاتیوں (کالی قوموں) میں ہمیشہ سے جنگ چلی آتی ہے۔ آریہ قوم نے جو سوتر گرنتھ اور سمرتیاں قانون کے نام سے شائع کیں ان میں کالی قوموں کے خلاف اظہار نفرت اور سختی کو لازمی قرار دیا ہے۔ قرآن مجید رنگ کے اس فریب دہ تخیل سے ناواقف نہ تھا اس لئے اس نے اختلاف الوان پر حکیمانہ بحث کی ہے۔

قرآن مجید میں رنگوں کا فلسفہ

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ (۳۵: ۲۷، ۲۸)۔

(۱) "کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے پانی اتارتا ہے، پھر ہم اس کے ساتھ مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتے ہیں۔"

(۲) پھر درمیانی الفاظ ہیں: وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ، جن کا ترجمہ عموماً اس طرح کیا جاتا ہے: "اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ خطے ہیں جن کے مختلف رنگ ہیں اور (بعض) نہایت سیاہ ہیں۔"

(۳) اور آخر میں ہے: "اور لوگوں میں سے اور جانداروں میں سے اور چار پایوں میں سے اسی طرح ان کے رنگ مختلف ہیں۔"

اب ہم ان آیات کے درمیانی ٹکڑے کا تجزیہ اور تشریح کرتے ہیں جس کا عام ترجمہ اوپر نمبر (۲) میں درج کیا جا چکا ہے:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ۔

(۱) واؤ جو ان الفاظ کا پہلا حرف ہے، اسے مفسرین نے واؤ مستانفہ لکھا ہے، گویا ان الفاظ کا کوئی تعلق ان سے پہلے الفاظ سے نہیں۔ لیکن بالعموم واؤ عاطفہ ہوتی ہے جو دوسرے جملہ کو پہلے جملہ کی طرف لوٹاتی ہے یا سننے والے کو پہلے جملہ کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ یہاں بھی واؤ عاطفہ ہے جو ان الفاظ کو پہلے جملہ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً کی طرف لوٹاتی ہے (یعنی الفاظ "مِنَ الْجِبَالِ" بھی "اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ" کی طرف لوٹتے ہیں)۔ اس بنا پر رنگوں کے متعلق یہ ایسا فلسفیانہ مضمون ثابت ہوتا ہے جو موجودہ علمی تحقیقات کے عین مطابق ہے، مگر آج سے چودہ سو سال پہلے دُنیا کا کوئی فلاسفر اس علمی تحقیق سے واقف نہ تھا۔ پس اس امر واقعہ کو زیر نظر رکھ کر یہ ایک بسیط دلیل ہے اس امر کی کہ قرآن مجید فی الحقیقت عالم الغیب کا کلام ہے اور محمد رسول اللہ صلعم سچے رسول ہیں۔

(۲) اس آیت میں ایک دوسری واؤ جو بِيْضٌ اور حُمْرٌ (سفید اور سرخ) کے درمیان میں ہے وہ واؤ بھی عاطفہ ہے مگر اس میں عطف خاص علی العام ہے۔ سفید اور سرخ دونوں رنگوں میں عام کا عطف خاص پر ڈالنے سے قرآن مجید نے فلسفہ رنگ کے ایک اور علمی انکشاف

کا اظہار کیا ہے۔ جو زمانہ حال کی تحقیقات الوان کا ایک مستقل باب ہے۔

(۳) اس آیت میں تیسری واؤ بھی عاطفہ ہے مگر مغائرت کی واؤ کہلاتی ہے جس کی رو سے غرابیب سود (سیاہ رنگ) کو رنگوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے، اور یوں محمد رسول اللہ صلعم کی صدق رسالت پر ایک اور Scientific اور علمی برہان پیش کی ہے کیونکہ اس حقیقت کو عوام تو کیا، اب بھی اہل علم لوگ ہی جانتے ہیں۔

(۴) مِن : حرف "من" قواعد عربیہ کی رو سے ابتداء الغایۃ کے لئے ہو تو بھی رنگوں کی جدید تحقیقات پر روشنی ڈالتا ہے اور اگر تبعیض یا تبین کے لئے ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کو ظاہر کر کے بالواسطہ قرآن مجید کی صداقت علمیہ پر دلیل ہے۔

(۵) اَلْجِبَال : جبال پہاڑوں کو بھی کہتے ہیں (جیسا کہ ان الفاظ کے عام ترجمہ میں اوپر دیا گیا ہے)۔ ان میں رنگوں کا نفوذ و اثر خاص ہے۔ کبھی جِبَال سے مراد کسی شئے کی تکثیر قوت اور تعظیم ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے اس شئے کی عظمت، قوت اور کثرت کو ظاہر کیا ہے جو رنگوں کو لے کر آسمان سے اترتی ہے۔

قرآن مجید میں جِبَال سے مراد بادل بھی ہیں، جیسا کہ فرمایا:۔ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ (۲۴ : ۴۳) "اور اللہ آسمان سے بادل (جِبَال) بھیجتا ہے جن میں اولے ہیں" میلوں موٹی برفانی بادلوں کی تہ میں سے گزار کر رنگ پیدا کرنے والی شئے (سورج کی شعاؤں) کو ٹھنڈا کر کے زمین پر پہنچانا، اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی کتنی حکمتیں اور دانائیاں پوشیدہ ہیں، اسے موجودہ زمانہ کا

ہیئت دان ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔

(۶) جُدَدٌ : قطع، ٹکڑے، طریق، سریع السیر (تیز چلنے والے)۔ یہ سارے معنی رنگوں اور روشنی کی تحقیقِ جدید پر روشنی ڈالتے ہیں۔

(۷) بِیْضٌ : سفید جمع کے صیغہ میں۔ یہ لفظ عربوں کے احساس الوان کے کمال پر دلالت کرتا ہے اور عربی زبان کے کامل زبان اور محمد رسول اللہ صلعم کے آخری نبی ہونے پر گواہ ہے۔

(۸) حُمْرٌ : سرخ جمع کے صیغہ میں۔ یہ بتانے کے لئے ہے کہ سرخ رنگ بھی ایک نہیں، بلکہ اس کے بھی کئی درجے ہیں۔ رنگوں کے سلسلہ میں اسے آخر پر رکھنے اور اس پر "مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا" کو ختم کر دینے میں قرآن مجید نے ایک ایسے کمال کا اظہار کیا ہے جس سے اہل علم ہی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

(۹) مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا : بغیر واؤ مغائرت "مختلف الوانہا" ("اس کے مختلف رنگ") میں ھا کی ضمیر بیضٌ اور حمرٌ دونوں کی طرف پھرتی ہے۔ Physics جاننے والے قرآن مجید کے اس اعجاز علمی کو دیکھ کر اس کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ رنگوں کے زوج زوج ہونے کی دلیل ہے۔ یہ انکشاف رنگوں کے متعلق حال ہی کے زمانہ میں ہوا ہے۔

(۱۰) غَرَابِیْبُ سُوْدٌ : "نہایت سیاہ" مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا (مختلف رنگوں) کا ذکر کر دینے کے بعد واؤ مغائرت دے کر سیاہ کو رنگوں سے الگ کر دینا اور پھر غرابیب سود کی ترکیب میں جو بصیرت موجود ہے اس میں علماءِ سائنس کے لئے ایک بہت بڑی

دلیل موجود ہے جو نہ صرف سیاہ کو رنگ قرار نہیں دیتی، بلکہ سیاہ کی بلیغ کیفیت بھی اس کے اندر مستور ہے۔ جو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر ایک روشن برہان ہے۔

آیات کے معنی کا خلاصہ

جس آیت پر ہم غور کر رہے ہیں:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ، اس کے معنی بنتے ہیں :

"کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے پانی اتارتا ہے، پھر ہم اس کے ساتھ مختلف اقسام کے پھل پیدا کرتے ہیں، آسمان اور بادلوں سے تیز رفتار لہریں نازل کرتا ہے جو سفید اور سرخ مختلف رنگوں کی ہیں اور نہایت سیاہ ہیں۔"

آیت کو "اَلَمْ تَرَ" کے خطاب سے شروع کیا یعنی "کیا تو نے غور نہیں کیا" گویا اس میں بہت ہی قابل غور بات بیان کی گئی ہے۔ مخاطب کو اس طرح متوجہ کرنے میں بتانا یہ مقصود ہے کہ آنکھوں کے سامنے کیسا ہی دلربا نظارہ ہو، حقائق اور حکمتوں سے پُر خوبصورت منظر ہو، دانائی اور دانشمندی کے دفتر ہوں، مگر اندھی آنکھ اور بے نور دل کے لئے یہ سب کچھ بے کار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے دراصل عالم دو ہیں۔ ایک اس کے خارج میں ایک بیرونی دنیا ہے اور ایک اس کے اندر اس کے علم کی دنیا ہے۔ اس خارجی دنیا اور اندرونی دنیا کے درمیان آنکھیں دروازے ہیں

جن کے راستے خارجی دنیا اپنے حقائق اور معارف کے ساتھ ہمارے اندر داخل ہوتی ہے۔ انسان کے لئے ان دروازوں کی اہمیت ظاہر ہے مگر ان کی قیمت صرف اسی وقت معلوم ہوتی ہے جب ان کے پیچھے انسانی ضمیر بھی بیدار ہو، اور سب سے زیادہ قیمت اس وقت سمجھی جاتی ہے جب دماغ کے اندر علم کا خزانہ موجود ہو۔ علم کی روشنی سے کسی چیز کو دیکھنا ہی غور کہلاتا ہے۔ ہر شخص اپنی زندگی سے اسی قدر فائدہ اُٹھا سکتا ہے جتنا اس نے اپنے علمی خزانہ یا دماغی بینک میں جمع کر رکھا ہے۔ اس بینک سے جمع شدہ رقم سے زیادہ نکلوانا قریباً قریباً محال ہے۔

"اَلَمْ تَرَ" کے اصل مخاطب یہاں علماءِ سائنس ہیں جنھوں نے اپنے دماغ میں تجربات کے ذریعہ علم کا خزانہ جمع کر لیا ہے۔ وہ علمی خزانہ کی مدد سے قرآن مجید کی اس آیت کا مطالعہ کریں گے تو ان کو سائنس محمد رسول اللہ صلعم کے قدم چومتی نظر آئے گی، مگر کم علم جاہل اور غور و فکر نہ کرنے والے شخص کے لئے شاید اس میں کوئی حکمت اور خوبی نظر نہ آئے، جس طرح اس شخص کو جو رنگ کا اندھا ہے دُنیا کی ہر چیز سیاہ اور تاریک نظر آتی ہے۔ آیت مذکورہ پر اہل علم کو غور و فکر کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ صلعم کے دل کو یوں تسلی دی ہے:

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (۳۵:۲۵)

اگر کچھ احمق لوگ اپنی نابینائی، بے بصیرتی اور جہالت کی وجہ سے تجھے جھٹلاتے ہیں، ان کے لیے تو یہی جواب مسکت ہے کہ ان سے پہلے لوگوں کے بھی اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا حالانکہ وہ ان کے پاس کھلے دلائل، صحائف اور روشن کتابوں کے ساتھ آئے تھے۔ مگر محمد رسول اللہ صلعم

کے دل کو اور کسی مسلمان کے دل کو صرف اتنی بات سے تسلی نہیں ہو سکتی کہ پہلے بھی لوگوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تھا۔ اس لئے اس کے بعد کچھ سائنٹیفک Scientific دلائل دے کر فرماتا ہے:۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا

جاہل اگر آپ کی تکذیب کرتے ہیں تو آپ غمگین نہ ہوں، بڑے بڑے علماء، قرآن مجید کے ان سائنٹیفک Scientific دلائل کو دیکھ کر نہ صرف اسلام لائیں گے بلکہ معرفت اور خشیۃ اللہ کے مقام پر پہنچیں گے۔

ان آیات کا اخلاقی پہلو

اوپر حقائق عشرہ میں میں نے الفاظ کی خوبصورتی اور علمی بصائر کی طرف صرف اشارہ کیا ہے جس سے عیاں ہے کہ آیت میں حسنِ الفاظ اور فلسفیانہ مضامین کو باہم سمو دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس عبارت کا Ethical View یا اخلاقی پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ جس طرح بادی النظر میں بعض رنگ خوبصورت اور بعض ناپسند خاطر ہوتے ہیں، بعض صحت افزا اور بعض دائمی امراض ہوتے ہیں، اسی طرح ان رنگوں میں تین رنگ اخلاقی لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سفید جو صلح، امن، نیکی اور عزت کا رنگ ہے، سرخ جو خطرہ اور جنگ کی علامت ہے اور سیاہ جو بدی اور جہالت کا رنگ ہے۔ قرآن مجید میں نیکی کا رنگ سفید بتایا گیا ہے اور سرخ رنگ خطرہ اور جنگ کا رنگ ہے اور سیاہ بدی، ذلت اور غم کا نشان ہے۔ مگر اس آیت میں اخلاقی نکتہ نگاہ سے ایک عجیب مضمون بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں علماء کو بھی جبال کہا گیا ہے جن سے علم کی نہریں جاری

ہوتی، حقائق کے چشمے پھوٹتے اور معارف کے دریا بہتے ہیں:

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهَارُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (۲: ۷۴)

"اور یقیناً پتھروں میں سے ایسے بھی ہیں کہ ان سے نہریں بہتی ہیں، اور بے شک ان میں ایسے بھی ہیں کہ پھٹتے ہیں تو ان میں سے پانی نکلتا ہے، اور بے شک ان میں سے ایسے بھی ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں۔"

مگر یہ نہریں ماء معین کی بیضاء لذة للشاربین، نہایت سفید رنگ کی نیکی کی اور لذت روح کی بھی ہو سکتی ہیں۔ سرخ خطرہ اور خون کی بھی ہیں جو امن سے بھری ہوئی دنیا کو شعلہ زار بنا دیتی ہیں۔ اس لئے اس آیت کے مضمون کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اسی طرح "غرابیب" علماء کا نام بھی ہے جن سے بدی کی سیاہ تحریکیں، فسق و فجور اور غلط گمراہ کن فلسفے اور ان کی موجیں اٹھتی ہیں:

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ الخ

"اس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ منہ سیاہ ہوں گے۔ پس جن لوگوں کے منہ سیاہ ہوئے، کیا تم اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے؟ سو تم عذاب چکھو اس لیے کہ تم کفر کرتے تھے۔ اور جن کے منہ سفید ہوئے وہ اللہ کی رحمت میں ہیں، وہ اسی میں رہیں گے۔" (۳: ۱۰۵، ۱۰۶)

اس آیت سے پہلے یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے اور مومنوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہے۔ جو لوگ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کر سکتے ان کا رنگ سیاہ ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کو Colour Blind یعنی رنگ کے اندھے کہا جاتا ہے۔

ہستی باری تعالیٰ اور آنحضرت صلعم کی صداقت کے دلائل مشترک ہیں

قرآن مجید کی متعدّد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلافُ الوان (رنگوں کا اختلاف) اللہ تعالیٰ کی ہستی، اس کی قدرت اور حکمت پر ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ اس دلیل کا محمد رسول اللہ صلعم کی وحیِ مبارک میں اُس وقت ذکر کیا جانا جبکہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا فلاسفر رنگوں کے اس فلسفہ کو نہ جانتا تھا، آنحضرت صلعم کی صداقت کا بہت بڑا نشان ہے۔ ایک اُمّیٔ محض، دُنیا کے علوم سے ناواقف، نے ایک اَن پڑھ لوگوں کے ملک میں جو ہر قسم کی علمی روشنی سے محروم تھا ایسا فلسفہ بیان کیا جو علماءِ سائنس کی بتدریج اور مسلسل تحقیقات سے آپؐ کے ایک ہزار سال بعد معلوم ہوا۔ اور اس کے معلوم کرنے والے کو علم و فضل کے انتہائی مرکز میں دُنیا کا سب سے بڑا انسان خیال کر کے اس کی قبر پر یہ کتبہ کندہ کیا گیا:

"یہ اُس شخص کی قبر ہے جو دُنیا میں سب سے بڑا انسان تھا" سر اسحاق نیوٹن وہ شخص تھا جس نے ۱۶۹۰ء میں سب سے پہلے اس راز کا انکشاف کیا کہ سفید روشنی جو آسمان سے بظاہر بے رنگ اترتی ہے (کیونکہ تمام زبانوں کا یہ محاورہ ہے کہ فلاں چیز رنگدار ہے یا سفید) سارے رنگوں

سے مرکب ہے۔ نیوٹن نے منشور مثلثی میں سے رنگوں کو گذرتے اور رنگوں کا تجزیہ ہوتے دیکھ کر یہ معلوم کیا کہ سفید روشنی درحقیقت رنگوں کا ایک مرکب ہے۔ منشور مثلثی میں سے گذرتے ہوئے روشنی سب سے پہلے گہرا نیلا رنگ (Violet دکھاتی ہے۔ اس کے بعد ترتیب وار دوسرے رنگوں کی دھاریں نظر آتی ہیں اور بالآخر سرخ پر یہ رنگ ختم ہو جاتے ہیں۔ اس تجربہ کی بناء پر یہ کہا گیا ہے کہ جب کسی پتھر وغیرہ شئے پر روشنی پڑتی ہے تو وہ شے کچھ رنگوں کو جذب کر لیتی ہے اور کسی ایک رنگ کو وہ شئے جذب نہیں کرتی اور اس کی شعاعوں کو واپس لوٹا دیتی ہے۔ یہی شعاعیں ہماری آنکھ کی پتلی کے ساتھ ٹکرا کر ہمیں اس شئے کا رنگ بتاتی ہیں۔ مگر کامل تاریکی کے اندر کسی شئے کا کوئی رنگ نظر نہیں آتا۔

اس میں جو امر قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ رنگ فی الحقیقت روشنی کا لباس پہن کر آسمان سے اترتے ہیں۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جو سر اسحاق نیوٹن سے پیشتر کہا جاتا ہے کہ دنیا کو معلوم نہ تھا، مگر محمد رسول اللہ صلعم پر جو علم خدا کی طرف سے نازل ہوا اس میں عالم الغیب خدا کی ہستی پر ایک بیّن دلیل کے علاوہ علماءِ سائنس پر صداقتِ آنحضرت صلعم ظاہر کرنے کے لئے نیوٹن سے ایک ہزار سال پہلے اس علمی انکشاف کا اظہار کر دیا گیا۔ نیوٹن نے تو صرف قرآن مجید کی سچائی کو اپنے Scientific تجربہ سے ثابت کیا۔

ان آیات میں دیگر حقائق

۱۔ رنگوں کی بارش آسمان سے ایسے ہی ہوتی ہے جیسے پانی کی

سفید روشنی
سرخ رنگوں

کو لے کر آسمان سے ایسے ہی نازل ہوتی ہے جیسے بادلوں سے بارش نازل ہوتی ہے۔ یہ ایک اور حقیقت ہے جس کا اظہار اس آیت میں کیا گیا ہے آج سے ۲۵۰ برس پہلے کوئی شخص رنگوں کے متعلق یہ نظریہ نہ رکھتا تھا مگر قرآن مجید کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی آیت میں اس دونوں قسم کی بارش کا ذکر کر دیا گیا ہے تا اہلِ علم غور کریں کہ اس کے اندر نہ صرف عالم الغیب خدا کا علم موجود ہے بلکہ اس کے اندر اس کی کامل حکمت بھی موجود ہے۔ روشنی در حقیقت وہ حرارت اور شعلہ ہے کہ جس کی شدت کو دُنیا کی کسی آگ کی تیزی کے ساتھ نسبت نہیں دی جا سکتی اگر وہ شعلہ براہ راست زمین پر پہنچ جاتا تو زمین کی کسی چیز کو جلائے اور گیس بنائے بغیر نہ چھوڑتا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت زمین کے جانداروں پر کتنی مہربان ہے کہ اس آگ کو اولوں اور بادلوں کے میلوں لمبے پہاڑوں اور ہوا کی فضاء میں سے گزار کر ٹھنڈا کر کے پہنچایا جاتا ہے اور پھر اسی حرارت سے زمینی پانی کے بخارات اُڑا کر بادل بنائے جاتے ہیں۔ ایک طرف قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھو اور دوسری طرف ایک سائنس دان کے اِن الفاظ کو پڑھو:۔

"The light is pouring down from the sky as certainly as if it consisted of rain drops, but with vastly greater speed."

۲۔ روشنی یا رنگوں کے مرکب کی تیز رفتاری

یہ امر بھی زمانۂ حال

کی تحقیق ہے کہ روشنی کی رفتار فضا میں نہایت تیز ہوتی ہے۔ جُدَد کے معنی تیز رفتار لہریں ہیں۔ جس طرح اجداد سے اولاد کی لہر اُٹھتی ہے اسی طرح آسمان سے روشنی کی لہریں اُٹھتی ہیں مگر اس کے معنی سریع السیر بھی ہیں یعنی یہ لہریں نہایت تیز رفتار ہیں یہاں تک کہ ان کی رفتار کا اندازہ فی سکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل ۱۸۶،۰۰۰ کیا گیا ہے۔

۳۔ جس طرح زمین مینہہ کے برسنے پر مختلف اقسام کے پھل نکالتی ہے اسی طرح روشنی کی بارش مختلف اشیاء پر گر کر مختلف رنگ پیدا کرتی ہے۔

۴۔ پھلوں کا مختلف اقسام پر ہونا زمین کی حیثیت کے مطابق ہوتا ہے اگرچہ بارش کی لطافت میں تفاوت نہیں ہوتا۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید در شورہ بوم و خس

اسی طرح روشنی میں اختلاف نہیں مگر زمین کی ہر شئے کچھ رنگوں کو جذب کر لیتی ہے اور کسی ایک رنگ کو قبول نہیں کرتی اور واپس لوٹا دیتی ہے اس کی موجیں ہماری آنکھوں سے ٹکراتی اپنا عکس ڈالتی ہیں یہی اس شے کا رنگ کہلاتا ہے۔

۵۔ جو رنگ کسی شئے میں جذب ہو جاتے ہیں وہ اپنے نفوذ، اثر اور انرجی سے اشیاء میں کیمیاوی تغیرات پیدا کر کے ہمارے لئے اشیاء تیار کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے نظام قدرت میں بے شمار قسم کے روشنی جذب کرنے والے ریسیونگ اسٹیشن موجود ہیں جو روشنی کی مختلف سائز کی لہروں کو مختلف کیمیاوی مرکبات میں تبدیل کرتے ہیں اور

نامقبول لہریں انسانی آنکھ سے ٹکرا کر دماغ میں مختلف رنگوں کا احساس پیدا کرتی ہیں مثلاً نارنگی کا چھلکا ہمیں سرخ نظر آتا ہے مگر اس کی سرخی درحقیقت مرکری سلفائڈ (پارہ سفوف) ہے۔ ہمیں اس لئے سرخ نظر آتا ہے کہ بچپن سے ہم اشیاء اور ان کے رنگ کو خارجی چیز سمجھتے چلے آئے ہیں مگر دراصل رنگ صرف ہمارے دماغ میں موجود ہے خارج میں نہیں۔

۶۔ زیر نظر آیت کے دونوں حصوں میں پانی کی بارش اور رنگوں کی بارش میں مماثلت اور مشابہت دکھائی گئی ہے وجوہ مماثلت تین ہیں۔

(ا) فیضانِ الٰہی بارش اور روشنی فاعل ہے۔

(ب) جس چیز پر بارش ہوتی یا روشنی پڑتی ہے مفعول ہے۔

(ج) نتائج اور ثمراتِ بارش اثر اور فعل ہے پھر اس دونوں قسم کی بارش کو الہام الٰہی کے ساتھ مماثلت ہے۔ جو دراصل موضوعِ بحث ہے۔ گویا الہامِ الٰہی ایک اور فیضانِ الٰہی ہے جو دلوں کی سرزمین پر روحانی نتائج پیدا کرتی ہے رنگوں کا تعلق انسان کی حس باصرہ کے ساتھ ہے مگر الہامِ الٰہی کی بارش کا تعلق انسان کی بصیرت کے ساتھ ہے۔ دُنیا کا کوئی عقلمند زمینی تغیرات کے لئے پانی اور روشنی کا انکار نہیں کرسکتا اور نہ اس امر کا قائل ہو سکتا ہے کہ بعض قوموں اور خطوں کو بارش اور روشنی کی ضرورت ہے مگر بعض کو نہیں اور نہ ان نتائج کا انکار کرسکتا ہے جو بارش سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر مذہب کے بارہ میں دہریوں اور الہامِ الٰہی کے منکر لوگوں کے یہ خیال کیسے عجیب ہیں کہ اخلاقِ روحانی بغیر کسی روحانی بارش کے پیدا ہو سکتے ہیں اور دُنیا میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسےٰؑ، حضرت مسیحؑ، حضرت زرتشتؑ، جناب بُدھ اور کرشن

علیہم السّلام جیسے بزرگ اور معلّمانِ اخلاق بغیر فیضانِ الٰہی پیدا ہو گئے تھے۔

بعض اہلِ مذاہب کا یہ خیال بھی عجیب ہے کہ بارش اور روشنی کا فیضان کسی خاص قوم سے مختص نہیں مگر روحانی بارش ایک قوم اور ملک سے مخصوص ہے۔

۷۔ دہریہ اور لامذہب لوگ عموماً مذہب کے منکر اس لئے ہوتے ہیں کہ مذاہب میں اختلاف ہے اگر مذہب خدا کی طرف سے ہوتا تو اس میں اختلاف نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اگرچہ یہ خیال کرتے ہوئے وہ مذاہب میں جو عظیم الشان اتحاد ہے اسے نظرانداز کر دیتے ہیں تاہم انہیں اس امر پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ بارش اور روشنی کے اثرات اور نتائج مختلف قطعات زمین اور اشیاء پر مختلف ہوتے ہیں کیونکہ ہر شئے کی قوتِ جاذبہ مختلف ہے اسی طرح مذہب جو دراصل صبغۃ اللہ سے مختلف طبائع پر اپنا اثر اور نتیجہ مختلف پیدا کرتا ہے صبغۃ اللہ میں اختلاف نہیں اختلاف فی الحقیقت قلوبِ انسانی میں ہے۔

رنگوں کے متعلق عالمگیر غلط فہمیاں

اقوامِ عالم کی زبانیں جو نسلِ انسانی کی تہذیب اور تمدن کے مختلف اَدوار اور طبقات کی آئینہ دار ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نظریۂ الوان کے متعلق دُنیا سات درجوں سے گزری ہے۔

(۱) ابتدا میں رنگوں کو اشیاء سے الگ نہ سمجھا جاتا تھا۔

(۲) دوسرے درجہ میں روشنی اور تاریکی کا خیال پیدا ہوا۔

(۳) تیسرے دور میں روشنی اور تاریکی (سفیدی اور سیاہی) کے علاوہ سرخی کا مفہوم بھی پیدا ہوا۔

(۴) چوتھے دور میں سرخ کے علاوہ زرد رنگ کا تخیل بھی پیدا ہوا۔
(۵) پانچویں درجہ میں زرد رنگ سے سبز رنگ مختلف سمجھا جانے لگا۔
(۶) چھٹے دور میں نیلے رنگ کا خیال پیدا ہوا۔
(۷) ساتویں دور میں نیوٹن نے سات رنگوں کا نظریہ پیش کیا جو اس عالم کے علم پر ایک سیاہ دھبہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس وقت رنگوں کی تعداد دس ہزار تک جا پہنچی ہے۔ اس وقت بھی تہذیب انسانی کی ادنیٰ اقوام میں سرخ نارنجی اور ارغوانی کا صرف ایک یعنی سرخ نام ہے سفید زرد اور سبز کو صرف ایک یعنی سفید نام دیا جاتا ہے سیاہ نیلے اور آسمانی کو صرف سیاہ ہی کہا جاتا ہے۔

رنگ کی اندھی قومیں

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ اقوام عالم کی زبانیں ان کے اَدوار تمدن و تہذیب کی آئینہ دار ہیں اور قومیں رنگوں کے علم کے لحاظ سے سات درجوں سے گذر چکی ہیں۔ بعض زبانوں کے اندر رنگ کے لئے کوئی مخصوص نام نہیں چنانچہ عبرانی زبان کی لغت اور بائیبل میں رنگ کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ بائیبل کے انگریزی وغیرہ تراجم میں جس لفظ کا ترجمہ رنگ کیا گیا ہے اس میں رنگ کا مفہوم موجود نہیں چنانچہ انسائیکلو پیڈیا بیلیکا (Encyclopaedia Biblica) میں کلر Colour کے زیر عنوان لکھا ہے:

"When a Hebrew writer wishes to compare one object with another in respect to its colour, he finds it necessary to use the word "**AYIN**" in the sense of appearance."

"عبرانی مصنف جب ایک چیز کا فرق بلحاظِ رنگ دوسری شے سے بیان کرنا چاہتا ہے تو وہ لفظ 'عین' استعمال کرتا ہے جس کے اصل معنی صرف ظاہری صورت کے ہیں۔"

نہ صرف رنگ کا مفہوم ظاہر کرنے والا کوئی لفظ عبرانی زبان میں موجود نہیں استعارتاً بھی صرف تین ہی رنگوں کا اشارہ بائیبل میں موجود ہے اس بنا پر عبرانی قوم کو "Colour blind people" امتیاز رنگ میں اندھی قوم کہا جاتا ہے۔

آں حضرت صلعم کی نبوّت کے اچھوتے دلائل

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اور خاتم الانبیاء رسول ہونے کی یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ آپ کی زبان دُنیا کی زبانوں میں ایک وسیع ترین زبان اور دُنیا کی موجودہ ترقی یافتہ زبانوں کے بالمقابل بقول جرمن پروفیسر کریمکو "اس کی وسعت کی حد بندی فرشتوں کے سوا کوئی نہیں کرسکتا"۔ عرب جن کے اِرد گرد عبری۔ ایرانی، کلدانی، اور مصری متمدّن قومیں آباد تھیں۔ جو تاریخ عالم کے اِس مسلّمہ کی رو سے کہ "علم وعقل نہ صرف ایک قوم کو دُنیوی ترقی کے سامانوں میں مالا مال کر دیتا ہے بلکہ اس کی زبان کو بھی الفاظ کی دولت سے سرفراز کر دیتا ہے"۔ ان کی زبانیں عربی کی نسبت زیادہ وسیع ہونی چاہیئے تھیں۔ مگر عربی زبان کے متعلق یہ امر ایک عالم السنہ کو حیرت میں ڈالنے والا ہے کہ ان تمام متمدّن اقوام کی نسبت عربوں کی زبان نہایت وسیع زبان ہے۔ علاوہ ازیں اصولِ ارتقاء کی یہ اہم فرع کہ ہر چیز اپنے ماحول کے اثر کے ماتحت پیدا ہوتی ہے عربی زبان۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کے متعلق ٹوٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

عربی زبان کا اپنی ہمسایہ زبانوں کی نسبت وسعتِ الفاظ میں بے پایاں ہونا محمد رسول اللہ صلعم کا اُمّیوں کے مُلک میں اپنی کتاب و حکمت کے اعتبار تمام انبیاء پر فائق ہونا ایک ایسا معجزہ ہے جس کی تشریح ارتقاء کے اصولوں کے ماتحت محال ہے۔ کائنات کی ہر نوعِ مخلوق میں ارتقاء کا اصول کارفرما ہے مگر وہ امور جو عالم خلق سے نہیں بلکہ عالم اَمر کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں ان کو ارتقاء کی تخلیق اور نتیجہ نہیں بلکہ ارتقاء کے خالق اور علّت سمجھنا چاہیئے۔ وحی والہام اور نبوّت کبھی ماحول کے اثر کا نتیجہ نہیں ہوتے اور یہ خدا کی ہستی کی بہت بڑی دلیل ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۷ : ۵۴) وہ جہاں چاہتا ہے اصولِ ارتقاء کے ماتحت خلق کرتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اپنے اَمر سے اس اصول کو توڑ بھی دیتا ہے۔

عربی زبان میں رنگوں کے متعلق وسیع ذخیرۂ الفاظ

اس کے ثبوت کے لئے آپ عربی زبان ہی کو لے لیجئے۔ اس کی ہمسایہ زبانیں عبرانی۔ کلدانی۔ ایرانی اور مصری رنگوں کے متعلق گنگ ہیں عربوں نے اگر اپنی زبان کے سوا دوسری زبانوں کو عجمی (گنگ) زبانیں کہا تو یہ تعصّب کی وجہ سے نہ تھا بلکہ انسان کے نازک اظہارِ خیالات میں جب ان زبانوں کو قاصر پایا تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کی زبان کے بالمقابل یہ ساری زبانیں گنگ ہیں۔ ان قوموں کا تمدن قدیم اور نہایت شاندار سہی مگر یونانی فلاسفر ارسطو بھی اپنے کمالِ علم اور علمی زبان رکھنے کے باوجود تین رنگوں سے زیادہ نہ جانتا تھا۔ سر اسحاق نیوٹن نے سترھویں صدی میں بھی رنگوں کی تعداد صرف سات بتائی ہے مگر عربی زبان میں زمانۂ قدیم سے رنگوں کے متعلق ایک وسیع ذخیرۂ الفاظ موجود ہے زیر بحث آیت میں

اجمالی طور پر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے جُدَدٌ بِیْضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُھَا "سفید اور سرخ کے بے شمار جُدد ہیں پھر ان دونوں کے لاتعداد مختلف رنگ ہیں" نہایت سیاہ تاریک رات میں. جو ستاروں کی دھیمی سی روشنی ہے اس کی سفیدی سے لے کر ایک نہایت روشن دوپہر تک سفید کے بے شمار درجے ہیں. جو قدم قدم پر لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ سفید ہوتے جاتے ہیں مگر سفیدی صرف دوپہر پر ہی ختم نہیں ہوگئی۔ اس کے آگے پھر وہ تیز برقی شعاعیں ہیں. جو سیسہ کی موٹی تہ کے سوا ہر چیز سے گذر جاتی ہیں۔ سورج کی روشنی جو ہماری زمین تک پہنچتی ہے اس کا اصل رنگ کس قدر سفید ہوگا اس کا اندازہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اور یہ سب جُدَدٌ بِیْضٌ اور اس کے مختلف اَلْوَانُھا کے نیچے ہے۔ اوّل تو لفظ بِیْضٌ جمع کا صیغہ ہے یعنی سفید رنگ بے شمار درجات کے ہیں پھر مختلف اَلْوَانُھا میں ھَا کی ضمیر اس کی طرف پھیر کر بتایا کہ تمام رنگ اِسی کے ہیں یا اسی کے اندر جمع ہیں. جو حُمْرٌ یعنی مختلف سرخ رنگوں کے انتہائی رنگ پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد "غَرَابِیْبُ سُوْدٌ" نہایت سیاہ کا درجہ ہے جو درحقیقت رنگ نہیں بلکہ وہ رنگوں کے غَرَبیب غَروب غائب یا معدوم ہوجانے کا نام ہے۔ رنگوں کے متعلق موجودہ علمی تحقیقات کا خلاصہ صرف اسی قدر ہے گو اس کی تشریح اور تفسیر میں لاکھوں صفحات لکھے جاسکتے ہیں موجودہ علماءِ سائنس. جو اس امر کے قائل ہیں کہ رنگ بے شمار ہیں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ رنگوں کے علم کے بارہ میں اقوامِ عالم کی ترقی نہایت سُست رہی ہے وہ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ عربی زبان میں شروع سے سفید اور سرخ وغیرہ رنگوں کے بیسیوں درجوں کے الگ الگ نام موجود

ہیں۔اس زبان کا ایک اور اعجاز یہ ہے کہ انگریزی سنسکرت اور فارسی وغیرہ زبانوں کی طرح رنگوں کے نام اشیاء کے نام پر نہیں رکھے گئے۔جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قدیم زمانہ میں رنگ کی ہستی اشیاء سے الگ سمجھی جاتی تھی عربی زبان میں ان کے لئے الگ الگ مستقل نام ہیں مثلاً انگریزی میں (Orange) نارنگی کو کہتے ہیں مگر اس کے رنگ کو بھی (Orange) نارنجی نام دیا گیا ہے۔جو فی الحقیقت ایک پھل کا نام ہے نہ کہ رنگ کا۔اسی سلسلہ میں عربی زبان کا تیسرا اعجاز یہ ہے کہ انگریزی سنسکرت اور دنیا کی دوسری زبانوں میں رنگوں کی شوخی اور دھیمے پن کو نہایت ہلکا اور پھیکا وغیرہ اشارات سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر عربی زبان میں ہر درجہ کے لئے یہ اشاراتِ گنگ استعمال نہیں ہوتے بلکہ ہر درجہ کا ایک مستقل نام ہے۔اس امر کو آسانی سے سمجھنے کے لئے آپ۔یوں سمجھئے کہ شیرینی اور مٹھائی کے بے شمار درجے زبان پر محسوس ہو سکتے ہیں آپ پانی کے گلاس میں ایک رتی شکر سے شروع کر کے زیادہ سے زیادہ مقدار شکر حل کر کے چکھتے چلے جائیے۔ زبان الگ الگ مٹھاس کا اظہار کرتی چلی جائے گی مگر آپ نہایت خفیف میٹھا معمولی میٹھا اور نہایت شیریں کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں مگر کامل زبان ہر محسوس درجۂ شیرینی کا نام الگ الگ بتائے گی۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر لامحدود کو محدود درجوں میں ہی تقسیم کر کے سمجھ سکتے ہیں اس لئے وسیع زبان بھی زیادہ سے زیادہ محدود درجوں کے نام بتانے پر مجبور ہے۔عربی زبان کے اس اعجاز کو وضاحت سے ثابت کرنے کے لئے لغتِ عرب کی بہت زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے اس کی صرف دو تین مثالیں یہاں دی جا سکتی ہیں مثلاً عربی میں سفید رنگ کے درجے یوں

بیان کئے گئے ہیں۔ اَبْیَضُ ثم یَقِقٌ ثم لَھَقٌ ثم وَاضِحٌ ثم نَاصِعٌ ثم ھِجَانٌ وخَالِصٌ۔

یہ سات درجے سفید کے ہیں جو ظاہر اور معروف سفید رنگ سے شروع ہو کر انتہائی سفید رنگ ھجان یا خالص پر ختم ہوتے ہیں۔ سفید رنگ کے اِن درجات کے علاوہ مرد عورت۔ گھوڑا۔ اونٹ بیل۔ گائے۔ گدھا۔ بھیڑ۔ بکری۔ ہرن۔ کپڑا۔ چاندی۔ روئی۔ انگور۔ شہد وغیرہ کے جن کا رنگ سفید ہو الگ الگ اسماء موجود ہیں مثلاً سفید رنگ کے مرد کو اَزھر مگر عورت کو رُعبوبہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد انسان کے سفید فام کے لحاظ سے درجہ بدرجہ کئی نام ہیں عربی میں گلاب کے پھول کو وَرد کہتے ہیں مگر یہی پھول اگر سفید ہو تو اُسے اُردو کی طرح سفید گلاب نہیں کہیں گے بلکہ اس کا نام وَتیر ہے۔ سفید پہاڑ کو خوع مگر سفید پتھر کو یرمَع کہتے ہیں۔ اسی طرح معدنیات درختوں پھلوں جانوروں کا جو سفید رنگ کے ہوں الگ الگ اسماء موجود ہیں۔ ہر جانور کے ہر سفید عضو کے اعتبار سے جُدا جُدا نام ہیں اور اسی طرح باقی رنگوں کے۔ سُرخ رنگ کے اعتبار سے سُرخی کے بتفصیل درج ذیل ہیں:۔

اَحْمَرُ۔ اَشْقَر۔ اَقْشَر۔ اَشْکَل۔ شَرِق۔ مُدَمّیٰ۔ مدامۃٌ۔

جن کی تشریح نہایت وسیع ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دُنیا میں عرب ہی ایک قوم ہے جن کی زبان ہر لحاظ سے اپنے اندر اس قدر علمی وسعت رکھتی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالےٰ کے آخری کلام کے لئے یہی زبان موزوں ہو سکتی تھی اس کے بعد انشاء اللہ تعالےٰ ایک اور اعتبار سے رنگ کی اندھی آریہ اور عیسائی

اقوام کا ذکر کیا جائے گا۔

رنگ کی نابینائی روحانی اور ذہنی اعتبار سے

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ رنگوں کے متعلق علم کی ترقی اکثر اقوام عالم میں نہایت سست رہی ہے۔ یونان فلسفہ اور علم کا گہوارہ تھا۔ مگر ارسطو جیسا فلاسفر بھی تین رنگوں سے زیادہ کا علم نہ رکھتا تھا۔ چینیوں کو آرٹ اور رنگ میں کمال حاصل تھا۔ مگر رنگوں کے متعلق ان کا علم بھی ناقص تھا۔ ہندوؤں کے ویدوں میں سبز اور زرد نیلے سیاہ میں تمیز ندارد ہے۔ آسمان کا ذکر ویدوں کے صدہا منتروں میں موجود ہے مگر اس کا رنگ نیلا نہیں بتلایا گیا بلکہ نیلے رنگ کو بھی سیاہ سے الگ نہیں بتایا گیا آگ اور دھوئیں کی سیاہی کو نیلے رنگ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ ویدوں میں نیلے اور سیاہ رنگ میں تمیز نہیں کی گئی۔

ویدوں اور شاستروں میں متعدد رنگوں کا ذکر ہے مگر رنگوں کے متعلق ان کی گواہی ایک اور رنگ میں ظاہر ہے۔

آریوں میں رنگ کی نابینائی

یہ امر مسلم ہے کہ رنگوں کے اندھے دنیا میں صرف چند فی دس لاکھ ہیں مگر ذہنی اور دماغی اعتبار سے رنگ کے اندھوں کی تعداد بے شمار ہے۔ قریباً سارے کا سارا یورپ اور ہندو آریہ اس وقت بھی ذہنی طور پر رنگ کے اندھے (Mentally colour blind) ہیں۔ ان قوموں نے جسمانی اور مادی یا سفید اور سیاہ رنگ کو قوموں کی فضیلت ذات پات میں اونچ نیچ کا نشان سمجھ لیا ہے حالانکہ انسان کے ظاہری رنگ کو اس کے دھرماتما (دیندار) اور ادھرمی (بے دین) یعنی

شُودر اور نیچ ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ ویدوں کی زبان میں رنگ کو وَرن کہا جاتا ہے مگر وَرن جہاں رنگ کے معنی دیتا ہے وہاں ذات پات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ وَرن دَر حقیقت عربی لفظ لَون کا مَقلُوب ہے۔ سامی زبان کا "لام" آریین زبانوں میں اکثر اور بیشتر "را" سے تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور سنسکرت کے صدہا الفاظ عربی الفاظ کا مَقلُوب ہیں۔ ہندو قوم میں رنگ کی فضیلت اس قدر اہم ہے کہ اس کا کُل لٹریچر وید سے لے کر شاستروں تک اس سے بھرا پڑا ہے۔

آریوں میں رنگ کی عزت

مثال کے طور پر وَرن جا (ذات سے پیدا شدہ۔ ہمرنگ) (۲)
وَرن جیانس (ذات کے لحاظ سے اعلیٰ۔ خوش رنگ)۔
(۳) وَرن جیشیٹھ (ذات کا نہایت افضل خوب رُو)
(۴) وَرن توا (دوسری ذات کا۔ غیر رنگ کا)
(۵) وَرن دُوشک (ذات بگاڑنے والا)
(۶) وَرن دَیو (اپنی قوم کا خدا۔ برہمنی کا کا اگنی۔ کشتریوں کا اندر۔ ویشوں کا وشو دیو)
(۷) وَرن دَھرم (اپنی ذات کا پیشہ)
(۸) وَرن ناتھ (اپنی ذات کا خاص معبود)
(۹) وَرن سنکر (ذات کا دوغلا)
(۱۰) وَرن وَوستھا (ذات پات کی تقسیم)
(۱۱) سَاوَرن وِواہ (اپنی ذات میں یا جائز شادی)
(۱۲) وَرن سَمیوگ (اپنی ذات میں یا جائز شادی)

(۱۳) وَرن سنسرگ (غیر ذات میں یا ناجائز شادی)۔

اس قسم کی بیسیوں اصطلاحات ہیں جن میں رنگوں کی اہمیت بتائی گئی ہے۔

اسی طرح وید منتروں میں سفید رنگ کی فضیلت اور سیاہ رنگ کی تحقیر اور تذلیل کی گئی ہے۔ رگوید میں آریہ اور داس دونوں کا الگ الگ سفید اور سیاہ رنگ بیان کیا گیا ہے۔ رگوید منڈل ۲ سوکت ۲۰ منتر ۷ میں غیر آریوں کو "کرشن یونیہ" کالی ذات یا کالی شرمگاہ والے کہا گیا ہے اور اندر دیوتا سے واجب القتل بتایا گیا ہے۔ رگوید منڈل ۱ سوکت ۱۳۰ منتر ۸ میں "توچم کرشنام" میں ان کو کالی چمڑی والے کہا گیا ہے اور اسے کچل کر فنا کرنے کا حکم ہے۔

نروکت ۱۲ : ۱۳ تیستر برارنیک ۵ : ۸ : ۱۲ میں تاکید ہے کہ کالی لڑکی سے شادی نہ کرے کیونکہ وہ کالی قوم ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور سائنٹیفک انکشاف

انسان کے اعمال اور اخلاق کا تعلق اس کے جسمانی رنگ کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی روحانی اور آلہی صفات کے ساتھ ہے۔ ظاہری رنگ کے اندھے دنیا میں چند فی دس لاکھ ہیں مگر روحانی اور ذہنی اندھوں کی دنیا میں کثرت ہے قرآن مجید اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (۲۲ : ۴۶) "کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں" کہ یہ لوگ ظاہری سفید رنگ کو سیاہ رنگ سے افضل سمجھتے ہیں حالانکہ ہر چیز کا رنگ وہ نہیں جو نظر آتا ہے بلکہ یہ وہ

رنگ ہے۔ جو اس شئے نے قبول نہیں کیا اور واپس لوٹا دیا ہے۔ گلاب کا پھول بے شک سُرخ نظر آتا ہے مگر خالص سبز روشنی میں وہ ہرگز سُرخ نظر نہیں آئے گا اور نہ تاریکی میں اس کا رنگ سُرخ نظر آسکتا ہے۔ گلاب کا سفید پھول اپنی اندرونی کیمیاوی ترکیب کی وجہ سے روشنی کی سفید لہروں کو منعکس کر دیتا ہے مگر سُرخ پھول سُرخی کے سوا اور سب رنگ کی شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے مگر سرخی کو منعکس کر دیتا ہے۔ ہر شئے روشنی میں سے بعض رنگوں کو قبول کر لیتی ہے اور بعض کو واپس لوٹا دیتی ہے جو ہماری آنکھوں سے ٹکراتا اور رنگ کا احساس پیدا کرتا ہے۔ جو شئے سفید نظر آتی ہے وہ بہت کم روشنی کی لہروں کو جذب کرتی ہے مگر جو چیز روشنی کی تمام لہروں کو جذب کر لیتی ہے اور کسی کو واپس نہیں لوٹاتی وہ ہمیں سیاہ نظر آتی ہے "وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ" رنگوں کے متعلق یہ ایک دھوکا ہے۔ جو انسان کے دل اور دماغ کو لگا ہوا ہے آنکھ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ جس طرح رنگوں کے اس ظاہری دھوکا میں دُنیا مبتلا ہے اسی طرح روحانی اور اخلاقی طور پر بھی یہ قومیں رنگ کی اندھی ہیں۔

محمد رسول اللہ صلعم اور قرآن مجید کا احسان عظیم

انسان کی قیمت اور فضیلت کا

کوئی تعلق انسان کے ظاہری رنگ کے ساتھ نہیں بلکہ اس کی قیمت اور فضیلت اس کے روحانی اور الٰہی رنگ یا صفات کے ساتھ ہے۔

قرآن مجید کا دُنیا پر کس قدر احسان ہے کہ اس نے آیت میں رنگوں کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہی فرمایا وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ یعنی "لوگوں اور جانداروں اور

چار پایوں میں اسی طرح ان کے رنگ مختلف ہیں۔" سفید رنگ کی فضیلت کا دعویٰ کرنے والو کیا گدھے۔ بیل اور پتھر تک سفید اور سُرخ نہیں ہوتے۔ کیا گوری قوموں کے اندر بعینہٖ بے وقوف۔ کم عقل اور ذلیل چلن کے لوگ نہیں ہوتے۔ اگر گدھا بھی سفید ہو کر گدھا ہی رہتا ہے تو ایک انسان بھی گورا ہو کر گدھا ہو سکتا ہے گورے اور کالے میں تمیز کرنا اور کالی قوموں کے حقوق پر ڈاکہ مارنا یہ ایک اور نابینائی رنگ کی بیماری ہے۔ اسی مماثلت کی بنا پر دجّال کو کانا کہا گیا ہے۔ بلحاظ Scientific انکشافات اور دُنیوی علوم ان کی نگاہ نہایت روشن ہے مگر روحانی اور اخلاقی اعتبار سے یہ قومیں نابینا رنگ ہیں۔ گذشتہ جنگ کے دوران ہٹلر اور جرمن قوم کے خلاف یہ پروپگنڈا نہایت شدّت کے ساتھ کیا گیا کہ ان کو کالے لوگوں کے ساتھ نفرت ہے اور نازیوں (Nazi) کو اپنے آرین خون اور رنگ پر ناز ہے۔ مگر یہ بیماری نہ صرف جرمن قوم میں تھی بلکہ دیگر یورپین قوموں میں بھی یہ متعدّی مرض موجود ہے۔

لہ دَجّال کا لفظ دَجَلَ سے ہے یعنی ڈھانک دینا، لسانُ العرب میں اس نام کے دیئے جانے کی متعدّد وجوہات بتائی گئی ہیں۔ (۱) دَجّال کو دَجّال اس لئے کہا گیا کہ وہ جھوٹا ہے اور حق کو باطل سے ڈھانک دے گا۔ (۲) وہ اپنی جماعتوں کی کثرت سے زمین کو ڈھانک لے گا (۳) وہ لوگوں پر اپنے کفر کا پردہ ڈالے گا۔ (۴) وہ اپنی کثرت تعداد کے باعث ساری دنیا پر پھیل جائے گا۔ (۵) وہ اپنا سامان تجارت اٹھائے پھرے گا۔ (۶) دَجّال کو دَجّال اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ جو کچھ دِل میں رکھتا ہے اس کے خلاف ظاہر کرے گا۔ قرآن پاک کی سورہ کہف میں (جس کی پہلی دس اور آخری دس آیتیں دجّال سے متعلق ہیں) واضح طور پر یورپ کی موجودہ مادہ پرست

عیسائی اقوام کو دجّال قرار دیا گیا ہے۔ دجّال سے متعلق جس قدر نشانات احادیث میں مذکور ہیں وہ سب یورپین اقوام پر چسپاں ہوتے ہیں۔ مثلاً دجّال کا گرجا سے نکلنا، نیلی آنکھوں والا ہونا، زمین و آسمان کے درمیان اچھلتے پھرنا، زمین کے خزانے باہر نکالنا، نہایت تیز رفتاری سے سفر کرنا، مختلف ممالک کو آپس میں لڑوانا اور پھر خود ہی امن کی بحالی کا ڈھونگ رچانا، علم طب و جراحی میں ید طولیٰ حاصل کرنا وغیرہ وغیرہ (تفصیل کے لئے حضرت مولینا محمد علی لاہوری رحؒ کی شاہکار تالیف "مسیح الدّجال" ملاحظہ فرمائیں)۔ مرتب۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی

فاضل ہندی، سنسکرت و عبرانی۔

پیدائش بمقام ضلع ہوشیار پور (ہندوستان) یکم مئی ۱۸۸۸ء میٹرک اور ٹیکنیکل ڈپلوما کرنے کے بعد پی ڈبلیو ڈی امرتسر اور پھر ریلوے لوکو شاپ، لاہور میں ملازمت کی۔ ۱۹۰۷ء میں بانی تحریک احمدیت حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعت سے پہلے دعا کی تو خواب دیکھا کہ آسمان پر ستاروں کا ایک جھرمٹ ہے۔ جھرمٹ کے اس طرف ایک راستہ ہے جس پر وہ چل رہے ہیں لیکن یہ راستہ بڑا ٹیڑھا اور دشوار گذار ہے۔ لیکن وہ راستہ جو ستاروں کی دوسری طرف ہے بڑا سیدھا اور کشادہ ہے۔ اس خواب کی بنا پر حضرت مولانا نے اپنی زندگی کی راہ گذر بدل لی اور اپنی تمام تر توجہ علمی اور دینی مشاغل کیلئے وقف کردی ملازمت چھوڑ کر کچھ عرصہ تک اخبار "زمیندار" اور "وطن" سے منسلک رہے۔ ۱۹۱۳ء میں ہفت روزہ "پیغام صلح" سے منسلک ہوگئے۔ ایک مناظرہ کے سلسلہ میں اکبر شاہ نجیب آبادی کے ہمراہ ان کے آبائی وطن نجیب آباد گئے۔ اس دوران حضرت مولانا کو یہ احساس ہوا کہ آریوں اور ہندوؤں کے ساتھ کامیاب مناظرہ کرنے کیلئے سنسکرت زباں کا جاننا ضروری ہے۔ چنانچہ مرکزی انجمن، لاہور کی طرف سے آپ کو نومبر ۱۹۱۵ء میں اس کام پر مامور کیا گیا۔ ابتدائی چھ ماہ تک آپ نے سنسکرت آریہ سماجی پنڈت راج نرائن سے سیکھی اور پھر مختلف استادوں سے تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصہ میں اس زبان سے پوری طرح واقفیت حاصل کرلی۔ حضرت مولانا نے دن رات کی محنت شاقہ سے سنسکرت پر اتنا عبور حاصل کرلیا کہ ہندوپاک کے پنڈت اور سنسکرت زبان کے عالم ان سے بحث مباحثہ کرنے سے نہ صرف کتراتے بلکہ ان کی علمیت کا برملا اعتراف کرتے تھے۔ چنانچہ لاہور کے آریہ سماج کے صدر دیوی دتہ صاحب جب کبھی کسی تقریب میں حضرت مولانا کا تعارف کرواتے تو مولانا عبدالحق ودیارتھی ایم اے کہہ کر کرواتے۔ حالانکہ مولانا تو محض میٹرک تھے یہ دوسرے لفظوں میں ان کی علمیت کا اعتراف تھا۔

حضرت مولانا نے بیشمار مناظروں میں شرکت کی اور پنڈتوں کو ٹھوس دلائل اور خ ان کے ویدوں اور پرانوں سے اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور فوقیت کو نہایت کامیابی سے نہ صرف ثابت کیا بلکہ رسول اکرم صلعم کی آمد کی پیشگوئیوں کی بھی نشاندہی کی۔ مناظروں کے اس خالصتاً علمی طرز نے آریہ سماجی اور ہندو حلقوں میں تہلکہ مچادیا۔ چنانچہ حضرت مولانا کے کامیاب مناظروں سے متاثر ہو کر جمعیت العلماء دہلی نے احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور سے درخواست کی کہ وہ حضرت مولانا کی خدمات دو سال کیلئے جمعیت کے سپرد کردیں تاکہ مولانا ان کے طلباء کو سنسکرت اور مذاہب عالم کے تقابلی مطالعہ میں ان کی رہنمائی کر سکیں۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب مترجم قرآن مجید انگریزی و صدر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے جواب میں لکھا کہ افسوس ہے کہ ہمارے پاس بھی ایک ہی عبدالحق ہے۔ اسلئے ہم انہیں آپ کے سپرد کرنے سے قاصر ہیں۔

۱۹۲۰ء میں آپ کچھ عرصہ کیلئے ہفت روزہ " پیغام صلح " کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ جنوری ۱۹۲۵ء میں حضرت مولانا نے ویدوں کے ترجمے کا کام شروع کیا۔ ۴ مئی ۱۹۲۸ء میں آپ کو اشاعت اسلام کالج، لاہور میں پروفیسر مقرر کیا گیا۔

حضرت مولانا نے ہندوپاک کے طول و عرض میں بہت سے مناظرے لڑے جنکی وجہ سے آریہ سماج کا اسلام اور بانی اسلام کے خلاف طوفان رک گیا۔ ان میں سے ایک مناظرہ جس کا شہرہ ہندوستان بھر میں ہوا سکندر آباد، ضلع بلند شہر کے مقام پر منعقد ہوا۔ یہ اس قابل ہے کہ اسکا مختصر تذکرہ کیا جائے۔ ہندوؤں کی طرس سے رام چندر دہلوی اور مراری لال شرما نے شرکت کی۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت مولانا عبدالحق ودیارتھی صاحب، حضرت مولانا عصمت اللہ صاحب اور غازی محمود دھرم پال نے کی۔ یہ مناظرہ چاردن تک جاری رہا۔ حضرت مولانا کے ٹھوس دلائل اور ویدوں کے اصل حوالوں نے پنڈتوں کو عاجز کر دیا۔ اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایسے کامیاب مناظروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی ہندو پنڈت یا عالم کسی ایسے مناظرہ میں شرکت نہ کرتا جہاں اس کو معلوم ہوجائے کہ مسلمانوں کی نمائندگی حضرت مولانا عبدالحق صاحب کر رہے ہیں۔

کئی ایک مناظروں میں حضرت مولانا کے ساتھ مجلس احرار کے امیر شریعت اور تحریک احمدیت کے شدید ترین مخالف مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جموں میں

اسی قسم کے ایک مناظرہ میں شرکت کے بعد واپس آتے ہوئے مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے حضرت مولانا کو کہا " آپ ایک بات کو جس انداز سے بیان کر جاتے ہیں اگر وہی بات میں بیان کروں تو ہاتھوں کو ہتھکڑی لگ جائے ۔۔۔ میں آپ کی عزت اپنے باپ سے بھی بڑھ کر کرتا ہوں "۔

آریہ سماجیوں کی اسلام دشمنی کے ہتھکنڈوں کا حضرت مولانا نہایت دندان شکن جواب دیتے رہے ۔ چنانچہ آریہ سماجیوں نے مولانا کی ایک کتاب " ویدوں کی سرگزشت " کے سلسلہ میں انہیں ایک مقدمہ میں ملوث کر دیا ۔ اور انہیں ایک دن حوالات میں رہنا پڑا ۔ یہ مقدمہ ہندوپاک شہرت کا حامل ہوا اسلئے مختصراً اسکی تفصیل دی جاتی ہے ۔

حضرت مولانا نے ایک کتاب "ویدوں کی سرگزشت " کے نام سے لکھی جو پہلے بالاقساط " پیغام صلح " میں شائع ہوتی رہی ۔ ہندوؤں نے اس کتاب کی اشاعت پر بڑا واویلا کیا ۔ انگریز حکومت نے اس کو مذہبی منافرت کا باعث ٹھہراتے ہوئے حضرت مولانا کے خلاف اس کتاب کی ضبطی کا مقدمہ کھڑا کر دیا اور مولانا کو حوالات میں ڈال دیا گیا ۔ حضرت مولانا کی گرفتاری عین ہفتہ کے دن عمل میں لائی گئی تاکہ اگلے دن اتوار کی وجہ سے ضمانت نہ ہو سکے اور اسطرح حضرت مولانا صرف ایک دن حوالات میں رہے ۔ آخر سوموار کو پنجاب اسمبلی کے مشہور سپیکر سر چودھری شہاب الدین نے حضرت مولانا کی ضمانت دی ۔ سر شادی لال اسوقت پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے ان کی ایما پر متعلقہ جج نے مقدمہ کو لٹکانہ شروع کیا ۔ جب انتقال مقدمہ کی کوشش کی گئی تو کامیابی نہ ہوئی ۔ حکومت کی طرف سے یہ موقف لیا گیا کہ ویدوں میں سے جو باتیں بیان کی گئی ہیں ۔ ان میں مفہوم کا تصرف کیا گیا ہے ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سنسکرت کے ایک جید عالم کو بلایا گیا جسے حضرت مولانا نے چیلنج کیا کہ جو مفہوم انہوں نے ویدوں سے لیا ہے اس کو غلط ثابت کرے ۔ لیکن جید عالم اپنے تمام تر علم اور تعصب کے باوجود مولانا کے چیلنج کو قبول نہ کر سکا ۔ آخر کار علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ، چودھری ظفر اللہ خاں اور سر چودھری شہاب الدین پر مشتمل ایک وفد گورنر سے ملا ۔ اور اسطرح یہ مقدمہ ختم ہوا ۔

حضرت مولانا کی زندگی کا دوسرا اہم واقعہ ایک مسلمان لڑکی اصغری بیگم کا آریہ سماجی مذہب اختیار کر کے شانتی دیوی بن جانا تھا ۔ اور پھر حضرت مولانا کی کوششوں سے اسکا دوبارہ حلقہ بگوش اسلام ہونا ہے ۔ اس تمام واقعہ کی تفصیلات ہندوستان بھر کے اخبارات میں شائع ہوتی

رہیں مختصراً واقعات یہ ہیں۔ اصغری بیگم کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوئی جو اسکو دن رات زدو کوب کرتا تھا۔ اصغری بیگم نے تنگ آکر کئی ایک علماء سے طلاق لینے کے متعلق استفسار کیا۔ لیکن سب نے یہی کہا کہ جب تک خاوند طلاق نہ دے طلاق نہیں ہو سکتی۔ تنگ آکر اصغری بیگم ایک آریہ سماجی کے ذریعے گھر سے فرار ہو گئی اور پنڈت شردھانند کے ہاتھ پر آریہ سماجی بن گئی۔ اسکی شادی لاہور کے ایک آریہ سماجی لڑکے سے کردی گئی۔ اصغری بیگم جو اب شانتی دیوی بن چکی تھی اس نے اسلام کے خلاف لیکچر دینے شروع کردئے۔ اسی شانتی دیوی یعنی (اصغری بیگم) کے ایک رشتہ دار عبدالرشید نے اشتعال میں آکر شردھانند کو قتل کر دیا۔ چنانچہ ہندوؤں کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں شانتی دیوی کو بھی اسطرح ہلاک نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ حفاظت کے پیش نظر دونوں میاں بیوی کو ہر دوار بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد گوالیار کے سیٹھ برلا نے ۔/ ۶۰۰۰ روپے کا نذرانہ پیش کیا اور میاں کو ۔/ ۳۰۰ روپے ماہوار کی نوکری دیدی۔ آریہ سماج نے دعہ کیا کہ اگر مسلمانوں کی ایسی عورتیں شدھی کی جائیں اور آریہ دھرم اختیار کریں۔ ہر ایک خاتون کو دیگر سہولتوں کے علاوہ ۔/ ۶۰۰۰ روپے کا نقد عطیہ بھی دیا جائے گا۔

اصغری بیگم کا شانتی دیوی ہونا مسلمانان ہند کیلئے ایک بڑا چیلنج تھا چنانچہ حضرت مولانا نے "ویدک دھرم اور اسلام میں عورت کی حیثیت" کے موضوع پر "پیغام صلح" میں چھ اقساط لکھیں۔ شیخ عبدالحق صاحب مناظر اسلام یہ اقساط شانتی دیوی کو بھجواتے رہے۔ چھ اقساط پڑھنے کے بعد شانتی دیوی نے شیخ عبدالحق صاحب کو دہلی میں لکھا کہ وہ تین سال بعد اس موضوع پر آپ سے گفتگو کرنے دہلی آئینگی۔ حضرت مولانا اور دیگر احباب نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ معاملہ کو ٹال رہی ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ تین سال بعد شانتی دیوی اپنے خاوند کے ہمراہ دہلی آئیں اور گفتگو کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ شیخ عبدالواحد صاحب نے جو چاندنی چوک کے تھانہ کے انچارج تھے گفتگو کی جگہ پولیس سٹیشن کو ہی رکھا۔ چنانچہ کئی گھنٹوں تک شانتی دیوی کی شیخ عبدالحق اور شیخ عبدالواحد صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔ شانتی دیوی نے اسلام اور بانی اسلام کے متعلق تقریباً ۴۰ اعتراضات کئے۔ دونوں حضرات کے جوابات سے شانتی دیوی مطمئن نہ ہوئی۔ حضرت مولانا عبدالحق صاحب ودیارتھی اس گفتگو میں ایک سامع کی حیثیت سے شامل رہے۔ دوسرے روز حضرت مولانا شانتی دیوی کے گھر پر گئے اور انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے تمام

سوالات کے تسلی بخش جواب دے سکیں گے ۔ چنانچہ حضرت مولانا ہر روز شانتی دیوی کے گھر جاتے اور ان کے اعتراضات کے معقول علمی اور مدلل جواب دیتے رہے ۔ ان جوابات سے شانتی دیوی کے شکوک رفع ہوتے گئے بالآخر کئی روز کی گفتگو کے بعد نہ صرف شانتی دیوی دوبارہ مشرف بہ اسلام ہوئیں بلکہ ان کے خاوند نے بھی اسلام قبول کرلیا اور سلیم کا نام اختیار کیا۔

دسمبر ۱۹۳۶ء میں حضرت مولانا کی یکتا اور منفرد کتاب " میثاق النبین " منصۂ شہود پر آئی جس نے تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ قرآن کریم کے اس دعویٰ کا کہ ہر نبی نے رسول اکرم صلعم کی آمد کی پیشگوئی کی کا منقولی اور تحقیقی ثبوت مہیا کیا ۔ کتاب کی جلد اول جو پونے تین صد صفحات پر مشتمل تھی اس میں زرتشتی ، پارسی ، ہندومت ، بدھ مت ، عہد نامہ قدیم اور عہدنامہ جدید کی کتب مقدسہ میں سے نبی موعود صلعم کی آمد کی پیشگوئیوں کے متعلق اصل عبارتیں نقل کیں ۔ اور جدید علمی تحقیقات کی روشنی میں عقلی اور نقلی دلائل سے ان تمام نشانیوں کو رسول اکرم صلعم کی ذات میں پورا ہونا ثابت کیا جنکا ذکر قدیم نوشتوں میں درج تھا ۔ اسی کتاب کا انگریزی ترجمہ " محمدؐ ان ورلڈ سکرپچرز " کے نام سے اکتوبر ۴۰ء میں شائع ہوا ۔ جس نے دنیا کے مسلم اور غیر مسلم علمی حلقوں سے داد تحسین وصول کی ۔ ہندوپاک کے چوٹی کے مصنفین ، جج صاحبان اور اخبارات نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے زمانۂ حال کا " حیرت انگیز انکشاف " قرار دیا ۔ اسکا فارسی ترجمہ ایران کے مشہور رسالہ "دین و دانش" میں شائع ہوا ۔ اور بغداد کے مشہور عربی اخبار الہلال میں اسپر تفصیلی تبصرہ شائع ہوا۔

۱۹۵۰ء میں " میثاق النبین " کا دوسرا حصہ شائع ہوا یہ حصہ تین صد بارہ صفحات پر مشتمل تھا ۔ اس میں بدھ مذہب کی کتب مقدسہ سے نوید آنحضرت صلعم کے متعلق اصل حوالاجات اور بلند پایہ علمی تحقیقات درج کی گئی ۔

۱۹۵۳ء میں حضرت مولانا احمدیہ انجمن اشاعت اسلام ، سرینام کی خاص دعوت پر سرینام (جنوبی امریکہ) تشریف لے گئے اور وہاں چھ ماہ قیام کیااور دوسو سے زائد لیکچر دیئے ۔ ان لیکچروں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے ان کے لیکچروں کو ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لیا اور اب تک ان سے استفادہ کیا جاتا ہے ۔ آپ تھوڑے عرصہ کیلئے گیانا اور ٹرینڈاڈ بھی تشریف لے گئے تھے ۔

ٹرینیڈاڈ میں صرف پندرہ روز کے قیام کے دوران آپ نے سترہ لیکچر دیئے۔ اس سفر کے دوران اپ نے میثاق النبین حصہ دوئم جس میں بدھ مت کی کتب مقدسہ سے آمد رسول اکرم صلعم کی پیشگوئیاں درج تھی ان کا کافی اختصار سے انگریزی میں ترجمے کے کام کو مکمل کیا حضرت مولانا ابھی سرینام میں ہی تھے کہ یہ کتاب "محمد ان ورلڈ سکرپچرز" حصہ دوئم کے نام سے دسمبر ۵۵ء میں پاکستان سے شائع ہوئی۔

اس عرصہ میں حضرت مولانا کا دیگر کتب مقدسہ کا مطالعہ اور معلومات پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہوچکی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے "محمد ان ورلڈ سکرپچرز" کو نظر ثانی کی اور اس میں نئی تحقیقات کی روشنی میں کئی ایک نئے موضوعات کا اضافہ کیا۔ مثلاً خدا کے نام اللہ کا اسلام اور تمام ادیان عالم میں منفرد اور یکتا حیثیت کا حامل ہونا، بابلیوں کی کتب مقدسہ جو بابلی تہذیب کی بربادی کے کئی ہزار سال بعد (The Book of Dead) کے نام سے مرتب ہوکر شائع ہوئی اسمیں آمد رسول اکرم صلعم کے متعلق ساٹھ (۶۰) نشانیاں وغیرہ کو شامل کیا۔ نیا توسیع شدہ ایڈیشن اول ایڈیشن کے تین سو صفحات کے مقابل میں پندرہ سو صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی جو ۴۴۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ دوسری جلد ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی جس نے صفحات کی تعداد کو تقریباً ایک ہزار تک پہنچا دیا۔

تحقیقات کے اس نئے سلسلہ کو مکمل کرنے کی غرض سے حضرت مولانا نے ۵۶ء اور ۶۰ء میں دو لمبے سفر کئے۔ ۵۶ء میں تھوڑے عرصہ کیلئے ٹرینیڈاڈ، سرینام اور گیانا میں قیام کیا پھر آپ نے چار سال تک سان فرانسسکو میں قیام کیا جہاں آپ نے تمام بڑی بڑی لائبریریوں کو چھان مارا۔ "محمد ان ورلڈ سکرپچرز" کے موجودہ تین حصوں کا کافی سے زیادہ حصہ وہیں مکمل کیا۔ ۶۰ء میں دوبارہ چند حوالاجات تلاش کرنے کی غرض سے حضرت مولانا کو ایک لمبا سفر اختیار کرنا پڑا۔ اس دفعہ آپ نے جزائر فجی، سان فرانسسکو فلاڈلفیا، برما، سیلون اور مدراس کی لائبریریوں سے حوالاجات اکٹھے کئے۔

اس ضخیم کتاب کے علاوہ حضرت مولانا کی چند اور چھوٹی کتب کا ذکر کرنا ناگزیر ہے جو اپنے مضامین کے اعتبار سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش کے نام سے مذاہب عالم پر ایک نہایت ہی ناپاک کتاب شائع کی جس میں تمام مذاہب کے انبیاء اور بزرگوں کی تذلیل کی گئی۔

ڈیھاں تک کے خدا پر بھی ٹھٹھہ کیا گیا۔ اس کتاب کے چودھویں باب میں قرآن مجید، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی ازواج مطہرات اور دیگر انبیاء علیہم السلام پر گندے اعتراضات کئے گئے۔ چنانچہ حضرت مولانا نے اس چودھویں باب کے ایک سو انسٹھ (۱۵۹) اعتراضات کے مدلل اور مسکت جواب بمعہ اصل حوالہ جات دئے جو "آئینہ حق نما" حصہ اول کے نام سے اگست ۴۵ء میں شائع ہوئے۔ یہ کتاب چار سو چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ "آئینہ حق نما" حصہ دوئم (مطالعہ ویدک دھرم) ویدوں کا بہشت (آریہ سماج کے اعتراضات کا جواب)، مسئلہ بہشت طبع شدہ ۱۹۲۶ء (فیصلہ کن مناظرہ مابین مولانا عبدالحق ودیارتھی اور پنڈت رام چندر صاحب دہلوی)، اردو ترجمہ یجروید (آریہ سماج کے نزدیک یہ تمام ویدوں میں سب سے مستند ہے)، سام وید کا اردو ترجمہ بھی حضرت مولانا عبداللہ صاحب کے رسالہ "بصیرت" میں قسط وار شائع ہوتا رہا لیکن ترجمہ کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکا۔

"ارتقائے نسل انسانی" پادری سلطان محمد صاحب کی کتاب "ہبوط نسل انسانی" کے جواب میں لکھی گئی اور چیلنج کیا گیا کہ پادری صاحب اسکا جواب دیں۔ لیکن پادری صاحب نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ "اس کتاب کے مخاطب خواجہ کمال الدین صاحب تھے عبدالحق صاحب کو جواب نہ دیا جائے گا"۔

حضرت مولانا چوتھی بار پھر ۹ مئی ۷۰ء کو انگلستان عازم سفر ہوئے اس سفر کا مقصد "محمد ان ورلڈ سکرپچرز" کی تیسری جلد کیلئے مواد اکٹھا کرنا تھا اس جلد میں حضرت مولانا کا ارادہ تھا کہ حضرت رسول اکرم صلعم کی آمد کے متعلق پیشگوئیوں کو اس لحاظ سے ترتیب دیا جائے کہ سب سے پہلے اس پیشگوئی کو درج کیا جائے جو آمد کے متعلق ابتدائی نشانیوں کی نشاندہی کرتی ہو اور پھر ترتیب وار ان پیشگوئیوں کو لایا جائے جن میں ان ابتدائی نشانیوں کے علاوہ مزید نشانیوں کا ذکر ہو۔ یہ جلد ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی جو ۵۰۰ صفحات پر مشتمل تھی۔ اس قدر مطالعہ، تصنیف و تالیف کے کام اور بیرونی ممالک کے سفروں نے بالآخر حضرت مولانا کے صحت کو کمزور کر ڈالا اور آپ بیمار رہنے لگے۔ اس دوران میں بھی گاہے بہ گاہے آپ "پیغام صلح" میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے رہے لیکن بیماری بڑھتی گئی اور آخر کار یہ عالم بے بدل ۱۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ انکی یاد میں "پیغام صلح" کا خاص نمبر ۲۲ فروری یکم مارچ ۱۹۷۸ کو شائع ہوا۔ (ن۔ا)